فروری و مئی ۱۹۵۸ء

خاص نمبر

اورینٹل کالج

میگزین

فروری و مئی ۱۹۵۸ء

خاص نمبر

جلد ۳۴ عدد ۲ و ۳ عدد مسلسل ۱۳۲ و ۱۳۳

ایڈیٹر :—

ڈاکٹر سید عبداللہ

باہتمام مسٹر احسان الحق ہیڈ کلرک یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور، پرنٹر و پبلشر اورینٹل کالج میگزین، پنجاب یونیورسٹی پریس لاہور میں طبع ہو کر اورینٹل کالج لاہور سے شائع ہوا۔

سالانہ چندہ : چار روپے

خاص نمبر کی قیمت بے قاعدہ خریداروں کے لئے : ۵ روپے

ترتیب

اے - ۳۲۴ پنجاب یونیورسٹی پریس — ۳۰۰ — ۹ - ۵ - ۵۸ء

خطبۂ استقبال

جو

یونیورسٹی اورینٹل کالج
لاہور

کے

۸۸ ویں یوم تأسیس (منعقدہ ۲۳ نومبر ۵۷ء)

پر

ڈاکٹر سیّد عبداللہ پرنسپل

نے

پڑھا

باسمہ تعالیٰ

عالی جناب وزیر اعلیٰ مغربی پاکستان، محترمہ صدر صاحبہ و حاضرین باتمکین! میں آپ سب صاحبوں کو صدق دل سے خوش آمدید کہتا ہوں اور آپ کا شکر گزار ہوں۔ خصوصاً عزت مآب وزیر اعلیٰ کا کہ وہ اپنی بے شمار مصروفیات کے باوجود اس جلسے کے لئے وقت نکال سکے اور ہمیں اپنے گراں قدر ارشادات سے مستفید فرمایا میں اور میرے رفقا ان کی اس کرم فرمائی کے لئے بے حد مشکور ہیں۔ میں محترمہ صدر صاحبہ کا بھی مشکور ہوں کہ انہوں نے علوم مشرقی سے اپنی گہری محبت کا ایک بار پھر ثبوت بہم پہنچایا اور کالج کی دعوت پر، باوجود علالت طبع، لبیک کہہ کر اپنے خلوص کو عملی جامہ پہنایا۔ ؎

رَهَنْتُ یَدِی بِالْعَجْزِ عَنْ شُكْرِ بِرِّكُمْ
وَمَا فَوْقَ شُكْرِی لِلشَّكُورِ مَزِیْدُ

وَلَوْ اَنَّ شَیْأً یُسْتَطَاعُ اسْتَطَعْتُهُ
وَلٰكِنَّ مَا لَا یُسْتَطَاعُ شَدِیْدُ

حضرات! اورینٹل کالج کی تأسیس کے اس یادگاری موقعہ پر ظاہراً مجھے اس کالج اور اس سے متعلقہ علوم مشرقی کے متعلق ہی کچھ اظہار خیال کرنا چاہیے مگر میں آج اس توقع کے خلاف، تعلیم کے عام مسئلے کو اپنا موضوع بناؤں گا۔ یہ اس وجہ سے کہ علوم مشرقی کی ترقی اور اورینٹل کالج کی توسیع کا موضوع بار بار کی

تکرار کے باعث اتنا پریشان کن سا ہوگیا ہے کہ میں خود بھی اب اس سے
اکتا گیا ہوں ۔ ایک سبب یہ بھی ہے کہ علوم مشرقی کے متعلق
اب حکام نے بھی سوچنا شروع کر دیا ہے اور اگرچہ اورینٹل کالج
کی حالت بدستور وہی ہے جو پہلے تھی مگر مشرقی زبانوں کے امتحانوں
کے سلسلے میں صوبے کی وزارت کا رویہ ہمدردانہ ہو رہا ہے جس کے لئے
ہم عالی جناب وزیر اعلی وزیر معارف سردار عبدالحمید دستی اور جناب
ایس ایم شریف صاحب کے شکر گزار ہیں ۔ ہمیں کامل امید ہے
کہ صوبے کی حکومت بشمول وزارت علوم مشرقی اور اورینٹل کالج کے
مسائل کے بارے میں اب مسلسل دلچسپی کا اظہار کریگی ۔ اب میں
اصل موضوع پر آتا ہوں ۔

میرا عقیدہ یہ ہے کہ مشرقی علوم کے سوال کو عام تعلیم کے مسائل سے
الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا ۔ کیونکہ بالآخر مشرقی علوم کی ساری بحث
بھی انہی اصولوں تک جا پہنچتی ہے جن کا تعلق تعلیم کے عام مقاصد و حکمت
سے ہے ۔ اور پھر اس لئے بھی کہ مشرقی علوم کے سوال کو عام تعلیم
سے الگ رکھ کر سوچنے کی ناسمجھی ہی در اصل اس بات کی ذمہ دار
ہے کہ اس وقت ہماری تعلیم (مشرقی اور مغربی) دو الگ الگ خانوں اور
طبقوں میں تقسیم ہو گئی ہے ۔ جن میں سے عملاً ایک کو اعلی
اور دوسری کو ادنی یا ایک کو مفید اور دوسری کو غیر مفید یا
بے ضرورت خیال کیا جاتا ہے ۔ میرے نزدیک یہ تقسیم ایک غیر
ملکی حکومت کی غرض مندانہ حکمت عملی کا نتیجہ تھی ۔ اور اب اس
تقسیم کو جاری رکھنے کا مطلب ما سوا اس کے کچھ نہیں کہ ہم ایک غلط
رسم کو ہمیشہ کے لئے برقرار رکھنے پر تلے ہوئے ہیں ۔

ان وجوہ سے میں آج پاکستان کی عام تعلیم کے بارے میں اپنے
خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں ۔ شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ مرکزی

حکومت پاکستان کے عالی مقام وزیر تعلیم نے حال ہی میں ایک وسیع تعلیمی کمیشن کے قیام کا اعلان کیا ہے ۔ جس میں انہوں نے امور قابل بحث کا تو کوئی تذکرہ نہیں کیا ، مگر اتنی وضاحت کی ہے کہ مجوزہ کمیشن کا دائرہ بحث بہت وسیع ہوگا اور اس کو اختیار ہوگا کہ وہ پاکستان میں تعلیم کی بنیادی حکمت عملی پر بھی غور کرے اور ایسی تجاویز پیش کرے جن سے پاکستان کی تعلیم پاکستان کے مخصوص عقائد کے عین مطابق ہو جائے ـــ!

میرے خیال میں وزیر تعلیم صاحب کا یہ اقدام نہایت مبارک اور قابل قدر ہے، اگر اس کمیشن کا تقرر ہو گیا اور اس نے صحیح سپرٹ میں کام کیا تو اس سے بڑے دور رس نتائج نکلنے کی توقع ہے ۔، میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کام کے لئے حکومت کے سامنے نصب العین کیا ہے اور کون کون سے اہل الرائے اور اہل فکر حضرات اس نئی حکمت عملی کی تشکیل میں حصہ لیں گے ۔ مگر یہ تو واضح ہے کہ اصولی طور پر اس کمیشن کا اہم ترین مقصد پاکستان کے لئے ایک مخصوص تعلیمی منصوبے کی تشکیل ہوگا ۔ باقی مسائل جو بھی زیر بحث آئیں گے، وہ اسی بڑے مقصد کے تابع ہوں گے ـــ!

یہ کمیشن اگر وجود میں آگیا جیسا کہ توقع ہے تو اسے سب سے پہلے پاکستان کی تعلیمی غایتوں کا فیصلہ کرنا ہوگا ۔، یہ ملحوظ رہے کہ میں عام تعلیم کی غایتوں کا ذکر نہیں کر رہا ہوں ۔، میں تو یہاں پاکستان کی عام تعلیمی غایتوں کے سوال کو اٹھا رہا ہوں ۔ اور وہ اس لئے کہ پاکستان ہی اس وقت ایک ایسا ملک ہے، جس نے ایک نئے ثقافتی اور اجتماعی عقیدے کو اپنا نصب العین بنا کر ایک نئی مملکت کی بنیاد رکھی ہے ۔، ممکن ہے کچھ لوگ پاکستان کے اس فکری اور اجتماعی نصب العین کو محض اتفاقی حادثہ قرار دے رہے ہوں

مگر میں ان لوگوں سے متفق نہیں ہوں - میرے نزدیک پاکستان کا نصب العین محض جذباتی سا نظریہ نہیں - وہ تو ایک ایسا نظریہ ہے جس میں عاینوں کے لحاظ سے بڑے ثقافتی اور اجتماعی امکانات موجود ہیں - مجھے یقین ہے کہ اگر اس نظریئے پر عمل کیا جائے اور اس کے حصول کے لئے مناسب جد و جہد کی جائے تو یہ کوششیں ضرور بار آور ہوں گی اور اس سے عالم انسانی کو بڑے بڑے اجتماعی فوائد حاصل ہونگے -

مگر یہ یاد رہے کہ مجوزہ کمیشن کا کام کوئی آسان کام نہیں - کیونکہ کمیشن کو محض ترمیم نہیں بلکہ تخلیق یا تعمیر نو کرنی ہوگی - اس کو جرأت رندانہ سے کام لے کر پرانی تعلیمی عمارت کو بالکل بدل دینا ہوگا - جس طرح پاکستان ایک منفرد قسم کا سیاسی عمرانی تجربہ ہے اسی طرح اس کے تعلیمی منصوبے کو بھی ایک منفرد تجربے کی حیثیت سے دیکھنا ہوگا -

اس قسم کے نئے تعلیمی منصوبے کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ پہلے مروجہ تعلیمی نظام کے نقائص کا پورا پورا اعتراف کر لیا جائے - یہ تو ماننا پڑے گا کہ گذشتہ ایک سو سال میں اس بر صغیر میں تعلیم ایک خاص غرض کے تحت چلتی رہی اس عرصے میں بظاہر تعلیم کے بعض شعبوں میں ترقی بھی ہوئی، مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا بڑا وسیع نظام قائم ہوا - تعلیم و تربیت کے بعض جدید ترین طریقوں اور اصولوں سے کام لیا گیا - نظم و ضبط کا احساس ہوا - اور اصول و قواعد وضع ہو کر رائج ہوئے اور مختلف اشغال کے مد نظر تعلیم کے مختلف نصاب تجویز ہوئے اور ان میں ضروری ترمیمات ہوتی رہیں غرض گذشتہ سو سال میں مروجہ تعلیم، کئی اعتبار سے ملک کے لئے مفید بھی ثابت ہوئی، اور اس کے عملی اور تجرباتی نتائج کا ایک حصہ ایسا بھی ہے، جس کے تحفظ کی اب بھی ضرورت ہے کیونکہ اس کو ہم اپنی تعلیم کا قیمتی ورثہ خیال کرتے ہیں -

با این همہ پاکستان کے موجودہ عقائد کے پیش نظر ہم اس تعلیمی نظام کو قومی تعلیم کا درجہ نہیں دے سکتے ۔ کیونکہ اس تعلیم کا بنیادی محرک جذبہ غرض مندانہ تھا ۔ اس کے علاوہ اس کے اصول بیشتر صورتوں میں غیر فطری اور غیر عملی تھے ۔ اس میں ہمارے ملک کی سماجی، اخلاقی اور تہذیبی ضرورتوں کو مد نظر نہیں رکھا گیا تھا اور اس کے اکثر نمونے یا خاکے (Patterns) مستعار اور اجنبی تھے ۔ ان سب چیزوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری یہ تعلیم ہمارے حق میں اتنی مفید ثابت نہیں ہوئی جتنا کسی اچھی تعلیم کو ہونا چاہئے۔ ایک بہت بڑا نقصان اس نظام تعلیم سے یہ ہوا کہ ہماری تعلیمی روایت کا سلسلہ ٹوٹ گیا ۔ کیونکہ یہ تو مسلّم ہے کہ اس ملک میں بھی ایک تہذیب، ایک ثقافت تھی ۔ اس ملک کے لوگوں کا بھی کوئی ادب تھا، ان کی بھی کوئی روایات تھیں۔ ان کا بھی کوئی نظام تعلیم و تربیت تھا، ۔ میکالے کی نظر میں ان کی اہمیت کچھ بھی ہو یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ تاج محل کی بنا ڈالنے والی قوم، دل اور نظر کی تہی نہیں ہو سکتی ۔، پاک بیں نگاہ اور گداز دل کی یہ تہذیب کسی گمبھیر تعلیمی روایت کے بغیر ممکن نہیں، مگر غیر ملکی حکومت نے یہ تعلیمی روایت یکسر فنا کردی ۔، اس میں اس کے بُرے ارادے کا دخل نہ بھی ہو، تب بھی اس سے ہمارے فکر و نظر کی فطری ترقی بالکل رک گئی ۔ اس سے ہماری تعلیم دو متحارب کیمپوں میں تقسیم ہو گئی اور ملک ان عمدہ نتائج علمی سے محروم ہو گیا جو ان دونوں نقطہ ہائے نظر کے اجتماع و ترکیب سے لازمی طور سے برآمد ہوتے ۔ آج کئی سوچنے والے اور محسوس کرنے والے یہ شکایت کرتے ہیں کہ اب ہم میں غزالی، ابن خلدونؒ، اور شاہ ولی اللہ نہیں پیدا ہوتے تو در اصل اس کی ذمہ داری ہماری ڈیڑھ ہزار سالہ تعلیمی روایت کے انقطاع پر ہے جس سے بڑھتی ہوئی روایت تو

ختم ہو گئی مگر علم و تعلیم تصنیف و تحقیق اور آزادانہ غور و فکر کی کوئی نئی روایت پیدا نہ ہو سکی ـــ!

بہر صورت اب پاکستان کے نظام تعلیم کی اساس اور غایت کو بدل دینا ہوگا ـ میری رائے میں مجوزہ کمشن کو سب سے پہلے پاکستانی تعلیم کی غایت متعین کرنی چاہئے ـ کیونکہ اسی پر اس ملک کی ساری تعلیم کی عمارت بلند ہو سکے گی اور اسی سے اس کی تفصیلات و جزئیات کے نقوش ابھار ہو سکیں گے ـ میں نے تعلیمی غایت کے سلسلے میں مخصوص عقائد کا سوال اس لئے اٹھایا ہے کہ تعلیم کے عام اور مثالی نصب‌العین کچھ بھی ہوں، عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم کے نظام تعلیم پر اس کے مخصوص سیاسی اور تہذیبی احوال کا اثر ضرور ہوتا ہے ـ اور عملی شکل میں، اقوام عالم میں سے ہر قوم اپنے خاص احوال کو مد نظر رکھنے پر مجبور ہو جاتی ہے ـ نظری اعتبار سے تو تعلیم کا ہر نصب‌العین اور ہر مقصد نیک ہی ہوتا ہے ـ مثلاً ، شخصیت کی تکمیل، خیر، صداقت اور حسن کی قدروں کی تربیت، عملی قابلیتوں کی تکمیل وغیرہ وغیرہ ـ افلاطون سے لیکر آج تک کئی اہل فکر نے تعلیم کے لئے نہایت اونچے اور مثالی مقاصد تجویز کئے ہیں ـ مگر اس کو تعلیم کی بد قسمتی کہئے یا ناگزیر خصوصیت کہ تہذیب انسانی کے ہر دور میں وہ سامنے کے مخصوص عمرانی یا سیاسی فلسفوں سے ضرور اثر پذیر ہوتی رہی ہے ـ جن میں سے بعض نے حقیقی تعلیم کو آگے بڑھایا اور بعض نے اس کو پیچھے دھکیل دیا ـ مگر مخصوص ملکی اور سماجی احوال کا اثر ہر دور میں ہوتا رہا اور اس کو قبول کرنے پر ہر قوم مجبور رہی ـ

بظاہر یہ تصور تنگ نظری پر مبنی معلوم ہوتا ہے اور میں پاکستان کو اس تنگ نظرانہ اور محدود نقطہ نظر کی دعوت کبھی

نہ دیتا اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ خوش قسمتی سے پاکستان کی بنیادی تعلیمی غایت قومی ہو جانے پر بھی وسیع اور آفاق گیر ہی رہے گی - یورپ اور امریکہ کے ماہرین تعلیم صدیوں کے تجربوں، کاوشوں اور بحثوں کے بعد جس بین الاقوامیت کی طرف اب رجوع کر رہے ہیں، وہ بین الاقوامیت مسلمانوں کے لئے کوئی نئی چیز نہیں - اسلامی ذہن اصولاً بین الاقوامیت آفاقیت، اور انسانیت سے مانوس ہے - یورپ اور امریکہ بڑی بڑی فکری بغاوتوں کے بعد آج اس تصور کے قریب آئے ہیں جو نسل اور جغرافیہ کی حدوں سے بلند تر نظر کا مدعی ہے - اسلام کا یہ عقیدہ اس کے اولین عقائد میں سے ہے -

یہ تو آپ صاحبوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ یورپ میں دوسرے شعبہ ہائے فکر و نظر کی طرح تعلیمی نظریات میں بھی بغاوتوں کا ایک طویل سلسلہ نظر آتا ہے - کلاسیکی روایت کے خلاف انسانیاتی تحریک (Humanism) کی بغاوت ، اس کے خلاف عمرانیاتی پھر عام سائنسی تحریک - بیچ میں شوپن ہار کی ''خود رو رضائیت (Voluntarism) اور پھر عملی تجرباتی تحریک (Pragmatism) غرض، اسی طرح تعلیم کبھی قومی، کبھی نسلی، کبھی علاقائی عصبیتوں سے متاثر ہوتی رہی، جس کا ایک نمایاں نقطہ وہ تھا جو نازی جرمنی کی درس گاہوں میں نمودار ہوا اور ایک وہ ہے جو اس وقت ایک طرف روس کی منظم تدریس میں ملتا ہے اور دوسری طرف امریکہ کی ''قومی بین الاقوامیت،، کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے -

ان سب نظریات میں اصولی اختلافی مسئلے کم و بیش دو ہی ہیں اول یہ کہ تعلیم کا مقصود کس قسم کے انسان اور کس قسم کی سوسائٹی پیدا کرنا ہے اور دوسرا یہ کہ خدا اور انسان اور فرد و

اجتماع کے باھمی روابط کیا ھیں اور تعلیم ان کی تنظیم میں کیا مدد دے سکتی ھے ۔؟

دنیا کے موجودہ تعلیمی افکار کے تجزیئے سے یہ محسوس ھوتا ھے کہ اس وقت ذھن انسانی، انسان کی ان قسموں کے جھگڑے سے سخت تنگ آگیا ھے اور اب وہ ایک ایسے انسان کی تلاش میں ھے جو عالم ھو یا نہ ھو، نیک ضرور ھو، اور اسے اب ایک ایسے معاشرہ کی تلاش ھے ، جس کی حدیں جغرافیہ نے نہیں ، اساس نے قائم کی ھوں ۔ اسی طرح انسان اب مادے کی کارفرمائیوں سے خوف زدہ ھوکر خود اپنے مستقبل کے بارے میں متفکر ھے ۔ ان حالات میں اب دنیا روحانیات اور مادیات میں مناسب پیوند اور خوشگوار توازن کی آرزومند ھے وہ خاص کی بجائے عام، قومیت کی بجائے بین الاقوامیت اور عصبیت کی بجائے انسانیت کی طرف مائل ھے ۔ اور تعلیم کو سائنس بنانے کی بجائے پھر اخلاق، دین اور فلسفہ بنانے کے رجحانات پیدا ھو رھے ھیں اس کی تائید میں ، میں امریکہ کی مجلس مذاکرہ تعلیمی (Symposium) کی روداد کا صرف ایک ھی اقتباس پیش کرنا کافی سمجھتا ھوں ۔ (ملاحظہ ھو ضمیمہ الف)

اسی طرح صدر امریکہ کے تعلیمی کمیشن کی اکثر سفارسات کا رخ بھی ادھر ھی ھے ۔ یہاں تک کہ خود روس میں بھی جس پر جبریت کا الزام ھے ۔ Return to Culture کی صدا سننے میں آ رھی ھے ۔ جو در اصل مادی افادیت کے ڈھیلا ھونے کی واضح علامت ھے ۔

اس گفتگو سے یہ تو ظاھر ھوا کہ اس وقت تعلیم کا عام رجحان یہ ھے کہ اس میں مادی مقاصد کے ساتھ ساتھ روحانی و اخلاقی تکمیل بھی مد نظر رھنی چاھئے ۔ یہ تصور وہ ھے جو دنیا کو بڑی روحانی آزمائش اور سخت ذھنی تکلیف کے بعد اب ھاتھ آیا ھے ۔ مگر یہ

تصور تو وهی ہے جو مسلمانوں کی تعلیمی روایت کا همیشه سے ایک اهم اصول رها ہے -

امام غزالی کی رائے میں تعلم کا مقصد محض رضائے الٰہی کا حصول ہے اس کے سوا کچھ نہیں، - اور یه رضائے الٰہی ہے کیا ؟ یه ہے انسان کے انسان و کائنات سے روابط کی ایک صورت جسمیں بندے کو هر وقت یه مد نظر رہے که خدا هی ساری دنیا کا خالق ہے - اسی نے سارے عالم کو کنفس واحده پیدا کیا ہے -ذات خداوندی کا یہی احساس تعلم کی غایت اولی ہے جو اگرچه ہے بہت دشوار مگر نسل انسانی کی آخری امید اسی قسم کے تخیل میں ہے لیکن پاکستان کے لئے یه نظریه کوئی نیا نہیں - یه تو اس کا اپنا نظریه ہے - جو اسلام نے اس کو صدیوں پہلے دیا ہے- جس سے اسلامی تہذیب کی ساری بنیادی روح کم و بیش همیشه سرشار رهی ہے -

اس موقع پر ایک غلط فهمی کا ازاله ضروری معلوم هوتا ہے - عام طور سے مسلمانوں کے گذشته تعلیمی نظریات اور نظامات کے متعلق یه سمجھ لیا گیا ہے - که ان کی اساس محض دینی اور راهبانه ہے - اور اس کے نظام میں عقلی، تجربی اور سماجی علوم کا حصه معدوم یا ناقص ہے - مگر یه رائے حقائق کی روشنی میں صحیح نہیں -، تاریخی لحاظ سے عہد اسلامی کے تقریباً هر دور میں مقتضیات زمانه کے مطابق نصاب کے عملی پہلوؤں کو خاص اهمیت دی جاتی رهی ہے - میں اس وقت اسکی تفصیل میں نہیں جانا چاهتا مگر اشارتاً مقدمه ابن خلدون کے تعلیمی مباحث کا حواله دیتا هوں جن میں تعلیم کے عملی عناصر کا بڑا عمده تجزیه مل سکتا ہے - ابن خلدون کو اپنے زمانے کے تعلیمی نصاب کے خلاف بڑی شکایت یه تھی که اس میں صرف و نحو پر ضرورت سے زیاده زور دیا جاتا ہے - ان کے

نزدیک اس طریقے سے قوت تفکر اور تعصبل زبان کی آزاد کوشش کو سخت نقصان پہنچتا ہے ۔، اور یہ شکایت پرانے نصاب کے متعلق آج بھی درست ہے ۔ مگر سماجی علوم اور طبعی علوم سے پرانے زمانے کا نصاب خالی نہ تھا ۔ ابن خلدون نے ان کا خصوصی تذکرہ کیا ہے ہندوستان کے آخری دور میں درس نظامیہ ھی کو لے لیجئے اس میں بھی عملی علوم کا حصہ خاصا ہے ۔ اور درس نظامیہ کے خلاف تو بڑا اعتراض ھی یہ ہے کہ اس میں دینی عنصر کمزور اور دوسرے علوم کا حصہ زیادہ ہے ۔ چنانچہ کل نصاب میں دین کی کتابیں صرف تین ھیں ۔ ایک تفسیر کی، ایک حدیث کی، ایک فقہ کی، باقی سب کتابیں دوسرے عملی علوم سے متعلق ھیں جن میں سے بعض زبان و ادب کی استعداد کے لئے اور بعض تعقل و تفکر کی تربیت کے لئے رکھی گئی ھیں ۔

غرض پرانے نصاب و نظام پر لاکھ دوسرے اعتراضات ھوں مگر یہ کہنا کسی طرح درست نہیں کہ یہ نصاب عملی اور سماجی علوم کو کوئی اہمیت نہیں دیتا بلکہ پرانے نام مشہور نصابوں کی اصل روح یہی رھی ہے ۔ کہ ان سے دینی و دنیاوی اور علمی و عملی کا لفظی امتیاز مٹ کر ایک ایسا توازن روبہ نمودار ھو جو زندگی کو وحدت بسیط کی حیثیت سے دیکھ سکے ۔ غرض دین و دنیا کے درمیان توازن پیدا کرنا اور قائم رکھنا اس کا سب سے بڑا نصب العین رھا ہے !

یہ صحیح ہے کہ آج ھم پرانی تعلیم کو یک رخہ اور دنیا سے ذرا ھٹا ھؤا دیکھتے ھیں ۔ مگر اس کی ذمہ داری اس تعلیم پر نہیں قوم پر ہے یا اس دور غلامی پر ہے جس نے ھماری تعلیم کو دو کیمپوں میں تقسیم کردیا تھا یعنی جدید اور قدیم یا مشرق اور مغربی یا دینی اور دنیوی ۔ یہ چیز دراصل انگریزوں کا دیا ھوا تحفہ ہے جسے ھم آج تک

سینے سے لگائے پھرتے ھیں اگر ھماری تعلیم قدرتی ارتقا کی فضا میں آگے بڑھتی تو یہ دین اور دنیا کے دو کیمپ کبھی قائم نہ ھوتے۔ کیونکہ ھمارے تصورات کی رو سے دنیا دین کے اندر ھے ۔ اس سے باھر نہیں ۔ اسی وجہ سے ھمارے یہاں Christian secularised ، کی سی اصطلاحیں نہیں ملتیں ۔ '

بہر حال یہ دو عملی غیروں کی پیدا کی ھوئی ھے ۔ شبلی نے ندوۃالعلماء کی تحریک میں اس دو عملی کے خلاف آواز بلند کی تھی اور 'طریقہ وحدت تعلیم' پر اصرار کیا تھا تا کہ عام تعلیم کے لئے دینی مدرسے اور دنیوی مدرسے الگ الگ قائم ھوکر قوم کو فکری انتشار میں مبتلا نہ کریں ۔ مگر اس دور کے نقارخانے میں شبلی کی آواز توتی کی آواز سے بھی نحیف تر ثابت ھوئی ۔ میں سمجھتا ھوں کہ غلامی کے خاتمے کے بعد ھماری پاکستانی تعلیم ،نظریہ وحدت تعلیم کے اصول پر نافذ ھونی چاھئے جس میں ملا اور بابو کی یہ تقسیم باقی نہ رھے ۔ اس طرح علوم دین بھی محفوظ رھیں گے اور دنیوی علوم بھی دین کے دائرے میں آ جائیں گے ۔ اور روز روز کا یہ غوغا بھی ختم ھو جائے گا کہ حکومت علوم مشرق کو مٹانے پر تلی ھوئی ھے ۔ اور یہ شکایت بھی نہ رھے گی کہ مولوی ھمارے دین کے اجارہ دار بن کر ھمیں ترقی سے روک رھے ھیں اور اھل دین کی یہ واویلا بھی ختم ھوجائے گی کہ تعلیم یافتہ لوگ دین سے اس درجہ بیگانہ ھو رھے ھیں کہ انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ خلفائے راشدین کون تھے ۔ اور یثرب دنیا کے کس ملک میں واقع ھے ۔ میرا تو عاجزانہ خیال یہ ھے کہ وحدت تعلیم کا تصور ھی ھماری تعلیمی اور تہذیبی مشکلات کا حل ھے ۔ اس دو عملی اور دو کیمپوں کی لڑائی سے تو باھمی نفرت اور بغض و عناد ۔ اور اس سے بھی زیادہ دو طرفہ بے علمی

اور جہالت کی توسیع کے سوا کوئی نتیجہ بر آمد نہیں ہو سکتا ۔ وقت آگیا ہے کہ ہم گذشتہ ڈیڑھ سو سال کے تلخ تجربات سے فائدہ اٹھائیں اور غیروں کی نافذ کردہ اس دو عملی کا خاتمہ کر دیں ۔ وحدت تعلیم کا منصوبہ صحیح بھی ہے اور قابل عمل بھی ۔ مگر ہاں، اس کے لئے تعصب اور جمود دونوں کو خیر باد کہہ دینا پڑے گا ـــ!

غایت کے مسئلے کے بعد مجوزہ کمیشن کو یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ پاکستان کا تعلیمی نظام پہلے کی طرح پھر غیر قدرتی نہ ہونے پائے مروجہ تعلیم اس معنی میں نہایت غیر قدرتی ہے کہ اس کا ذریعہ تعلیم تقریباً ایک سو سال سے ایک غیر ملکی زبان ہے جس کی مشکلات علوم کی اشاعت کے لئے سنگ راہ بنی ہوئی ہیں ۔ دنیا کے ہر ملک میں ذریعہ تعلیم اپنی ہی زبان ہے مگر ہمارے ملک کو مجبوراً ایک غیر قدرتی طریق کار پر عامل ہونا پڑا ۔ یعنی اپنی زبان کی بجائے انگریزی میں پڑھنا پڑھانا ۔ بعض لوگ آج بھی اس غیر قدرتی طریق کار کے حق میں ہیں مگر بیشتر عقلی اور عملی دلائل اس کے خلاف ہیں ۔ انگریزی زبان کی اس حیثیت کو برقرار رکھنے کے حق میں صرف ایک ہی دلیل ہے اور وہ یہ کہ اس کے ذریعے ہم براہ راست انگریزی میں لکھے ہوئے علوم تک پہنچ جاتے ہیں ۔ اگر اس ایک فائدے کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو بھی منجملہ اور مضرتوں کے اس کے اس بڑے نقصان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہی چیز علوم کی عام اشاعت کے خلاف جاتی ہے اور علوم ملکی ذہنوں کے اندر جذب نہیں ہوپاتے ۔ علوم زور سے دماغوں میں ٹھونسے جاتے ہیں اور اس ٹھونسا ٹھانسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم میں آج تک صحیح علمی سپرٹ پیدا نہیں ہو پائی ۔ ہم اس وقت محض نقال ہیں ۔ ہم تو اس طوطے کیطرح ہیں جو سوچے سمجھے بغیر چند لفظوں کو رٹتا رہتا ہے ۔ یا پھر ہم

پیشه ور ترجمہ کرنے والوں کی قوم ہیں ۔ اور ترجمہ بھی کیسا ؟
بعد از وقت اور ادھورا ــــــــــــ میرا اپنا خیال تو یہ ہے کہ
علوم کا ترجمہ کرنا ہی فعل عبث ہے۔ علوم ترجمہ نہیں کئے
جاتے۔ جذب کئے جاتے ہیں یا ان کو عمل میں لایا جاتا ہے۔
علوم اصطلاح سازی نہیں تجربہ ہے ۔ عام یقین ہی نہیں حق الیقین ہے ۔
جو اپنی ترجمانی کے لئے اپنی زبان خود پیدا کرتا ہے ۔ کسی
دوسرے کی زبان (اصل یا ترجمے میں) علم کا منہ چڑانے کے سوا
کوئی کام نہیں کرسکتی۔ ممکن ہے دنیا میں اچھے ترجمے بھی کہیں
ہوئے ہوں ۔ مگر ایسے ترجمے تو گنگے کے اشارے ہیں ۔ فقط ۔
اور ہمارے ملک میں تو ترجمہ کرنے والے ترجمہ کرتے
وقت بھی انگریزی میں ہی سوچتے ہیں کیونکہ ان کی اپنی زبان
کوئی ہے نہیں جسمیں وہ سوچ سکیں ۔ اور جو زبان ان کی تھی وہ ایک
سو سال کی غلامی نے مٹا دی ۔ انگریزی سے ترجمہ کرنے والے کے
لئے عربی فارسی ، کی علمی زبان میں تبحر کی ضرورت ہے۔ یہ تبحر
اب کہاں ہے۔ اس کا گلا تو مدرسے پہلے ہی سے گھونٹ چکے ہیں
ہاں عالموں سے کچھ استفادہ کیا جا سکتا تھا۔ مگر ان کو تعلیمی
دوعملی نے کچھ ایسا بے آبرو کیا ہے کہ اب انہیں خود بھی اپنے
اوپر اعتماد نہیں رہا۔ اس دوعملی نے قدیم و جدید کے درمیان ایسی
خلیج حائل کردی ہے کہ اب مفاہمت کے دروازے تقریباً بند ہو چکے ہیں۔
گویا ایک ہی ملک میں دو الگ الگ قومیں آباد ہیں جنکی
زبانیں بھی الگ الگ ہیں اور مزاج بھی الگ الگ ۔ اس صورت
میں ترجمہ کرنے والے ایک نئی اور اجنبی زبان گھڑ رہے ہیں
جن سے کوئی طبقہ بھی واقف نہیں ۔ یہی صورت اصطلاحات کی ہے۔
بڑا سوال تو یہ ہے کہ ہم اصطلاحات کس کے لئے گھڑ رہے ہیں
شاید ہائی ٹاٹ کے لئے یا جنات کے لئے ؟ کیونکہ ہم جن کے لئے یہ اصطلاحات

بنا رہے ہیں وہ تو بدستور انگریزی پڑھ رہے ہیں ۔ پھر ان اصطلاحات
کو استعمال کون کرے گا ؟ یہ نئی اصطلاحات اسی طرح بے کار رہیں گی
جس طرح قدیم اصطلاحات جو مولویوں کے پاس ہیں اور ان سے صرف
وہی با خبر ہیں دوسرا کوئی نہیں۔ غرض ایک گڑ بڑ ہے جو جاری ہے
اور کوئی نہیں جو مرض کے اصل علاج کی طرف متوجہ ہو ۔
آخر یہ تو سوچئے کہ گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں ہمارے یہاں
علوم کی نظری یا علمی یا تجرباتی کوئی روایت کیوں پیدا
نہیں ہوسکی ۔ اس کا کوئی سبب بھی تو ہوگا ؟ ۔ علوم کو
تجربے میں لا کر یا علمی تجربوں سے علوم کو وجود میں لا کر، دنیا کے
علم میں کوئی خاص اضافہ ہمارے ملک کے سائنسی عالموں نے (جہاں تک
مجھے معلوم ہے) نہیں کیا ۔ اسکی بھی تو کوئی وجہ ہوگی ۔ علم
کے جغرافیے میں ہماری بستی کا نام تک موجود نہیں ۔ اس پر بھی تو
کچھ غور ہونا چاہئیے ۔ ان سے بہتر تو وہی لوگ رہے جو
پچھلی ترتیب سے آشنا تھے پھر نئی روشنی سے مستفید ہو کر اچھا
خاصہ کام کر گئے ان میں چند نام امثال ، امیر علی ، سید علی
بلگرامی، وغیرہ کے مل تو جاتے ہیں ۔ جن کا امتیازی کام عالمی
پیمانے پر بھی نظر انداز نہیں ہوسکتا ۔ مگر خالص انگریزی تعلیم نے
کیا کر دکھایا اس نے کون کون بڑی ہستیاں پیدا کیں ۔ اس سوال
کا جواب آپ مجھ سے بہتر دے سکتے ہیں اور اس بات سے تو کوئی
بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اس غیر فدرتی نظام تعلیم نے ملک کی اعلیٰ
اختراعی تخلیقی صلاحیتوں کو بالکل تباہ کردیا ہے ۔ ہم میں آزادانہ سوچنے
کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ ہماری سوچ کی دنیا تنگ ہوگئی ہے ۔
ہم غلامانہ تفکر کے دائرے میں قید ہوکر اس تنگی کو بھی وسعت
ہی خیال کرنے لگے ہیں ۔ اور نہیں سوچتے کہ جاپان، روس، چین،
بھی تو انگریزی کے بغیر جی رہے ہیں اور نظری اور تجرباتی علوم میں

روز بروز آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور روس کا غیر انگریزی دان سائنس دان تو اب آسوئے افلاک پہنچنے کے لئے پر تول رہا ہے۔ یہ سب ترقی ان ملکوں نے اسلئے کی کہ انہوں نے اپنی تعلیم و تربیت کی اساس قدرتی اصولوں پر رکھی۔ اور ہم ڈیڑھ سو سال میں یہاں تک پہنچے کہ تجرباتی علم میں ایک مسری کی سطح تک بھی نہیں پہنچ سکے۔ آخر یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے۔ اس پر کبھی تو غور کر نی لینا چاہئیے اور موجودہ کمیشن سے بہتر کون سا ادارہ ہوگا اور موجودہ وقت سے بہتر کون سا وقت ہوگا جو اس کام کے لئے موزوں ہوگا۔

مروجہ نظامِ تعلیم کے چند اور پہلو بھی قابل غور ہیں ـــــ مثلاً تعلیم کی مدت اور اخراجات تعلیم کا سوال۔ مجھے یہ تسلیم ہے کہ ہمارا تعلیمی دائرہ اتنا وسیع ہوچکا ہے اور انسانی مسائل و معلومات کی پر پیچ وسعتوں کے ساتھ تعلیم کی تنظیم بھی اپنی پر پیچ سی سے ہوگئی ہے کہ اب اسکو کامل طور پر قدیم نظام تعلیم کے نمونے پر لانا مشکل بھی ہے اور ناقابل عمل بھی۔ مگر قدیم نظام تعلیم کا ایک اصول اور تجربہ ایسا ہے جو آج بھی قابل غور اور قابل قدر ہے۔ وہ ہے مدت تعلیم کا تجربہ ۔ عام احساس یہی ہے کہ اس وقت طلباء کی عمر کا کارآمد اور پر جوش زمانہ غیر ضروری طور پر تعلیم میں صرف ہوجاتا ہے چنانچہ تکمیل کے لئے ۲۰ سے لے کر ۲۵ سال تک کی عمر درکار ہوتی ہے۔ اس طرح تکمیل کے بعد تخلیق و تحقیق اور تعلیم کے عملی استعمال کے لئے جوش عمل کا زمانہ کچھ زیادہ نہیں رہتا ـــــ بقول اکبر

مغربی کورس میں ہوئی ہے جوانی رخصت

اب تو پیری رہی رندانہ مشاغل کیلئے

شاید یہی سبب ہے کہ ہمارے ملک میں اعلی ذہنی فکری اور عملی کار کردگی کی شخصی رو داد اکثر تشنہ و مختصر ہی رہتی ہے۔ اور مقابلۃً

جب اسلاف کے کام پر نظر ڈالی جاتی ہے تو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانہ کے لوگوں کی زندگیاں کتنی سحر خیز اور بار آور ہوتی تھیں۔ چنانچہ ہماری تاریخ کے ہر دور میں کثیرالتصانیف مصنفوں کی بڑی کثرت دکھائی دیتی ہے، ان میں سے اکثر تصانیف معمولی رسائل تک محدود نہ تھیں بلکہ نہایت جامع، خیال انگیز اور عہد آفریں ہوتی تھیں۔ یہ فہرست بڑی طویل ہے(۱) مگر چند بزرگوں کے نام سن لیجئے:

امام غزالی، ابن عربی، ابن الجوزی، الکندی، فخر رازی، ابن تیمیہ، سیوطی، ابن خطیب، ابن سینا، ابوبکر رازی، ابن الہیثم، زمخشری جن کی تصانیف کی تعداد پچاس سے اوپر ہے اور دور آخر میں شاہ ولی اللہ، خان آرزو، آزاد بلگرامی ـــــ اور سر سید احمد خان، شبلی، نذیر احمد کی تصانیف، کا حال تو آپ سبکو معلوم ہی ہے ان بزرگوں کا اتنا وسیع اور پہلودار کام واقعی حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔ اور اس میں باقی اسباب کے علاوہ مدت تعلیم کے کم ہونے کا بھی بڑا حصہ ہے۔

پرانے نظام تعلیم میں تکمیل کی مدت موجودہ زمانے کی تکمیلی مدت سے بہت کم تھی۔ صرف ہندوستان کے پرانے اہل کمال میں سے صرف چند مثالیں لیجئے۔ فیضی نے ۱۴ سال کی عمر میں تکمیل کی ابوالفضل نے ۱۵ سال میں، شاہ ولی اللہ نے ۱۵ سال میں، ملا بحرالعلوم نے ۱۷ سال میں، قاضی ثناءاللہ پانی پتی نے ۱۸ سال میں، اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے ۱۷ سال میں۔ اور جو لوگ مذکورہ بزرگوں کی فضیلتوں سے باخبر ہیں انہیں معلوم ہے کہ یہ لوگ معمولی درجے کے لوگ نہ تھے۔

---

(۱) جمیل بک کی کتاب عقودالجواہر میں ۳۵ ایسے مصنفوں کے نام درج ہیں جن کی تصانیف کی تعداد ۵۰ اور ۱۰۰ کے درمیان تھی۔

مدت تعلیم کے کم ہونے میں اور کوئی جادو نہیں ـــ اس کا راز صرف یہ ہے کہ آزاد اور گہرے مطالعہ کے لئے یا عملی زندگی کے لئے طالب‌العلم کو وقت زیادہ مل جاتا ہے ـــ آخر دیر تک کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ماں باپ کا روپیہ ضائع کرانے سے فائدہ بھی کیا ہے - کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تو صرف رہنمائی اور نشان دہی ہونی چاہئیے - اور اگر غور کیا جائے تو تعلیم علم کی منزلوں کی رسمی اور اصولی نشان دہی کا نام ہے - ان رسمیات اور اصولیات کے عبور میں زیادہ وقت لگانے سے سچے مطالعہ یا عملی زندگی کے امکانات اور پروگرام کو شدید نقصان پہنچتا ہے - ان پر زیادہ وقت صرف نہیں کرانا چاہئیے - یوں پورے علوم کے احاطہ اور گہرے مطالعہ و تحقیق کے لئے تو ایک عمر نہیں کئی عمریں درکار ہیں - اس کے لئے تو من‌المہدالی‌اللحد کا اصول ہی صحیح اصول ہے ـــ روایت ہے کہ ابوالفضل نے ریاضی اور علوم طبیعی کی تحصیل اپنی عمر کے آخری ایام میں کی تھی - اور اس عمر میں قرآن مجید کے حفظ کرنے کی تو صدہا مثالیں مل جاتی ہیں ـــ بہر حال عام رسمی تکمیل کے لئے مدت جتنی کم ہوگی عملی زندگی کے لئے وقت اتنا ہی زیادہ بچے گا ـــ اور یہ وہ قیمتی وقت ہوگا جس کے عمدہ نتائج سے فرد، اجتماع اور قوم و ملت سبکو فائدہ پہنچے گا -

حضرات! تعلیم کے مصارف کا سوال بھی اسی مسئلے کے ساتھ وابستہ ہے - خصوصاً اس غریب ملک کے لئے اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے - مجھے تسلیم ہے کہ حیات اجتماعی کے اس دور میں خانقاہوں کی سی بوریا نشینی ممکن نہیں ـــ اب عام شہری بھی اعلی معیار زندگی کے پر فریب طلسم میں اس حد تک گرفتار ہو چکا ہے کہ اسکو مسجد کی چٹائیوں پر بیٹھنے کی دعوت دینا اس کے احساس عزت پر کچھ

زیادتی ہی ہوگی ۔ مگر قوم و ملک کے موجودہ وسائل کو دیکھتے ہوئے بوریا نشینی کی سرشت پیدا کرنے کی دعوت اور ضرورت ہرگز بے جا اور نامناسب بات نہیں — یہ حقیقت سب پر روشن ہے کہ اس وقت تعلیم پُر مصارف ہوئی ہے اور بے نتیجہ بھی ۔ اس وقت تعلیم ساہ خرچی اور اسراف کا دوسرا نام ہے ۔ اس وقت تمام سہری گراں تعلیم سے انگشت حیرت بدنداں ہی نہیں سرنگرساں بھی ہے مگر جمود، غلامی، نقالی، کند ذہنی اور روحانی گراوٹ نے ہم سب کو ایسا گند کردیا ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس گراں نظام تعلیم کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرأت نہیں کرتا ۔ ہم میں سے کوئی بھی اس گرانی کے اسباب پر غور نہیں کرتا ۔ ہم میں سے کوئی بھی اسکا علاج تجویز نہیں کرتا ۔

میں ایک غریب سے ادارے کا منصرم ہوں ۔ اس حیثیت سے مجھے تعلیم دلانے والے والدین کی ذہنی پریشانیوں کا جو تجربہ ہوا ہے — اور اس کے نتیجے میں جس روحانی انحطاط کا میں نے مشاہدہ کیا ہے اسکو دیکھ کر تو میں اس سارے تعلیمی مشنری کو خطرے کی نگاہ سے دیکھنے لگا ہوں — مگر جرأت مجھ میں بھی نہیں کہ میں اس نظام کے خلاف کوئی مؤثر آواز بلند کروں — ڈر صرف یہ ہے کہ لوگ شور مچا دیں گے کہ یہ شخص قوم کو پھر بیابان کیطرف بلا رہا ہے ۔ جہاں نہ سینما ہوں گے اور نہ (Variety Show) ۔ بس وہی خانقاہیں اور ان کی چٹائیاں ۔ استغفراللہ یہ بھی کوئی زندگی ہے ۔

صاحبو! میں علی وجہ البصیرت یہ رائے رکھتا ہوں کہ موجودہ مدرسوں کے نظام کے مقابلے میں مسجدوں اور خانقاہوں کا نظام تعلیم زیادہ قابل عمل اور غایتوں کے لحاظ سے زیادہ پرمنفعت نظام تھا — جو کم خرچ تھا مگر زیادہ نفع کی طرف لے جاتا تھا — اب ہزار ہا روپے کے خرچ کے بعد بھی نفع معدوم ہے ۔ اس وقت تعلیم آزاد تھی .

اب تعلیم مقید ہے ۔ اس کی وجہ سے اب حکومتوں کو بھی طرح طرح کی پریشانیاں ہیں تعلیم کے سلسلے گراں ہوگئے ہیں اور اپنے وسیع نظام کے اخراجات حکومتوں کے بس کی بات نہیں رہی۔ لہذا جو نظام بھی نافذ ہوتے ہیں ان کے لئے نہ روپیہ ہوتا ہے ـــــ نہ وسائل ـــــ پھر کوئی ان سے پوچھے کہ صاحب ! جو نظام حل نہیں سکتا اسکو محض اس وجہ سے چلاتے جانا کہ امریکہ یا انگلستان میں ایسا ہی ہوتا ہے کہاں کی دانش مندی ہے ۔ میرا تو خانقاہی سا مشورہ یہ ہے کہ اس نقالی کو چھوڑئیے ! تعلیم کو آزاد کیجئے۔ اور ارزاں بھی ! وہی ، بزرگوں کی سی پوریا نشینی جس کے بغیر تعلیم اس وقت عام شہری کے لئے عذاب ہی عذاب ہے ۔ یعنی نور کے لڈو کہ جو کھائے وہ بھی پچھتائے جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے ! ان حالات میں تعلیم کو ارزاں کرنا ہی وقت کی سب سے بڑی ضرورت معلوم ہوتی ہے ۔

اب آپ قدرتی طور پر پوچھیں گے کہ تعلیم میں پوریا نشینی کی یہ شرط عملی طور پر پیدا کرنے کی آخر کوئی تدبیر بھی ہو ! میں عرض کرتا ہوں کہ اسکی صورت ہے تبدیلئی ذہن اور آزادیٔ فکر ! یہی آزادیٔ فکر ہم میں اس ساھن کی سی جرأت پیدا کرے گی جس نے اقبال کی روایت کے مطابق پہاڑوں پر بسیرا کر لیا تھا ۔ یہ جرأت سب سے پہلے قوم کو عرفان نفس سے بہرہ ور کرے گی ۔ پھر آہستہ سے ہمارے کان میں یہ بات ڈال دے گی کہ اپنے ملک کے مسائل اپنے ملک کے وسائل کے مطابق اور ان کی روشنی میں ہی حل ہونے چاھئیں ! یہی سو نصیحتوں کی ایک نصیحت ہے !

ہمارے ملک کے وسائل ہم سے یہ تقاضا کرتے ہیں کہ ہم تعلیم کا سارا بوجھ حکومت پر نہ ڈالیں اور ان ذمہ داریوں میں اس کا ھاتھ بٹائیں میرا خیال ہے کہ تعلیم قومی زندگی کا ایک آزاد ادارہ ہے ۔ اسکا بار پبلک

کو برداشت کرنا چاہئیے ۔۔۔ میرا یہ خیال جنرل ایجوکیشن کے بارے میں ہے ۔ البتہ پیشہ ورانہ اور کارخانجات کی تعلیم یعنی ٹکنیکل تعلیم کی ذمہ داری تمام تر حکومت پر ڈالی جانی چاہئیے ۔ تاکہ ملک کی ٹکنیکل ضروریوں کی سرانجامی زیادہ منظم انداز میں ہو ۔۔۔ اس کے علاوہ جنرل ایجوکیشن کے نصابات کم سے کم ہوں ۔ یعنی صرف رسمی، سانددھی ! طویل نصابات سے اخراجات بھی بڑھتے ہیں اور سطحیت بھی پیدا ہوتی ہے ۔۔۔ اور ان سب امور کے ساتھ عام تعلیم کی تکمیلی مدت بھی زیادہ ہو جاتی ہے ۔۔۔، رہا حکومت کی ملازمتوں کا سوال سو اسکے لئے ہر سطح پر مقابلے کے امتحانات رائج کئے جائیں مگر تعلیم کی واحد غایت ملازمت نہیں ہونی چاہئیے ۔ تعلیم کا ایک نتیجہ ملازمت تو ہو سکتا ہے مگر تعلیم برائے ملازمت کی عادت عہد غلامی کی یادگار ہے ۔ پھر تعلیم اور عام پیشوں کے درمیانی فاصلوں کو بھی مٹا دیا جائے کیونکہ پیشہ وروں کو یہ احساس ہے کہ ہم دوسرے شہریوں سے کم درجے کے لوگ ہیں ۔ اس احساس کے تحت پیشہ وروں کی اولاد بابو بن جانے کو قابل فخر چیز خیال کرنے لگی ہے ۔ اسی وجہ سے پیشے نابود ہو رہے ہیں ۔ اسی طرح تعلیم میں سادہ زندگی کی تربیت کا اصول رائج ہو ۔ کیونکہ اس وقت ملک میں سادہ زندگی کو ذلت کا نشان سمجھا جاتا ہے ۔ کوٹ پتلون اور ریشمی کپڑے لازمہ عزت و شرافت بن گئے ہیں ۔ مگر یہ تبدیلی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تعلیمی اداروں میں اخلاقی دفعہ ۱۴۴ نافذ نہ ہو گی جس کی رو سے منقش پالکیوں کا داخلہ ان سڑکوں پر ممنوع ہو جائے جن پر طالب علموں کی ہر وقت آمدو رفت رہتی ہے ۔ یہی وہ سڑکیں ہیں جن پر غریبوں کے بچے سرنگوں سر افگندہ اور مغموم پھرتے ہیں ۔۔۔ اور ایک ایسے معاشرہ کی سوچ سوچنے لگتے ہیں جو نازک طبائع کے لئے کچھ ناگوار سا ہے یعنی محض پیدل چلنے والوں

کا معاشرہ! بلاشبہ سوچ کا یہ انداز ذہنی کجروی کا نشان ہے ۔ مگر اس ذہنی کجروی کی ذمہ داری کس پر ہے؟ یقیناً اس نظام تعلیم پر جسمیں خدا کا نور ـــــ یا علم ـــــ منڈی کے مال کی طرح حور بازارمیں فروخت ہوتا ہے ۔ اور اس سے صرف وہی آدمی استفادہ کر سکتا ہے جس کے جیب میں خزانہ شاہی کے زرنگار نوٹ موجود ہوتے ہیں پرانے نظام تعلیم نے اسی لئے تو علم کو خود ایک دولت قرار دیا تھا ۔ اور امام غزالی نے تو علم فروشوں کو لائق تعزیر قرار دے کر فیصلہ ہی کر دیا تھا کہ تعلیم ہر حال میں مفت ہونی چاہئیے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے مجوزہ نظام تعلیم میں حجۃ الاسلام امام غزالی کا یہ زریں اصول خاص طور سے مدنظر رہنا چاہئیے ۔

جناب صدر ۔ پاکستان کی تعلیم کے متعلق میرے یہ خیالات ہیں ۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اگر پاکستانی تعلیم کا منصوبہ ان تعلیمی اصولوں پر بنایا جائے تو اس سے بہت سی وہ شکایتیں رفع ہو سکتی ہیں جو اس وقت لوگوں کی زبانوں پر ہیں ـــــ ، انہی تعلیمی اصولوں سے مشرقی علوم کے بہت سے مسائل بھی حل ہو سکتے ہیں ـــــ ، اگر آج ملک میں نظریہ وحدت تعلیم نافذ ہو جائے اور نئے اور پرانے کی یہ غیر قدرتی تقسیم مٹ جائے تو مسجد و خانقاہ اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے درمیانی فاصلے بھی مٹ جائینگے ـــــ !

ان گزارشات کے بعد ، میں ایک بار پھر عالی جناب سردار صاحب اور محترمہ صدر صاحبہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور جملہ خواتین و حاضرین کی خدمت میں ہدیہ نیاز پیش کر کے آپ سے رخصت ہوتا ہوں ۔

ضمیمہ الف

"If education in the United States at this critical stage in civilised history is to set an example, is to be of service to human nature in its variety and richness, education should cease to serve the material at the expense of spiritual, the special at the expense of the general. It should cease to serve the interests of the nation at the expense of world community, upon the creation of which the welfare of every nation, our own not least, has come to depend."

GEORGE B. De HUSZAR,
Goals for American Education.

یونیورسٹی اورینٹل کالج

کا

۸۸واں یوم تأسیس

(منعقدہ ۲۳ نومبر ۱۹۵۷ء)

خطبۂ صدارت

جو

ڈاکٹر مس خدیجہ فیروزالدین
بی ۔ اے (آنرز) ایم ۔ اے (ہسٹری) ایم ۔ او ۔ ایل (گولڈ میڈلسٹ) ڈی لٹ

نے پڑھا

باسمہ تعالیٰ

برادر عالیقدر سردار عبدالرشید خان صاحب!

محترم پرنسپل صاحب و حاضرین کرام!

یہ فیصلہ آپ کے ہاتھ ہے کہ آیا اورئینٹل کالج کی پر عظمت تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک گوشہ گیر خاتون کی ایسے اہم اجتماع میں ذمہ داری صدارت سے عہدہ برآ ہونے کی جرأت تحسین کی مستحق ہے یا آپ کی فیاضانہ پیشکش؟ بہرصورت تشکروامتنان سے لبریزقلب کے ساتھ میں تقریب یوم‌تاسیس پر اس دارالعلوم کے مقصد حیات، اس کی کارگزاریوں اور دشواریوں کا مرقع پیش کرونگی جس کا اثر بالواسطہ اور ایک وسیع حلقۂ سوسائٹی پر بلا واسطہ پڑ رہا ہے۔

جس قوم کے ذی شعور افراد نے آج سے اٹھاسی برس پیشتر اس درس گاہ کی بنیاد ڈالی اس سے بہ ہیئت مجموعی ہمیں ہزار اختلاف اور اس کی سیاسی خود غرضیوں سے شکوہ سہی مگر ہر جمعیت میں جہاں کوتاہ بین عنصر غالب ہوتا ہے وہاں ایسی ہستیاں بھی اس کی عزت کو چار چاند لگاتی ہیں جو کسی قیمت پر بھی حق و انصاف کو ہاتھ سے نہیں دیتیں اور جو رنگ و نسل سے بالا تر نوع بشر کی فلاح و بہبود کا جذبہ اپنے اندر بدرجہ اتم رکھتی ہیں۔ انگریز قوم کا وہ رکنِ رکین جو اورئینٹل کالج کو معرض وجود میں لایا انہی بلند پایہ نفوس میں سے ایک تھا۔ فن تعلیم کا یہ ماہر ڈاکٹر لائٹنر نامی تھا جس نے متحدہ ہندوستان میں اولین مرکز مشرقیات لاہور میں قائم کیا۔ ڈاکٹر لائٹنر اپنی مہارت اولی کی بدولت اس اصول سے بخوبی واقف تھا کہ کسی قوم کی ذہنی تربیت اس وقت تک پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی جب تک تعلیم کو ملّی خصوصیات و نظریات، مذہب و قوانین کے

ساتھ مربوط نہ کیا جائے۔ ملّی کردار کی تعمیر اور ذہن رسا کی نشو و نما اسی تعلیم کا ماحصل ہوسکتے ہیں جو اس قوم کی روایات ثقافت اور علوم پر مبنی ہو۔ اسی قاعدے کے پیش نظر اس نے یہاں ایک ایسی یونیورسٹی قائم کرنے کا عزم کیا ۔ جو علوم مشرق کے احیاء کی علمبردار ہو اور قوم کے ذہنی ارتقاء کے لئے اس کے دینی نظریات اور تاریخی روایات کی بنیادیں استوار کرے ۔ ایسے شاندار دارالعلوم کا تصور باندھ کر ڈاکٹر لائٹنر نے اس کی بنیاد ایک کالج کی شکل میں ڈالی مگر حالات نے قافیہ تنگ کر دیا ۔ اس کی عقابی پرواز روک دی گئی اور وہ آگے نہ بڑھ سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قریباً ایک صدی گزرنے پر اور کئی ایک صفا کیش ماہرین تعلیم سے علاقہ جوڑنے کے باوجود اورئینٹل کالج پر کس مپرسی کی کیفیت ہی طاری رہی بلکہ متعدد بار آبیاری کی بجائے اس شجر کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کی سعی بھی بروئے کار آئی ۔

یہ ایک بد قسمتی ہے کہ اورئینٹل کالج اس ملک کی شایان شان اورئینٹل یونیورسٹی نہ بن سکا جس سے یہ مشرقیات میں ید طولی حاصل کرتا اور براعظم ایشیا کی علمی رہنمائی کا دم بھرتا ۔

اور پھر یہ کہ پنجاب یونیورسٹی جیسی عظیم الشان یونیورسٹی کے سایۂ عاطفت میں رہ کر بھی فیوض و برکات سے محروم رہا جو مزید تکلیف دہ امر ہے ۔

یونیورسٹی کا وجود ایک فریم ورک کی حیثیت رکھتا ہے جس کے اندر مختلف نمونوں کے کالج اپنے اپنے رنگ روپ میں نشو و نما پاتے ہیں اور یونیورسٹی اپنی ہئیت اجتماعیہ میں ان تمام کالجوں کے لئے آزادانہ ارتقاء کا ماحول پیدا کرتی ہے اور ان کی انفرادیت کو اجاگر کرنے میں ممد و معاون ہوتی ہے ۔

واضح رہے کہ ہر کالج بجائے خود ایک سوسائٹی ہے جس کے افراد ایک خاص ذوق رجحان کے مالک ہیں اور یہ خصوصیت مقتضی ہے کہ وہ بغیر کسی بیرونی دباؤ کے اپنی ذمہ داریوں کا زیادہ سے زیادہ احساس

رکھیں اور خود ھی جائزہ لیں کہ وہ کہاں تک ' سوسائٹی ' کی تقویت ' مفاد ' صحت مندانہ فضاء کی تخلیق اور وحدت و کثرت کے روابط کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کر رہے ھیں - تاکہ ایک تکمیل یافتہ اکائی کی صورت میں یونیورسٹی کے فریم ورک میں اپنے متعین مقام پر وہ اپنی ذھنی قوتوں کو بدرجہ اتم حرکت میں لا سکیں - ارباب حل و عقد کالج اور یونیورسٹی سے یہ امر مخفی نہیں کہ لیڈر شپ یعنی قیادت صالح کے اوصاف فی زمانہ ھماری سر زمین میں جتنے اھم ھیں اتنے ھی ناپید ھیں - اس سے مراد وہ جبر و اکراہ نہیں جو بزور و بطلم گردنیں جھکا دے بلکہ عقلی شعور ' فہم و فراست ' ادراک و عمل جو تجلی روحانیت سے مزین خود بخود لوگوں کو ایسی پیروی کی طرف راغب کرے جس سے خود ان کی جبلی صلاحیتیں بروئے کار آئیں -

مرد حقانی کی پیشانی کا نور کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

انہیں معلوم ھے کہ طلباء قوم کا وہ بیش بہا سرمایہ ھیں جو آئندہ نسلوں کو ودیعت کیا جائے گا اور وہ تمام ملی روایات ' قدریں ' مقاصد حیات اور نظریات جن سے آج ھماری ھیئت اجتماعی تشکیل پاتی ھے وھی انہیں ورثہ میں ملیں گے - اس لئے وہ ذمہ دار ھستیاں اور درسگاھیں جن کے ھاتھ میں تعلیم کا نظام ھے - ان کا فرض اولین ھے کہ وہ اپنے لآلی فکر کو اسطرح منظم و مرتب کریں کہ گزشتہ دور کے محاسن نمو حاصل کریں اور معائب چھٹ جائیں- ھر دور پچھلے دور کی صلاحیتوں کا مظہر ھوتا ھے اور ھر نسل اپنے سے پہلی نسل کے حسن کارکردگی کی آئینہ دار - اس لئے موجودہ نسل کی ذھنی تربیت ایسے طریق پر ھونا لازمی ھے کہ مستقبل کا دور ان کی اعلیٰ صلاحیتوں ' ذھن رسا اور بلند کردار سے ابھرے -

ارباب ھوش کو اپنی دقت رسی ' پیش بینی اور ژرف نگاھی سے آئندہ دور کی کیفیات اور مقتضیات بھانپ لینا چاھئے -

مستقبل کے مواج سمندر پر حال کا جو وقتی سکون چھایا ھؤا ھے وہ اپنی تہ میں طوفان و تلاطم کا بہت سا مواد لئے ھوئے ھے - اس میں شدید

نظریاتی تفاوت کی لہریں اٹھینگی - اس میں سائنس کی تباہ کار آندھیاں آفت ڈھائینگی - اس کی بین الاقوامی فضائیں مہلک ارضی قومیت کی مفاد پرستی سے مکدر ہونگی اور اس ہمہ گیر بحران میں ہماری نئی پود کو ایک آزاد ملت کی آزاد قلمرو کو اعلیٰ معیار پر چلانے کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ہوگا - اور نظریاتی جہد للبقاء میں اپنا جھنڈا عزم و استقامت کے ساتھ بلند کرنا ہوگا - ان فرائض کی ادائیگی کے لئے اگر اب تعلیمی ماحول پیدا نہ کیا گیا جس سے قوم کی ذہنی - اخلاقی - ادراکی صلاحیتیں پوری طرح اجاگر ہوں - تفکر - تدبر - ایجاد و اجتہاد - تجزیہ و تشخص کی قوتیں بروئے کار آئیں تو انکا اور انکے ساتھ ملک و ملت کا مستقبل تاریک ہو جائیگا -

یونیورسٹی اور اس سے ملحق تمام کالجوں کے لئے لمحۂ فکریہ ہے اور بالخصوص اور ئینٹل کالج کے لئے جسے اپنی کشتی جان کو بھی سنبھالا دینا ہے - یہ دانش گاہ جس نظریہ کی تخلیق ہے وہ زندہ جاوید ہے اور تاریخی انقلاب کی بدولت اسکے لئے ایسا سازگار ماحول پیدا ہوا ہے کہ اسکو بآسانی جامۂ عمل پہنانے کا پورا ساز و سامان مہیا ہے۔ بشرطیکہ نیتیں ڈانواڈول نہ ہوں - آج سیاسی اقتدار اور اس مرکز علم و حکمت کے نظریے میں کوئی تفاوت اور ٹکراؤ نہیں اور یہی نکتہ ہماری امیدوں کی تکمیل کی آماجگاہ ہے -

یہ واحد درسگاہ ہے جسکے سوتوں سے احیائے علوم اسلامی اور مشرقیات کے چشمے رواں ہو سکتے ہیں - یہاں سے وہ مستشرقین برآمد کئے جا سکتے ہیں جو اپنے علوم کے آثار قدیمہ کو سردھڑ کی بازی لگا کر کھود نکالیں - یہاں وہ ملی کردار بن سکتے ہیں جو قیادت صالحہ کے اہل ہوں - مگر

؎ مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

یہی اعلیٰ مقاصد اسکے لئے برق خرمن بن گئے - نظریاتی تفریق کے دانا دشمن اور مغربیت کی تجلیوں سے چکا چوند نادان دوست اسکے قلع قمع کے درپے ہوئے لیکن سخت جان ہے مقابلے میں ہر دفعہ بچ نکلی گو زخموں سے چور رہی - اور ابتک چور ہے -

۱۹۳۲-۳۳ میں جو یونیورسٹی کمیشن مقرر ہوا اس میں مذہبی اختلاف کی بنا پر ایک طبقے نے اسے مٹانے کے لئے سارا زور لگایا - لیکن کمیشن کے

بعض دقیقہ رس ارکان نے اپنی سعی بلیغ سے اسے فرقہ وارانہ ریشہ دوانیوں کی موت سے بچا لیا۔

پھر دور آزادی میں (جسے سراب آزادی کہنا حقیقت کے زیادہ قریب ہوگا) ۱۹۵۲ کے یونیورسٹی تحقیقاتی کمیشن نے ایکدفعہ پھر تخریبی کوششوں کو ناکام بنا کر اسے بقائے دوام بخشنے اور ملی تقاضوں کا اهل بنانے کی سفارشات کیں مگر بے عمل قوم کی ایسی قسمت کہاں کہ اپنے سیاسی اقتدار میں بھی وہ کچھ بن جائے۔ چنانچہ سفارشات کے ان حسین تخیلوں اور منصوبہ بندیوں کو بھی ذاتیات کا تلاطم لے ڈوبا۔ اور اسوقت اورئینٹل کالج یونیورسٹی کے دیگر شعبہ جات کی طرح اردو۔ فارسی اور عربی امتحانوں کی تیاری کے مرکز سے زیادہ کچھ اهمیت نہیں رکھتا اور وہ بھی صرف ایم۔ اے کی جماعتوں کے لئے۔ اردو۔ فارسی۔ عربی فضلاء کی ڈپلوما جماعتیں یہاں سے ختم کر دی گئی ھیں۔ یہ کم خرچ تعلیم عام کرنے کا ایک مفید سلسلہ تھا اور وہ لوگ جو تمامتر انگریزی تعلیم کے لئے وقت اور مصارف نہ رکھتے تھے اس ذریعے سے دین اور مشرقی علوم کی کچھ واقفیت حاصل کر لیتے تھے اور کسب معاش کا تھوڑا بہت سامان ھو جاتا تھا۔ یہ درست ھے کہ خود آموزی سے یہ امتحان اب بھی پاس کئے جا سکتے ھیں لیکن حکومت یا یونیورسٹی کیطرف سے ان امتحانات کے لئے درس و تدریس کا کوئی معیاری ادارہ نہیں جہاں سے طلباء فیض حاصل کر سکیں۔ اگر بحی طور پر خود پبلک ایسے مراکز قائم کرے تو ان کے سامنے کونسا معیاری نمونہ ھے جسکی وہ پیروی کریں۔ اور حکومت کس بنا پر انکو مالی امداد دیگی اور انکی کارکردگی کو زیر تنقید لائیگی۔ پھر اگر حکومت سرپرستی سے هاتھ اٹھا لیتی ھے نہ کوئی مالی امداد دیتی ھے اور نہ ان کی نگرانی کرتی ھے تو وہ تعلیمی ادارے کب تک جئیں گے یا معیار قائم رکھ سکیں گے۔ ماحصل یہ کہ اگر اس سلسلۂ تعلیم کے لئے حکومت اور یونیورسٹی نہ کوئی درسگاہ رکھنا چاهتی ھے اور نہ پرائیویٹ اداروں کی نگرانی کرتی ھے تو ان امتحانات کا رکھنا کلیتاً بے سود اور اخلاقی اور علمی انحطاط کا پیش خیمہ ھے۔ اس اقدام سے خواتین کو جو تعلیم میں ابھی بہت پیچھے ھیں بیحد نقصان پہنچا ھے حالانکہ

ضرورت اس امر کی تھی کہ خواتین کے لئے ایک علیحدہ اورئینٹل کالج قائم کیا جانا لیکن یہاں تو جو تھوڑا بہت میسر آیا تھا اس سے بھی انہیں محروم کر دیا گیا - فی الجملہ اورئینٹل کالج جو یہاں تعلیم کا اولین کعبہ بنا اب کس مپرسی کے عالم میں زندگی کے دن گن رہا ہے - نہ یہاں دارالتراجم ہیں - نہ اکیڈیمیاں - نہ ریسرچ کے شعبے-نہ اس میں علوم و السنۂ شرقیہ کی کوئی شایان شان لائبریری ہے جس سے مستشرقین عالم استفادہ کر سکیں - یہ کالج اور جن جن مشکلات سے دو چار ہے - اس کا صحیح حال پرنسپل صاحب ہی بتا سکیں گے میں ان کے بارے میں کوئی براہ راست معلومات پیش نہیں کر سکتی -

السنۂ مغربی جنکی تعلیم و تدریس مقصود بالذات نہیں بلکہ تقابل - تطابق اور تراجم کی غرض سے ہے وہ بھی اس درسگاہ سے کنارہ کش ہو چکی ہیں -

اسطرح شعبۂ اسلامیات جو علوم مشرق کا منبع و معاون ہے - جسکی روح ان علوم کی رگ و پے میں جاری و ساری ہونا چاہئیے وہ بھی اسکی حدود سے پرے ایک علحدہ کمرے میں محصور ہے -

تعلیم اسلام اور روح اسلام علوم مشرق کی جان ہیں - ان کی مثال جان و تن کی سی ہے - اسلامیات کا موجودہ طریق تعلیم اسلام کو فرنگیت کے قریب لانے کے مترادف ہے کیونکہ بغیر عملی ماحول پیدا کئے یہ محض کاغذی سند حاصل کرنے کے لئے واقعات کا حافظہ میں جمع کر لینا ہے لہٰذا اسلامیات کو لائحہ عمل کی صورت دینی چاہئیے تاکہ تعلیم تدریس اور کاروبار پر اسکا اثر پڑے اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کا روح رواں ہو - اسلام اور اسلامیات کا جلی عنوان الحکم للہ - الملک للہ ہے اور اگر صبغۃاللہ کو محو کرکے اس میں مختلف النوع دلکش رنگ بھردئے گئے تو یہ فرنگیت ہوگی اسلام کے بہروپ میں-

ہمارے ذی عزت و احتشام اسلاف نے دنیا کے علوم سمیٹے - قوم اور ملک بھی زیر دست کئے مگر زاویۂ نگاہ اور نظریات کی مومنانہ جھلک سے قلوب اور علوم دونو کو گرما کر ضیائے اسلام سے منور کر دیا اور ہم نے یہ معرکہ کیا کہ جو کچھ دستبرد زمانہ سے بچ رہا اور جو کچھ ہمارے

بدترین معاند بھی مٹانے کی تاب نہ لا سکے ہم اپنے ہاتھوں مغربیت کی مہلک شعاعوں سے مسخ کرنے لگے - تاکہ وہ متاع قلیل بھی اپنی بیخ و بن میں ہمارے ولی نعمتوں کی رنگ آمیزیاں قبول کرے - یہ ہے فرق ہمارے اور ہمارے اسلاف کے کار ناموں کا -

حکیم الامت اقبال مرحوم نے انکا بجا موازنہ کیا جب کہا -

ہر مسلماں رگ باطل کے لئے نشتر تھا
اسکے آئینہ ہستی میں عمل جوہر تھا
جو بھروسا تھا اسے قوت بازو پر تھا
ہے تمہیں موت کا ڈر اسکو خدا کا ڈر تھا
وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر
اور ہم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

اب حرف آخر درسگاہ کی عمارت سے متعلق ہے - منطقی سلسلے میں اورئینٹل کالج کو مسکن بھی ایسا ہی مقسوم ہوا ہے کہ یہ کلبۂ حزیں نظروں سے او جھل رہے اور ان پسماندہ علوم کی دور رس شعاعیں محلاتی برق قمقموں سے ٹکرا نہ جائیں تعلیم میں حسن و لطافت کی چاشنی ذوق سلیم کو نشو و نما بخشتی ہے اور ایک اعلیٰ علمی دانش گاہ کے لئے جو ملی - روایات و نظریات کو بھی پروان چڑھانے کی ذمے دار ہو - وسیع عمارت جو اتنی وذج فن تعمیر بھی ہو لازم و ملزوم ہے زندگی کے وہ سال جو تعلیم و تعلم میں صرف ہوتے ہیں - ایک نازک تاثر پذیر زمانہ ہے اور اسکے لئے ایسے ماحول کی تخلیق درکار ہے جو ثقافتی اور تاریخی روایات کا آئنہ دار ہو -

یہ امر کسی وضاحت کا محتاج نہیں کہ پر شوکت تعمیر طلبگاران علم و حکمت کے قلوب و اذہان کو خاص طور پر متاثر کرتی ہے - باغ و راغ - چمن زار اور خیابان کتابوں سے تھکی ہوئی نگاہوں کے لئے طراوت کا سامان مہیا کرتے ہیں - پھر کیوں ایک تاریخی یونیورسٹی کا ہمہ گیر علمی مرکز ایسا منظر نہ پیش کرے جس میں غریب سے غریب متلاشی حکمت کو اپنے مقصد میں انہاک کے ساتھ آرام و سکون بھی حاصل ہو - اور خود اساتذہ ایسی فضا میں مصروف کار ہوں کہ قدرت انکی ہمدرد و رفیق ہو اور

ھاتھ بٹا کر ان کا بوجھ ھلکا کرے۔

اس ضمن میں بے جانہ ھوگا اگر یہ مطالبہ کیا جائے کہ ایک وسیع عمارت اورئینٹل کالج کو ملنی چاھیئے ۔ تاکہ خواتین کے لئے بھی ایک وسیع مرکز قائم ھوجائے۔ کالج کے اندر ایک معقول علمی لائبریری قائم ھو اور محققین کو وہ سب سہولتیں میسر ھوں جو مہذب ملکوں میں اھل علم کو حاصل ھیں۔

یہ عین خوش بختی ھے کہ یہ مطالبہ اور ضروریات اس مقتدر ھستی کی موجودگی میں واضح کی جا رھی ھیں جسکے ھاتھ میں یہ حیثیت چیف منسٹر ایک وسیع و عریض صوبے کی قیادت ھے ۔ برادر مقتدر سردار قوم سردار عبدالرشید خانصاحب بالقابہ اسلام کے سپاھی ھیں ۔ تاریخ اسلام میں شمشیرزن جنگ آوروں نے ھی کتاب و قلم کی بھی حفاظت کی ھے۔ سلطان محمود غزنہ نے جہاں ملکی فتوحات کیں وھاں علم و حکمت کے دریا بھی بہائے اور علماء حکما اور ماھرین فنون کی فیاضانہ سرپرستی کی ۔ امید ھے کہ ھمارے مشفق و محترم چیف منسٹر صاحب اپنے دور حکومت میں علوم مشرق و اسلامی کو اپنی توجہ کا مرکز بنائیں گے اور اورئینٹل کالج کو اپنے مربیانہ سایۂ عاطفت میں لیکر ایک دائمی یاد گار چھوڑینگے ۔

پنجاب یونیورسٹی کے ارباب بست و کشاد کی توجہ بھی میں ان حقائق کی طرف مبذول کرونگی کہ وہ اس درسگاہ کی ہر وقت خبر لیں اور اس کی ضروریات پر ھمدردانہ غور کریں ۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا باعث تصدیعہ ھوگا کیونکہ وہ اس موضوع کی گہرائی سے بخوبی آگاہ ھیں ۔ یونیورسٹی کے خطاب میں میرا مفہوم شاید ایک شاعر کے الفاظ میں زیادہ با اثر ثابت ھو۔

به تو از تو راز گویم به زبان بے زبانی

به تو از تو راه جویم به نشان بے نشانی

ز تو دیده کے بدوزم که توئی چراغ دیده

ز تو کے کناره گیرم که تو درمیان جانی

اب میں شرمندہ احسان و کرم آپ سے رخصت ھوتی ھوں ۔ اور اگر میری معروضات کو محترم چیف منسٹر صاحب اور یونیورسٹی کے ارباب خرد نے کچھ بھی قابل اعتنا سمجھا تو مجھے اطمینان ھوگا کہ میں نے اس نکتہ فہم علم پرور اجتماع کا قیمتی وقت ضائع نہیں کیا ۔ والسلام !

از عبدالرحمن چغتائی

داستان امیر حمزہ کی تصویریں

ابتدا سے انسان کا تعلق داستانوں سے فطری طور پر رہا ہے۔ کائنات میں داستانوں کے اوراق کچھ اس بے ترتیبی سے ادھر ادھر بکھڑے پڑے ہیں کہ اگر انکو یکجا کرنے کی کوشش کی جائے تو ایک بہت بڑی مشکل بن جائے۔ الف لیلیٰ۔ شاہ نامہ۔خمسہ نظامی۔ یوسف زلیخا۔ انوار سہیلی۔ مہابھارت۔ رامائن۔ ہیر رانجھا۔ سوھنی مہینوال۔ سسی پنوں۔ یہانتک کہ طوطا مینا ہماری زندگی کا ایک رنگین ورق ہیں اور ہم اس ترقی یافتہ دور میں رہتے ہوئے بھی ان سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ داستانیں خیال پر مبنی ہوں یا حقیقت پر تمام اقوام کے ادب میں پائی جاتی ہیں۔ ہر عہد اور ہر مذہب کی الہامی کتابوں میں بھی ان کا وجود موجود ہے۔ حتیٰ کہ زبور توریت اور خود قرآن کریم میں ان داستانوں کی روشنی میں اقوام کے پیچیدہ مسائل کو سلجھایا گیا ہے۔ داستانوں ہی کے ذریعئے ہم تک بعض ایسے اخلاق۔ معاشی۔ اور جمالیاتی مسائل پہنچے ہیں جن سے زندگی کے تقاضے پورے ہوتے ہیں اور حیات انسانی کا تسلسل قائم ہے۔

جہانتک ہماری مصوری اور افسانوی ادب کا تعلق ہے اس میں سب سے اول شاہ نامہ فردوسی کو تصویر دار کیا گیا ہے۔ جب مصوروں نے شاہ نامہ فردوسی کو تصویردار کیا تو نئی نئی شاہ راہیں نمودار ہوئیں اور ایسے امکانات پیدا ہوئے جن کا وہم و گمان تک بھی نہ تھا۔ ایران اور ہندوستان میں شاہ نامہ ہر عہد میں ہر والئے ملک کا محبوب مشغلہ رہا ہے جو خلوت اور جلوت میں برابر سنا اور پڑھا جاتا تھا۔ شاہ نامہ کے بعد جن داستانوں اور شعرا کے کلام کو مقبولیت حاصل ہوئی ان میں خمسہ نظامی۔ گلستان سعدی۔ دیوان حافظ۔

یوسف زلیخا جامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مصور شاہ ناموں کی تعداد بلا مبالغہ ہزاروں تک پہنچتی ہے ان میں بہترین بھی ہیں اور کم ترین بھی۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو انفرادی طور پر فنی خوبیوں کے باعث اپنے دور کی ایک جامع تاریخ ہیں۔ طرز نگارش ۔ فنی انہماک ۔ قومی افتخار۔ کرداروں کی کشمکش کیا ہے جو شاہ نامہ میں موجود نہیں۔ طرز معاشرت ۔ آداب مجلس ۔ درباری شان و شکوہ ۔ مافوق الفطرت قوت ۔ آزادی اور غلامی کے مظاہرے ۔ میدان کارزار کے نقشے ۔ اسلحہ جات ۔ جذبات کے تیور۔ اخوت ۔ نفرت ۔ محبت ۔ عداوت ۔ احتجاج اور فریاد سب کچھ شاہنامہ کی تصویروں کا طرۂ امتیاز ہیں ۔

ایران میں مسلمانوں کی آمد سے پیشتر مصوری کس صورت میں اور کس طرز کی تھی بہت طویل بات ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ جب چنگیز خان اور اس کے پوتے قوبیلائی خان کی فتوحات کے ذریعے ایشیا میں مشرق و مغرب میں براہ راست تعلق پیدا ہوا ہے تو مصوری اس زمانے کی تہذیب پر اثر انداز ہو چکی تھی۔ جامع التواریخ مصور۔ مصنفہ رشیدالدین فضل اللہ کے بیان سے ظاہر ہے کہ سلاطین سلاجقہ ۔ غزنہ ۔ فارس اور ایلخانی دور میں مصوری کسی نہ کسی صورت موجود ضرور تھی۔ مورخین اور محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اسلام نے عرب سے باہر قدم رکھتے ہی فنون لطیفہ میں کارہائے نمایاں انجام دینے شروع کر دئے تھے جن کی حیثیت فن برائے فن تھی نہ کہ فن برائے مذہب ۔ مشہور محقق ڈاکٹر مارٹن کا بیان ہے مسلمان اور چینی مصوری کا اتحاد اس دور ہی سے شروع ہو گیا تھا اور ہم دیکھتے ہیں کہ یہ اتحاد فتح بغداد تک حاوی رہا ہے جب تک منگول پوری طرح خلافت پر چھا نہیں گئے۔ مشہور چنگیز نامہ جو چودھویں صدی میں تکمیل پایا ہے اس کی تصاویر اس بات کی شاہد ہیں کہ چینی مصوری ایرانی مصوری پر کس وقت تک اثر انداز رہی ہے۔ جو شاہ نامے سمرقند اور بخارا میں مصور ہوئے ہیں ان سے پایا جاتا ہے کہ یہ چینی اثر جلد ہی زائل ہو گیا ہے اور ایک نئے دبستان مصوری نے جنم لیا ہے جس کو آج ہم ایرانی دبستان مصوری کے نام سے یاد کرتے ہیں اور جس کی بنیاد پندرھویں صدی کے اوائل میں سمرقند میں تیمور نے رکھی تھی اور اس کے قابل ترین جانشینوں نے اپنے اپنے دور میں اسے اور بھی پروان چڑھایا تھا۔ اگرچہ

دبستان سمرقند کی ابتدائی تصاویر موجود نہیں رہ سکیں لیکن جو کچھ بھی بچ رہا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں کسقدر پختگی اور کمال موجود ہے اور فن کسقدر مدارج طے کر گیا تھا۔

تیمور۔ شاہرخ۔ مرزا بایسنقر اور الغ بیگ کے بعد سلطنت مختلف ہاتھوں سے ہوتی ہوئی خاندان تیمور کے قابل ترین اور لائق فرزند ابوالغازی سلطان حسین میرزا بن منصور بن بایقرہ کے ہاتھ آئی۔ سلطان حسین ابتدا میں الغ بیگ کے سائہ عاطفت سے منسلک تھا اس کے بیٹے عبداللطیف کی موت کے بعد ابوسعید بن سلطان محمد بن میرانشاہ نے اس کو قید کر لیا لیکن یہ وہاں سے بھاگ کر ابوالقاسم بابر مرزا سے ملکر ۸۶۲ ہجری مطابق ۱۴۵۷ء میں گرگان کے پایہ تخت استرآباد پر قابض ہو گیا جہاں سے ابوسعید نے اس کو ایک سال بعد پھر خوارزم بھاگ جانے پر مجبور کیا اور خود استرآباد پر قابض ہو گیا۔ سلطان حسین نے گرگان او مارندران اور استرآباد کو دوبارہ فتح کر کے ابوسعید کی موت کے بعد ہرات کو تسخیر کر لیا اور وہاں ۱۰ رمضان المبارک ۸۷۲ھ مطابق ۱۴۶۸ء اپریل کو باقائدہ تاج پوشی کرکے دربار منعقد کیا اور ابوالغازی سلطان حسین میرزا کے لقب سے ملقب ہوا۔ سلطان حسین میرزا ۳۸ سال تک خراسان پر حکومت کرتا رہا جہاں ستر سال کی عمر میں ۱۱ ذی الحج ۹۱۱-۹۱۲ ہجری مطابق ۱۵۰۶ء بروز دو شنبہ کو اس جہان فانی سے عالم جاودانی کو سدھارا۔ اس کا قابل ترین وزیر علی شیرنوائی متوفی ۹۰۶ ہجری مطابق ۱۵۰۱ء ۶۲ سال کی عمر میں فوت ہوا اور مسجد جامع ہرات کے قریب ایک گنبد جسے اس نے خود اسی مقصد کی خاطر تیار کروایا تھا دفن ہوا۔ میر علی شیرنوائی اپنے آقا کی طرح علما فضلا کا مربی اور قدردان تھا خود بھی نظم و نثر دونوں میں اعلیٰ پایا رکھتا تھا۔ دربار ہرات آقا اور وزیر با تدبیر کی ہنرپروری اور قدر شناسی کے سبب ان سینکڑوں درخشندہ ستاروں سے منور تھا جو ایران کی سر زمیں سے ابھرے تھے۔ اس دربار میں بہزاد۔ آقا میرک۔ سلطان محمد۔ قاسم علی سلطان علی مشہدی۔ مولانا جعفر۔ مولانا شمس۔ سلطان محمد خندان۔ سلطان محمد نور۔ مولانا یاری۔ علی الکاتب۔ استاد قل محمد نقاش وغیرہ جیسے نادرہ کار مصور اور سحر نگار خطاط کارہائے نمایاں انجام دے رہے تھے۔ نقاشی۔ تصویر کشی۔ تعمیر سازی۔ کاشی کری۔

مینا کاری ۔ کتابہ سازی ۔ خوش نویسی ۔ قالین سازی ۔ موسیقی ۔ صحافی ۔ اور تذهیب جیسے فنون لطیفہ جن کا تعلق مرقع سازی اور تعمیرات وغیرہ سے ہے اسی عہد زریں سے تعلق رکھتے ہیں۔

سلطان حسین کے بعد اس کی اولاد نااتفاقی ۔ کم ہمتی اور بے تدبیری کے سبب ملک اور حکومت پر قابو نہ رکھ سکی چنانچہ محمد خان شیبانی ازبک نے خراسان پر حملہ کر کے سلطان حسین کی اولاد سے تمام ملک چھین لیا ۔ بدیع‌الزمان سلطان حسین کے فرزند اور وارث کو بھاگ کر سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ کے پاس پناہ لینی پڑی ۔ محمد شیبانی ازبک کا دور حکومت گو مختصر زمانہ ہے لیکن اس مختصر دور میں بھی مصوری اور خطاطی میں کچھ نہ کچھ ضرور قابل قدر انجام دیا گیا ہے ۔ یہ دودمان چنگیز کا آخری جنگ آزما باوجود بربریت خونریزی اور دہشت زدگی کے ہنر پروری اور ہنر شناسی میں تیموریوں سے کسی صورت کم نہ تھا کیونکہ دربار ہرات اور سلطان حسین کے بعد بہزاد ۔ اور آقا میرک جیسے بے مثال مصور اور سلطان علی مشہدی جیسے سحر نگار خوشنویس اور خواندمیر جیسے عالم و فاضل اسی دربار سے منسلک رہے ہیں ۔ سام مرزا نے اس کے متعلق لکھا ہے۔

"باوجود ترکیت و جلفیت خود را در اکثر فنون و استعدرات منہدس دانستہ در تصویر استاد بہزاد و نقاش کہ تا مصور قدرت صورت انسانی را بر تختہ ہستی چہرہ کشائی نمودہ چوں او مصور چابک دست نکشیدہ ۔ در خط مولانا سلطان علی مشہدی کہ کلک کرام‌الکاتبین مثل او خوشنویس بر صفحہ وجود ننگاشتہ ۔ دخل بجا کردہ صورت او را بقلم اصلاح نمودی و خط این را بنوک قلم مورقم نسخ کشیدی و گفتی کہ چنین می باید کشید ۔ و چنیں می باید نوشت و در زمان خود حکم کردہ بود کہ شعرا شہنامہ فردوسی را ترکی کنند"

جب شاہ اسمعیل کے بڑھتے ہوئے اقبال نے شیبانی خاں کی حکومت کا خاتمہ ہمیشہ کیلئے کر دیا ہے تو دربار صفوی کی طفیل ایرانی مصوری کا دوبارہ ارتقا ہوا ہے ۔ پھر بہزاد ۔ میرک اور سلطان علی مشہدی جیسے با کمال

خطاط اور مصوروں کو اپنی ہنرمندی اور کاریگری دکھلانے کا موقع ہاتھ آیا ہے بہزاد کو پھر سرآمدان ہنر اور مہتمم تصویر خانہ مقرر کیا گیا ہے اور سلطان علی مشہدی کو پھر شاہنامہ اور خمسہ نظامی کے ذریعے اپنے جوہر بکھیرنا نصیب ہوا ہے ۔ شاہ اسمعیل صفوی کی وفات کے بعد اس کے فرزند شاہ طہماسب اول کے دور میں صفویوں کی فیاضی اور ہنر پروری سے ہم ایرانی مصوری اور خطاطی کے اس اوج اور کمال سے اپنے آپ کو دوچار پاتے ہیں جو اس کے بعد ایرانی مصوری اور خطاطی ۔ نقاشی ۔ قالین سازی اور دیگر فنون لطیفہ کو دیکھنا نصیب نہیں ہوا ۔ بقول سکندر منشی مصنف عالم آرائی عباسی اس کا سب سے بڑا سبب شاہ طہماسپ کی ہنر پروری اور ہنر شناسی تھا کیونکہ شاہ طہماسپ خود نقاش نادرہ کار اور مصور نازک قلم اور خطاط سحر نگار تھا ۔ یہ فن اس نے بہزاد ۔ میرک ۔ سلطان محمد اور سلطان علی مشہدی جیسے فن کاروں سے سیکھے تھے ۔ اس کے عہد میں سیکڑوں مجلہ و مرصع مرقع جات تیار ہوئے جو آج بھی محققین اور نقادان فن کو اپنی دلکشی خوبصورتی اور ندرت کے باعث حیرت افزا بنائے ہوئے ہیں ۔ صفویوں کے بعد دربار کی سرپرستی کسی حد تک قریب قریب ختم ہو چکی تھی تاہم پھر بھی مصور اور خطاط شاعر اور مصنف انفرادی طور پر برسرپیکار نظر آتے ہیں اور ایرانی مصوری اور خطاطی کے بہترین نادرالمثال مرقع جات ظہور پذیر ہوئے ہیں ۔

شاہ اسمعیل صفوی کے عہد میں آل تیمور کے ایک اور ہونہار فرزند ۔ شاعر اور نقاد ۔ سپہ سالار اور سلطان ۔ ظہیرالدین بابر نے ہندوستان میں ایک نئی اور شاندار تیموری سلطنت کی بنیاد رکھی وہ کابل ۔ قندھار ۔ اور بدخشان پر قابو پا لینے کے بعد سلطان ابراہیم لودھی پر فتح حاصل کرکے آگرہ ۔ دھلی ۔ اور دریائے سندھ سے بنگال تک کا تمام علاقہ اپنے تصرف میں لے آیا ۔ کثیرالتعداد ممتاز ایرانی شعرا ۔ عالم اور ادیبوں کی موجودگی کے باعث اس کا دربار نہایت پر شکوہ تھا ۔ یہاں علم و ہنر کی قدر اور سرپرستی ایران سے زیادہ فیاضانہ اور مربیانہ طور پر ہوئی ۔ اگرچہ بابر کا مختصر دور حکومت زیادہ تر جنگ آزمائی اور فتوحات حاصل کرنے میں گذرا ہے لیکن اپنی خاندانی روایات

اور فطری ذهانت کی رو سے اس نے اس کشمکش میں بھی فنون لطیفه کو نظر انداز نہیں کیا ۔ وہ دوران جنگ اور فتوحات کے دور میں بھی باغات لگانے اور انکی طرح بندی کرنے میں مصروف نظر آتا ہے۔ قلعے اور محلات تعمیر کرنے میں منہدس اور معماروں کو هدایات دے رہا ہے ۔ شاعروں اور مغنیوں کے جھرمٹ میں بیٹھا چشموں کے کنارے داد عیش دیتے اور مجالس قائم کرنے میں همه تن پیش پیش ہے ۔ سلطان حسین مرزا ۔ اور صفویوں کے عہد کی مانند هندوستان میں گو بابر کے دور میں مصوری کے ضمن میں کوئی مستقل کارنامه انجام نہیں دیا گیا تاهم انفرادی طور پر کچھ نه کچھ ضرور انجام دیا گیا ہے ۔ ۱۵۳۰ء میں بابر کی وفات کے بعد ھمایوں سریر آرائے سلطنت ہوا ہے ۔ واقع نویسوں نے اس کو اس رنگ میں پیش کیا ہے که اس کے عہد میں کوئی علمی ادبی کام انجام نہیں دیا گیا ۔ وہ ایک کامیاب حکمران نہیں تھا وہ طبیعت کا کمزور اور غیر مستقل مزاج واقع ہوا تھا ۔ بر عکس اس کے ھمایوں شجاعت اور مردانگی میں اپنے باپ بابر سے کسی صورت کم نه تھا اس نے بابر کی حیات هی میں بدخشان کو دشمنوں سے پاک کر دیا تھا ۔ قلعه کالنجر کی تسخیر میں غیر معمولی بہادری اور ذهانت کا ثبوت دیا تھا ۔ مجبوری یه آن پڑی تھی که وراثت میں جو سلطنت ملی تھی اسے حاصل کئے به مشکل پانچ چھ برس هی گذرے تھے که بھائیوں کی ریشه دوانی اور شیر شاہ کی اندرونی شورش کا سیلاب ایسا امنڈا که سلطنت محفوظ نه رہ سکی اور ھمایوں کو مجبوراً شاہ طہماسپ اول کے پاس ایران میں پناہ اختیار کرنی پڑی ۔ لیکن دوبارہ ۹۵٦ هجری مطابق ۱۵۴۹ء جب مختصر فوج لیکر هندوستان پر چڑھائی کی ہے تو فتوحات کا تانتا باندھ دیا ہے اور کھوئی ہوئی سلطنت کو پورے طور پر اپنے قبضے میں لا کر چھوڑا ہے ۔ ھمایوں میں جوهر ذاتی کسی اور فرماں روا سے کم نه تھے ۔ استحکام سلطنت ۔ علم و فضل ۔ اور ایجاد و اختراع میں یکتائے روزگار تھا ۔ خود شاعر تھا طبیعت نہایت موزوں اور شسته پائی تھی اس کے ذوق علمی کا ثبوت ہے که اس نے اپنے باپ کی سرگذشت کا خود ترجمه کیا اور اس میں جگه جگه مناسب حواشی کا اضافه کیا۔ علوم و فنون کی سرپرستی و قدردانی کی وجه سے اور نامی گرامی شعرا ۔ مصور۔ خطاط اور علما اور فضلا کی موجودگی کے باعث

ں کے دربار کو سلطان حسین مرزا اور شاہ طہماسپ صفوی کے عہد سے کسی صورت
م نہیں کہا جا سکتا ۔ مولانا نظام‌الدین مصنف طبقات اکبری نے ھایوں کی
بت شاندار الفاظ میں اظہار کیا ہے اور ھایوں کی جملہ صفات و کمالات کو
راھا ہے اس کے علاوہ ابوالفضل نے بھی ھایوں کے جوھر ذاتی سے متلق
ایت خوبصورت الفاظ میں اور اپنے مخصوص انداز میں ذکر کیا ہے ۔

شاہ اسمعیل کے بیٹے سام مرزا متوفی ۹۸۴ ھجری نے اپنی تالیف تحفہ سامی
ں ھایوں کی نسبت لکھا ہے ۔

"ھایوں بادشاہ بن بابر بادشاہ ۔ پادشاہے است کہ بکثرت حشم و ھنر
پروری از اساطین سلاطین آفاق منفرد بود ۔ و وفور سخاوت و
فطرط معدلت و داد گستری از عظائی خواقین منفرد ۔ و در فن حکمت
خصوصاً قسم ریاضی ثالث افلاطون و اقلینوس ۔ و در کثرت خیل و
حشم ثانی اثنیس سکندر بن فیلقوس ۔ و در نظم اشعار خسرو ارباب نظم
و در حسن‌المقال سر دفتر اصحاب فہم و در دائیرہ خطش خطی کامل و در
توقیعات انشائش رسائیل ۔ ھایوں خط او توقیع خوبی راست طغرائی
کہ نہ نوشت است منشی قصا ھر گز مثال او این مطلع زادہ طبع
ایشان است ؎

آن نہ سرو است کہ در باغ قد افراختہ است
شمع سبزیست کہ پروانہ او فاختہ است

ب سخت کش مکش اور کوشش کے بعد ھندوستان کم و بیش محکم طور پر
ھایوں کے قبضے میں آ گیا ہے تو جملہ علوم و فنون کی طرف پورے انہماک سے
وجہ دی گئی ہے ان میں نئے سر سے زندگی کی لہر دوڑ گئی ہے ۔ مغل
بستاں مصوری نے جنم لیا ہے اور باقاعدہ ایک مستقل حیثیت اختیار کر لی ہے ۔
یران میں ھایوں کو شاہ طہماسپ کی فیاضانہ مہمان نوازی کی طفیل تمام فنون
طیفہ سے لطف اندوز ہونے اور براہ راست مصوروں اور خطاطوں کے کمال سے
حظوظ ہونے کا موقع ملا تھا ۔ ھمایوں کے دور میں ان ایرانی مصوروں نے

آزادانہ طور پر کارہائے نمایاں انجام دئے ھیں جو ایران سے آکر ہمایوں کے دربار سے منسلک ہوئے تھے جو سرآمدان ہنر ہندوستان تشریف لائے ان میں سید میر علی تبریزی کا نام سر فہرست درج ہے۔

مصنف نفائس الماثر کے بیان کے مطابق سید میر علی تبریزی ۹۵۶ ھجری مطابق ۱۵۴۹ کابل میں آکر ھمایوں کے دربار میں شامل ھوا جہاں ھمایوں کے حکم سے داستان امیر ھمزہ کو تصویر دار کرنا شروع کیا۔ جب سید میر علی تبریزی نے داستان امیر حمزہ کو تصویر دار کرنا شروع کیا ہے تو اس کے ساتھ تیس اور ایرانی مصور اس کام میں اس کا ھاتھ بٹانے میں شامل تھے۔ جو ایرانی نسل تھے اور ایرانی دستان مصوری کے متبتع تھے۔ ان استادوں نے ہندوستان میں شبیہ کشی اور داستان امیر حمزہ کےکام کے ساتھ ساتھ ایرانی دستور کے مطابق فارسی زبان منظوم و منثور داستانوں اور شعرا کے کلام کو بھی مصور کیا ۔ ابوالفضل نے جن کتابوں کا ذکر آئین میں کیا ہے جو اس زمانے میں مصور ہوئی تھیں ان میں سر فہرست داستان امیر حمزہ کا نام لیا ہے۔ فن کارانہ صلاحیتوں کی رو سے امیر حمزہ کی تصاویر کو مغل دستان مصوری میں برتری اور ایک مقام حاصل ہے ۔ اس میں ھمایوں کی ذھانت اور فراست کو بہت بڑا دخل ہے جس نے ایرانی روایات اور دستور سے الگ شاہ نامہ۔ خمسہ نظامی۔ یوسف زلیخا ۔ اور دیوان حافظ وغیرہ سے ماورا داستان امیر حمزہ کو مصور کرنے کی خاطر انتخاب کیا یہ ھمایوں کی بلند نظری ہنر شناسی اور ہنر پروری ھی کا ثبوت ہے کہ اس نے قلیل مدت میں اپنے دربار میں ہر قسم کے فن کار اور ہر قابلیت کے لوگ جمع کر لئے۔

داستان امیر حمزہ در اصل ایک فرضی اور خیالی داستان ہے جس میں تاریخی اشخاص کے گرد فرضی اور مافوق الفطرت واقعات کی دیوار کھڑی کر دی گئی ہے۔ اس قصے میں حقیقت کو صرف اسقدر تعلق ہے کہ ھمارے حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا نامدار حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی استعمال کیا گیا ہے ۔ بعض کا خیال ہے یہ داستان اکبر کے زمانے میں مہابھارت کے جواب میں فیضی نے لکھی ہے جو بالکل غلط اور بعید از قیاس

ہے۔ یہ قصہ نہ تو ہندوستان کی تالیف ہے اور نہ اکبر کے عہد سے اس کا
کچھ تعلق ہے۔ البتہ الف لیلا۔ قلیلہ و دمنہ۔ لیلا مجنون وغیرہ کی طرح یہ
قدیم تصنیف ہے اور بعض روایات کی رو سے جن میں کسی قسم کی اصلیت
نہیں ہے یہ داستان سلطان محمود غزنوی کیلئے شاہ نامے کے مقابلے مں لکھی
گئی۔ ابتدا میں اس کا نام اسما و حمزہ تھا۔ تاریخ مبارک شاہی اور واقعات
بابری میں اس کو داستان حمزہ کے نام سے منسوب کیا گیا ہے اور ابوالمالی
کو اس کا مصنف بتلایا ہے۔ داستان امیر حمزہ ہر زمانے اور ہر بادشاہ کے عہد
میں مقبول خاص و عام رہی ہے۔ فارسی مخطوطات میں داستان امیر حمزہ مختلف
ناموں سے بھی ملتی ہے۔ اسے جنگ نامہ امیرالمومنین حمزہ کے نام سے بھی
منسوب کیا گیا ہے۔ برٹس میوزم میں ایک قلمی نسخہ موجود ہے جس کا نام
امیر حمزہ ہے اور یہ بارہ دفتروں مں منقسم ہے۔ اور ہر دفتر کو اسماء حمزہ
کا نام دیا ہے اور اس کا مصنف شاہ نصیرالدین محمود کو قرار دیا ہے۔ کچھ
نا مکمل نسخے اور بھی اس داستان کے دیگر کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں
کسی ایک میں اس کے مصنف کا نام ملا جلال بلخی کو بتلایا ہے اور گارسان
وتاسی نے بقول اشک مترجم داستان امیر حمزہ اس کا مصنف ملا جلال بلخی ہی
کو گردانا ہے۔ اردو میں یہ داستان خاصی مقبول رہی ہے کئی لوگوں نے اس کو
فارسی سے اردو مں ترجمہ کیا ہے اور کتاب کئی دفتروں پر مشتمل ہے اور
ہر دفتر میں دو دو تین تین جلدیں ہیں ان کے علاوہ بھی داستان کو کئی
جلدوں میں طول دیا گیا ہے۔ امیر حمزہ کے کارنامے کئی مصنفین نے ایک جلد
میں بھی قلم بند کئے ہیں اور ان کو داستان امیر حمزہ ہی کے نام سے منسوب
کیا ہے جیسا کہ بیان کیا ہے امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کہ اسم گرامی سے
داستان گویوں نے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے تحت کئی حمزہ نامے مرتب کئے
جو کسی نہ کسی ہیرو کی شجاعت اور بہادری سے متعلق ہیں۔ ایک
حمزہ نامہ باطنیوں کے بطل اعظم حمزہ نامی والئے قلعہ شیون کے شجاعانہ
کارناموں پر مشتمل ہے۔ جب آل عثمان نے شام فتح کیا تو حمزہ کے کار ناموں
کی داستانیں عرب راویوں اور قہوہ خانوں کے داستان گویوں کی زبانی ترکوں
میں بھی رواج پا گئی تھیں بعض داستان گو امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے بھائی

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو داستان امیر حمزہ کا مصنف قرار دیتے ہیں جو خود فرضی داستان ہے۔ داستان امیر حمزہ در اصل حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور دیگر تاریخی اشخاص کے نام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فرضی خیالات پر ترتیب دی گئی ہے یہ نہ تو حقیقت پر مبنی ہے اور نہ تقلیدی لیکن داستان کے روپ میں کرداروں کی تشکیل اور تاریخی رجحانات کا رد عمل کہا گیا ہے ادنیٰ و اعلیٰ طبقے کے فکری مسائل اور خارجی حالات جگہ جگہ ملتے ہیں۔ یہ داستان رموز سلطنت۔ بصیرت افروز حقائق اور اخلاقیات کی دولت سے مالا مال ہے۔غلامی۔ آزادی۔ افلاس۔ خوش حالی اور انسانی آرزوں کے مختلف مظہر نمایاں ہیں۔ جنگ و جدل۔ محاذ۔ برتری کا احساس۔ عروج اور انحطاط اور ملک گیری کی ہوس کے علاوہ عشق و محبت کے کرشمے حسن و جمال کے غمزے شاہ نامہ کی مانند اس داستان کے بھی مرہون منت ہیں۔ ان فن کاروں نے جن کا واسطہ اس داستان سے پڑا تھا اپنے رنگوں اور خطوں میں کرداروں کی تشکیل دیکھکر تخلیق پر قابو پانے کیلئے کس طرح ہاتھ پاؤں مارے ہیں ان کے کام سے ظاہر ہے انہوں نے جو کچھ بنانا چاہا ہے پہاڑ تھے یا مرغزار۔ بادل تھے یا شفق۔ باغات تھے یا جنگل۔ پرندے تھے یا درندے۔ شہر تھے یا صحرا۔ نصب شدہ خیمے تھے یا محلات۔ آقا تھے یا غلام ہر چیز انہیں متحرک نظر آتی تھی۔ داستان امیر حمزہ کی تصویروں میں ہر چیز خواہ وہ جاندار کی ہے یا غیر جاندار کی اس میں کردار کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہ طرز نگارش یہ اسلوب فنی نقطہ نگاہ سے مغل اور ایرانی مصوری کا فطری ملاپ ہے جو خیبر کے راستے سے گذر کر اپنی ضیاپاشی کرتا ہوا ہندوستان پر پوری طرح چھا گیا تھا اور فن کاروں نے اس وقت تک دم نہیں لیا جب تک ہندوستان جنت نشان نہیں کہلایا۔واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے دنیا اس تہذیب اور اس کی قدروں کی ابتدا اور اس کے عروج و زوال کو آج بھی فراموش نہیں کر سکی۔

یہ ہماری بد نصیبی ہے کہ ہمارے مورخ گذشتہ واقعات میں سے جنگ و جدل۔ خون ریزی اور بغاوت کے واقعات بیان کرینگے یا شعرا اور ان کے ممدوح کا ذکر کرینگے لیکن کچھ بیان نہ کرینگے تو مصوروں۔ خطاطوں اور دیگر ہنرمندوں سے متعلق۔ سوانح حیات کی رو سے عربی۔ فارسی اور ترکی میں

بے حد کام کیا گیا ہے ۔ مصنفین اور مؤلفین نے ہزاروں سوانحعمریاں حضور پر نور کی اور ان کے اصحاب کی لکھی ہیں ۔ اس کے علاوہ مورخ ۔ سائینس دان ۔ بہادروں اور شاعروں کے حالات میں کئی تذکرے تصنیف ہوئے ہیں لیکن کسی مسلمان مصنف نے مصوروں ۔ خطاطوں اور دیگر ہنرمندوں کے حالات میں ایک بھی مستقل تصنیف نہیں کی ۔ مقریزی متوفی ۱۴۴۲ء نے دعویٰ کیا ہے کہ اس نے مصوری کے حالات میں ایک مبسوط تاریخ لکھی ہے لیکن نہ تو اس کی تاریخ کہیں ملتی ہے اور نہ اس کی تاریخ کے کسی حصہ یا باب کا کسی مصنف نے حوالہ دیا ہے ۔ یہ ضرور ہے کہ مقریزی کی دیگر تصنیفات ضرور پائی جاتی ہیں جو دیگر موضوع پر ہیں ۔ سولھویں صدی کے بعض تذکرہ نویسوں نے ان شعرا کے ذکر میں کہیں کہیں کسی مصور کا ذکر ضرور کیا ہے جو شاعر بھی ہے اور مصور بھی ۔ تحفہ سامی ۔ لطائف نامہ فخری ۔ عالم آرائی عباسی ۔ مطلع السعدین ۔ مرقع بہرام مرزا وغیرہ کے ہاں ضرور مصور اور خطاطوں کا ذکر پڑھنے میں آ جاتا ہے ۔ ان تصنیفات میں بھی فرداً فرداً کسی مصور کا بیان ضرور دیکھنے میں آتا ہے جو کسی سلطان یا وزیر کے حکم سے اس عہد سے متعلق بطور روزنامچہ یا تذکرہ کے لکھی گئی ہیں یا کسی سلطان یا وزیر نے خود نوشت سوانحعمری لکھی ہے ۔ خواند میر مولف حبیب‌السیر ایک ایسا مورخ ہے جس نے مصوروں اور خطاطوں کے حالات قلمبند کرنے میں کچھ خاص توجہ دی ہے اس نے حبیب‌السیر میں اس مضمون پر باقائدہ باب باندھا ہے ۔ خواندمیر ۱۴۷۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۰۳۰ یا ۱۰۳۷ میں ہمایوں کے عہد میں ہندوستان میں فوت ہوا ہے اور یہیں دفن ہوا ۔

خواندمیر کے بعد ابوالفضل نے آئین اکبری کو ترتیب دیا ہے ۔مصوری کے باب میں جو کچھ آئین میں ملتا ہے اس میں ایک تشنگی موجود ہے ۔ حالانکہ اسی تشنگی سے مترشح ہے کہ عہد اکبری میں مصوروں اور خطاطوں ۔ نقاشوں ۔ صحافوں ۔ اور مذھبوں اور دیگر ہنرمندوں کی ایک دنیا آباد تھی ۔ اور ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچی ہوئی تھی ۔ ابوالفضل ہی کے الفاظ میں ۔ "قبلہ عالم کی قدردانی اور ہنرپروری سے اس دلکش جادو نگاری (مصوری)

کو انتہائی ترقی نصیب ہوئی اعلیٰ حضرت کے دست شفقت نے اہل عالم کی چشم بینش کو آگاہی کے سرے سے روشن فرمایا۔ اور تصاویر کی قدر و قمت و طلب میں گرم بازاری ہوئی۔ رنگ امیزی کا فن معراج کمال کو پہنچا اور صفائی و لطافت کو روز افزوں ترقی نصیب ہوئی جس طرح عہد معدلت میں مصوروں کی قدر و قیمت میں صد چند اضافہ ہوا۔ اسی طرح نقاش۔ مذہب و جدول آرائیاں و جلدبند وغیرہ کی بھی گرم بازاری ہوئی۔ ہر چہار گروہ عطاب و انعام و ماہانہ سے سرفراز و شاد کام ہوا۔ بیشمار مذہب دار و احدی رہ سوار اس سرشتے کی خدمت پر مامور ہو کر ممتاز و معزز ہوئے۔ پیادہ کی تنحواہ ایک ہرار دو سو دام سے زیادہ اور چھ سو دام سے کم نہیں،،۔

اس ترقی اور عروج کے باوجود ابوالفضل نے محض چند ہنرمندوں کے نام لئے ہیں اور وہ بھی چند سطور میں۔ اور نو اور سد مر علی تبریزی اور خواجہ عبدالصمد شیرازی شیریں قلم کا بیان آئیں میں حند سطور سے زیادہ نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے مصنف کوئی سنی سنائی بات بیان کر رہا ہے کوئی آنکھوں دیکھی بات بیان نہیں کر رہا۔ حالانکہ مذکورہ بالا استادان فن کو سرآمدان ہنر نادرالملک اور نادرالعصر کہکر یاد کیا ہے۔ آئین میں اسی تصویر خانے کے باب میں امیر حمزہ سے متعلق جو اپنے زمانے کا بہت بڑا کارنامہ ہے محض ڈیڑھ سطر میں ذکر کیا ہے۔ آئین کے الفاظ میں:

''قصہ امیر حمزہ را دوازدہ دفتر ساختہ رنگ امیز کردند و استادان سحر پرداز تک ہزار و چہار صد موضع را حیرت افزائے دیدان وراں گردانیدند،،

حمزہ کی تصاویر ہمایوں بادشاہ کے جمالیاتی ذوق اعلی تربیت اور روایات کا مظہر ہیں ان حالات اور واقعات کا پرتاؤ ہیں۔ جو حود اس کو کشمکش حیات میں پیش آئے تھے اور وہ مجبور ہوا تھا کہ اس ذہنی کوفت اور پریشانی سے روحانی طریق پر سکون حاصل کرے۔

صدیاں گذریں حمزہ کی تصویریں ابھی تک زندہ ہیں اور یقینی طور پر آئندہ بھی زندہ اور پائندہ رہینگی۔ ان پر جو تنقیدی اور تاریخی تہیں چڑھائی

گئی ھیں یا جن نیتوں کا وہ شکار ھوئی ھیں ان کی رو سے یہ کوشش کی گئی ھے کہ ان کے صحیح مقام۔ ان کے فنی انہاک اور طرزنگارش اور اسلوب کا حق ان فن کاروں کو نہ پہنچنے دیا جائے جنہوں نے اپنے خون اور پسینے سے ان کو تخلیق کیا تھا۔ حمزہ کی تصویروں کا اگر تنقیدی اور تاریخی جائزہ لیا جائے تو وہ دو حصوں میں بانٹی جاسکتی ھیں ان کا ایک حصہ وہ ھے جو عہد ھمایوں میں اپنے بادشاہ کی سرپرستی میں اس کی خوشنودی کی خاطر تیار ھوا ، اور ایک وہ حصہ ھے جس نے اکبر اعظم کے تصویر خانہ کو زندگی بخشنے کے سلسلے میں دوبارہ جنم لیا۔ کیونکہ ابوالفضل اور دیگر ھم عصر مورخین نے داستان کی تصاویر پر تفصیل سے روشنی نہیں ڈالی اسلئے وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ ھمایوں کی وفات کےوقت کسقدر کام تکمیل پا چکا تھا اور کسقدر کام عہد اکبری میں تکمیل پایا ھے۔ تفصیل اور مجمل طور پر اگر کسی نے کچھ بیان کیا ھے تو وہ مرزا علاالدولہ قزوینی مصنف نفائس الماثر ھے ۔ قزوینی نے نفائس الماثر کو ۹۷۳ ھجری میں شروع کرکے ۹۷۹ ھجری میں ختم کیا ھے لیکن اس نے بھی اس بات پر روشنی نہیں ڈالی کہ ھمایوں کی وفات تک کسقدر کام پایہ تکمیل تک پہنچ چکا تھا اور کسقدر کام بعد میں ھوا ھے۔ قزوینی ھی کا بیان ظاھر کرتا ھے کہ جب میر سید علی تبریزی حج کو گیا ھے تو امیر حمزہ کی تصاویر کا کام خواجہ عبدالصمد شیرازی مصور و خطاط کے سپرد کیا گیا ھے جس نے اس کام کو تھوڑے عرصے اور تھوڑے خرچ سے ختم کیا ھے قزوینی کے الفاظ ھیں :۔

” ھفت سال است کہ میر مذکور حسب‌الحکم حضرت اعلے در کتاب خانہ عالی بہ تزئین و تصویر مجالس قصہ امیر حمزہ مشغول است و در اتمام آن کتاب بدایع انتساب کہ از مخترعات خاطر وقاد حضرت اعلے است اھتمام می نمائید۔ والحق آن کتابے است کہ تا دوران سپہر منیاگون از تصویر کواکب ثواقب زیب و آرائش یافتہ نظیر آن ھیچ دیدہ ور نہ دیدہ تا اطباق سفینہ گردوں از چھرہ کشائی ماہ و خورشید زینت و نمائش گرفتہ دست تقدیر ھمچناں نسخہ بر لوح خیال نہ کشیدہ و اختراع آں کتاب عجیب الابداع بریں وجہ خیال فرمودہ اندکہ عجائب حالات و غرائب واقعات آن قصہ را مبدأ تا مآل مو بہ مو

صحائف تصویر نگارند و از وقائق صورتگری دقیقہ نا مرعی نہ گزارند۔
و آں حکائت در دوازدہ مجلد با تمام خواهد رسید۔ هر جلدے مشتمل
بر یک صد ورق و هر ورقے یک زرع ۔ در یک زرع محوی بر دو مجلس
تصویر بر صدر هر مجلس حالات و واقعاتے کہ با آن صفحہ متعلق
است بہ زبان وقت املا کردہ اند و انسا و ابداع آں حکایات شوق
انگیز و روایات طرب امیز بہ حسن اهتمام و نتائج اقلام سحر انجام
فصاحت شعار و بلاغت و کمالات آثار خواجہ عطااللہ منسی قزوینی کہ
کہ طبع وقارش ناقد کلمات دلفریب است۔ صورت انجام و اتمام می
یابد و با آنکہ درمدت مذکور سی نفر از مصوران بہراد صفت مانی سیرت
در آن کتاب بر دوام با اهتمام کار می کنند زیادہ از چہار جلد با تمام
نہ رسیدہ ۔ کمال زینت و نہایت پرکاری آن ازیں معنی قیاس تواں کرد
و نقهم‌الہ باتمامہ فی ظل‌دولتہ‌العالیہ و ایامہ دریں ولا مسر مذکور
رخصت حج گرفتہ بر کاری کتاب مذکور بہ استاد عدیم‌المثل خواجہ
عبدالصمد مصور شیرازی مرجوع شد و خواجہ مذکور در اتمام آن غائت
اهتمام بجا آوردہ و در خرچ آن کفائت نمایاں کرد،،

ابوالفضل اور ملاں عبدالقادر بدایونی اگرچہ دونو هم عصر اور معاصر هیں
لیکن ان کے بیان میں اسقدر تفاوت هے کہ انسان سوچ میں پڑ جاتا هے کہ کس
کی بات کو درست تسلیم کرے اور کس کو غلط۔ بدایونی کا بیان هے مرقع سولہ
جلد میں ختم ہوا۔ ابوالفضل نے لکھا هے مرقع بارہ جلد میں ختم ہوا۔ نفائس
المائر میں مرقوم هے مرقع بارہ جلد میں ختم ہوگا۔ آئین کے الفاظ هیں :۔

" قصہ امیر حمزہ را دوازدہ دفتر ساختہ رنگ امیز کردند و استاداں سحر
پرداز یک هزار وچہار موضع را حیرت افزائے دیدہوراں گردانیدند،،

مخزن الغرائب اورمنتخب التواریخ میں ملاں بدایونی کا بیان هے :۔

" جدائی میر سید علی مصور است حسیات بسیار دارد هر تصویر وے کارنامہ
ایست در هندوستان ثانی مانی بود وقصہ امیر حمزہ در شانزدہ جلد مصور
بہ اهتمام وے یافتہ ۔ هر جلد صد ورق و هر ورق یک ذرع در یک ذرع
و در هر صفحہ صورتے ،،

نفائس المآثر کا اقتباس اس سے پہلے درج کیا جا چکا ہے۔ نفائس اور آئین متفق ہیں کہ مرقع میں بارہ جلد تھیں لیکن اوراق اور تقطیع کے بارے میں نفائس اور بدایونی متفق ہیں مگر کل اوراق کے متعلق ان من بھی اختلاف ہے اور ابوالفضل کا کا بیان ان سے مختلف ہے مگر وہ تعداد اور اوراق اور تقطیع کے متعلق کچھ روشنی نہیں ڈالتا۔ اس کے بیان کے مطابق مواضع کو قصہ کے مواضع فرض کیا جائے تو اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوازدہ جلد میں چودہ سو موضع کو حیرت افزائے دیدہوراں کیا گیا ہے اس نے کچھ تعداد لوحوں وغیرہ کی بھی شامل کرلی ہے۔ بظاہر نفائس اور منتخب التوارخ کا مطلب ایک ہی ہے ایک ورق کا حساب کر رہا ہے دو دوسرا صفحے کا مگر ان بیانات کو ابوالفضل کے بیان سے مطابقت نہیں دی جاسکتی۔ نفائس اور منتخب کے الفاظ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دونو نے اوراق تصاویر کو نہیں دیکھا۔ لیکن ابوالفضل نے دیکھا تو ہے مگر ان کی جزیات میں نہیں گیا۔ یہ ابوالفضل تک ہی محدود نہیں ہمارے مورخین کا دستور ہے کہ وہ مصوری۔ تعمیرات اور دیگر فنون لطیفہ جن میں ن کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی توجہ نہیں دیتے۔ وہ نہ تو ہنرمند کی شخصیت یں دلچسپی لیتے ہیں اور نہ اس کے کام کی اہمیت ہی کو سمجھتے ہیں۔ اگر کسی کام کی نوعیت اور اہمیت نے ان کو مجبور کردیا ہے کہ وہ اس کا ذکر کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں تو وہ کسی تفصیل اور جزیات میں نہیں گئے محض سرسری طور پر بیان کر کے چھوڑ گئے ہیں۔ جس صورت میں اس کام کا ذکر ہونا چاہیے اس کا حق ان سے ادا نہیں ہوسکا۔ چنانچہ ان ہم عصر مورخین کے غیر مجمل بیانات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غیر مسلم نقادوں کو موقع مل گیا ہے ہ جو چاہتے ہیں رائے قائم کر لیتے ہیں۔ بر عکس اس کے انہیں مورخین نے یہاں کہیں اپنے کسی فن کار کا ذکر کیا ہے تو اس کے ایک ایک کام ایک یک کارنامے کا ذکر پوری تفصیل سے اور اس کے فن کی تمام جزیات میں جاکر کیا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے خاندان اور خاندان کے افراد۔ کہاں پیدا ہوا کہاں دفن ہوا۔ کس دربار یا رئیس سے منسلک رہا کیونکر زندگی بسر کی سب اتوں کا ذکر اس تفصیل سے کرینگے کہ گویا ہم عصر ہیں اور وہ بھی قریب‌ترین ، چکے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر اس کے فن کا سلسلہ اس کے خاندان میں آگے

قائم رہا ہے تو اس کا بھی بیان کرینگے۔ غرض اپنے افراد کو اپنی قوم کی تاریخ
کا ایک ستون ثابت کرینگے اور ثابت کرینگے کہ اس کے بغیر ان کی قوم کی
تاریخ نامکمل معلوم ہوتی ———— ہمارے اپنے مصوروں۔ خطاطوں
اور ہنرمندوں سے متعلق ہماری یہ حالت ہے کہ ہم ان سے تھوڑی بہت معلومات
سے متعلق غیر اقوام کے مرہون منت ہیں ۔ یورپین محققین کی چھان بین ہی کا
نتیجہ ہے کہ ہم آج بہزاد ۔میرک سلطان علی مشہدی۔ منصور۔ نادرالعفر
نادرالزمان ۔ وعیرہ سے کچھ با خبر ہیں اور ان کے کار ہائے نمایاں سے دلچسپی
رکھتے ہیں

تصاویر بابت داستان امیر حمزہ سے متعلق بھی ہم مغربی محققین ہی کے
احسان مند ہیں کہ ان کی تلاش اور جستجو نے ان کو روشنی بخشی اور ان کی
تحریرات نے ان کو شہرت عطا کی ۔ جہانتک مرا خیال ہے اس پر سب سے پہلے
Stanley Clark نے انگریزی میں کتابی صورت میں لکھکر روشنی
ڈالی ہے۔ کلارک کے علاوہ مختلف مصنفین نے علیحدہ علیحدہ مضامین کے
طور پر بھی ان سے متعلق تحریر کیا ہے۔ کلارک نے لکھا ہے۔ ”مرقع
امیر حمزہ دور اکبری کے ابتدائی سالوں کا کام ہے اس کی تصاویر قدیم تیموری
دبستان اور مسلم اکبری دبستان کے بیتن بیس واقع ہوئی ہیں۔ کلارک
کے نزدیک ان کی ابدا اور تکمیل ۱۵۵۶ ہے ان پر کسی مصور کے
دستخط بطور عمل ثبت نہیں ہیں اس کا خیال ہے یہ ان ایرانی اور ترکستانی مصوروں
کا کام ہے جو قدیم تیموری دبستان مصوری کے پروردہ تھے جو ہمایوں کے ہمراہ
۱۵۵۰ میں ہندوستان آئے تھے جو آئندہ چل کر اکبری عہد کے مشہور و معروف
مصور قرار دیئے گئے ،، اور جو مغل دبستان مصوری کے موجد کہلائے ۔

آجتک ان تصاویر کی جسقدر تعداد معلوم ہوسکی ہے ان میں ۲۷ عدد
تصاویر لنڈن میں عجائب خانہ وکٹوریہ اور البرٹ میں موجود ہیں اور ۶۱
تصاویر ویانا (VIENNA) کے عجائب خانہ کی زینت ہیں ۔
ویانا والی تصاویر پر اکبر اور اورنگ زیب کی اپنی اپنی مہریں ثبت ہیں جن میں
الترتیب ۱۰۰۱ ھجری اور ۱۱۰۰ ھجری کندہ ہے یہ تصاویر ۱۸۸۳ء میں
نمائش کی جا چکی ہیں۔ لنڈن والی ستائیس میں سے کلارک نے ۱۲ عدد کو

اپنی کتاب (Indian Drawings) انڈین ڈرائنگ (۱۹۲۱ء) میں شائع کردیا ہے ــــ سٹینلے کلارک کی طرح جرمن سے ایک کتاب حمزہ کے نام سے (۱۹۲۵ء) - میں

"The Indian Miniatures of Hamzas's Romance"

In the Museums Astria for Arts and Industry. in Vienna, and other collections, by, VON. HEINRICH GLUEK.

ایک مستقل تصنیف کی صورت میں جرمن زبان میں شائع ہوئی ہے اس کو ڈاکٹر فن‌ہائن‌رش گیولک نے ترتیب دیا ہے - اس میں وہ تمام تصاویر شائع کردی گئی ہیں جو ویانا اور لنڈن کے علاوہ ادھر ادھر موجود ہیں تعارف اور تقریظ کے علاوہ کئی سو صفحات مں حکائیات پر تبصرہ کیا گیا ہے - اس میں جو تصاویر شائع کی گئی ہیں ان کی کل تعداد ۹۸ کے قریب ہے جن میں دس (۱۰) رنگین - اٹھتالیس فوٹو گریویو اور چالیس (۴۰) مونو کروم میں ہیں یہ کتاب ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی ہے اس سے پیشتر سٹنیلے کلارک کی کتاب لنڈن سے ۱۹۲۱ میں شائع ہوچکی تھی -

برٹش میوزم کے فہرست نگار مسٹر ریو نے داستان امیر حمزہ سے متعلق دو اور تصاویر کا ذکر کیا ہے جو برٹش میوزم میں موجود ہیں ان کا سائز "۱۶ × ۲۳" ہے - ان کے ہر ورق کی پشت پر "۲۲ × ۲۱" انچ لمنبی اور ۱۹ سطر میں قصہ مرقوم ہے اور دوسری طرف تصویر ہے - ریو کے قیاس کے مطابق یہ تصاویر کسی اور مرقع سے متعلق ہیں جو اکبری مرقع کی تکمیل کےبعد بننے شروع ہوگئے تھے - یہ تصاویر اسلئے بھی کسی اور مرقع سے متعلق معلوم ہوتی ہیں کیونکہ یہ کاغذ پر بنی ہوئی ہیں - امیر حمزہ سے متعلق کاغذ پر بنی ہوئی تصاویر کئی عجائب خانوں اور مختلف افراد کے پاس یورپ امریکہ اور ہندوستان میں بھی پائی جاتی ہیں -

مرقع امیر حمزہ والی تصاویر سے کلارک اور دیگر یورپین محققین کو شک ہے کہ آیا یہ تصاویر انہیں مصوروں کی بنی ہوئی ہیں جن کو ہمایوں اپنے ساتھ لایا تھا اور جو کابل آکر اس کے دربار میں شامل ہوئے تھے - یا یہ ان مصوروں

کا کام ہے جو اکبری دربار سے سید علی تبریزی اور خواجہ عبدالصمد شیرازی شیریں قلم کی کوششوں سے پروان چڑھے تھے۔ کلارک وغیرہ اس بات سے ضرور متفق ہیں کہ یہ اس عہد کی پیداوار ہیں جو ہرات اسکول اور اکبر کے درمیاں واقع ہوا ہے۔ یہ اس نئے دبستان مصوری کا پیس خیمہ ثابت ہوئی ہیں جو ہمایوں کے عہد میں مغل دبستان مصوری کے نام سے قائم ہوا ہے۔

بعض کا خیال ہے ہمایوں کے حکم سے ۱۵۵۰ کے قریب کابل میں ہمایونی مصوروں نے یہ مرقع تصویردار کرنا شروع کیا تھا اور ۲۵ سال کے بعد یہ کام اکبر کے عہد میں آگرہ میں جاکر ختم ہوا ہے۔ اس میں کل ۱۴۰۰ تصاویر تھیں۔ ابوالفضل کی تعداد تصاویر کو تسلیم کرتے ہوئے اور ویانا اور لنڈن کی تصاویر کی موجود پائے ہوئے بقایا ۱۳۷۵ کو ضائع شدہ تسلیم کرنا چاہئے حالانکہ اس حساب سے ضائع شدہ تصاویر کی تعداد ۱۳۰۲ رہ جاتی ہے۔

عطااللہ قزوینی نے نفائس المآثر ۹۷۹ کے قریب ختم کی ہے اس وقت اس نے لکھا ہے کہ اس مرقع پر سات سال سے برابر کام ہو رہا ہے۔ اس سال کے مطابق یہ نہیں کہہ سکتے۔ کہ یہ مرقع اسی سال ختم ہو گیا ہے ہوسکتا ہے یہ تمام کام ۲۵ سال کی مدت میں جا کر ختم ہوا ہو۔ اگر نفائس کا سال آغاز ۹۷۳ جیسا کہ اس نے خود لکھا ہے تسلیم کر لیا جائے اور یہ مان لیا جائے کہ مرقع کا کام ابتدائی اکبری سالوں میں شروع ہوا تھا۔ تو پھر بھی بات نہیں بنتی ابوالفضل اور بدایونی ہم عصر ضرور ہیں انہوں نے مرقع کا ذکر بھی کیا ہے لیکن دونو نے اس کے زمانہ آغاز کا ذکر نہیں کیا۔ میرا خیال ہے ابوالفضل اور بدایونی اسلئے بھی مرقع کے سال آغاز سے متعلق کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ خود دربار سے اس وقت منسلک ہوئے ہیں جب اکبر کو عروج حاصل ہوچکا ہے اور اسلئے بھی کہ آئین اور منتخب جن میں مرقع حمزہ کا مذکور ہے اکبری دور میں بہت بعد جاکر تصنیف ہوئی ہیں۔ ابوالفضل ۹۸۳ ھجری مطابق ۱۵۷۵ء اور ملا عبدالقادر بدایونی ۹۸۱ ھجری مطابق ۱۵۷۳ء دربار سے منسلک ہوئے ہیں۔

ابوالفضل۔ بدایونی اور قزوینی کے بیان سے کوئی سیاسی الجھن پیدا نہیں ہوتی اسلئے بھی کہ ان لوگوں کے نزدیک کوئی سیاسی اغراض نہ تھیں۔ ان کے

نزدیک تو اپنے بادشاہ اور اس کے عہد سے متعلق واقعات قلمبند کرنا مقصود تھا۔ وہ ان تعصبات سے بالاتر تھے کہ ہندو یا دیگر اقوام کے افراد کو کم تر ثابت کیا جائے۔ یہ ان کی فراخ دلی اور روشن ضمیری کا ثبوت ہے کہ انہوں نے مذہب وملت کا امتیاز کئے بغیر قابل افراد کے کارناموں کو دل کھول کر سراہا اور پسند کیا۔ برعکس اس کے غیر مسلم محققین نے مرقع سے متعلق اس کے مصورین اور اس کے زمانہ سے متعلق سیاسی اغراض کے تحت ایسی الجنھیں کھڑی کردی ھیں اور ان کو اسقدر طول دیا ھے کہ یہ معمہ بن کر ناقابل حل بن گئی ھیں۔ داستان امیر حمزہ کے سلسلے میں وہ اپنی سیاسی اغراض کے تحت یہ ثابت کرنے میں لگے رھے ھیں کہ ان تصاویر میں ھندو ماحول۔ ھندو کردار۔ ھندی سازوسامان ھندی معاشرہ اور ھندی پس منظر استعمال کیا گیا ھے۔ جس کا مطلب یہ بتلانا ھوتا ھے کہ ان تصاویر کے بنانے میں ھندو مصوروں کا ھی ھاتھ ھے۔ اور وھی مقامی اثرات کے ذمہ دار ھیں۔ ان بیانات سے انہیں ھندو مصوروں کی برتری مقصود نہیں ھوتی درحقیقت وہ مسلمانوں کو کسی قسم کا حق فوقیت نہیں دینا چاھتے۔ ان کے ان بیانات میں کسی قسم کی تجسس و تلاش اور حقیقت کو کوئی دخل نہیں ھے۔

مسلمان حکمرانوں اور برسراقتدار افراد کی فیاضی۔ فراخ دلی اور ھنر پروری کا ثبوت ھے کہ انہوں نے پست سے پست اقوام کو اعلے سے اعلے علوم و فنون سے مالا مال کیا اور مستحق افراد کو برابری اور برتری کا درجہ عطا کیا۔ قدیم ھندوؤں کے عہد میں کس نبح ذاتی کی مجال تھی کہ علم جیسی دولت سے مالا مال ھوسکتا کس پست اقوام کی جرات تھی کہ تعلیم گاھوں اور درس گاھوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکتی اونچی جاتی کہ ھندو راجہ کب برداشت کرسکتے تھے کہ کوئی کمہار یاپالکی بردار مصور بن جاتا یا کوئی نیچ عالم۔ فاضل یا پنڈت کہلاتا۔

دربار اکبری میں ھندو مصوروں کی شمولیت بہت بعد کی بات ھے کیونکہ کسی تاریخ یا کسی تحریر سے یہ ثابت نہیں ھوتا کہ امیر حمزہ کی تصاویر کے وقت کوئی ھندو مصور دبستان مصوری میں شامل تھا یا کسی نے میر سید علی تبریزی اور خواجہ عبدالصمد شیرازی یا فرخ بیگ کے اس کام میں ان کا

هاتھ بٹایا تھا — رہا یہ کہ امیر حمزہ ٰی تصاویر میں کچھ مقامی رنگ یا پس منظر کا استعمال کیا گیا ہے تو اس کا سبب یہ نہیں کہ ان میں کسی ہندو مصور نے کام کیا ہے یا ایرانی مصور ہندؤں کے کام سے متاثر ہوئے ہیں در حقیقت ایرانی مصور اسقدر با کمال واقع ہوئے تھے اور ہر کام پر اسقدر قدرت رکھتے تھے کہ ہر ماحول میں اپنے آپ کو سمو لینا جانتے تھے ان کیلئے کسی مقامی رنگ اور مقامی پس منظر کو استعمال کر لینا اور ہو بہو اپنے رنگ میں ڈھال لینا کوئی بڑی بات نہ تھی ان کے نزدیک قدیم روایات سے ہٹ کر تصویر کشی کرنا سب سے بڑا مقصد تھا اس بات کا سب سے بڑا ثبوت خود داستان امیر حمزہ کو تصویر دار کرنا تھا یہ ان کی جدت طرازی کا ثبوت تھا کہ انہوں نے شاہ نامہ اور خمسہ نظامی سے بالا تر داستان امیر حمزہ کا انتخاب کیا تھا۔ ان کی مثال (GENEOUS) پال گوگین (PAL CUAGUIN) فرانسیسی مصور کی مانند ہے جس نے تھیٹی جاکر وہاں کی عورتوں مردوں اور وہاں کے ماحول اور معاشرے کو مصور کیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے کام میں کسی تھیٹی کے مصور نے ہاتھ بٹایا ہے۔ جس طرح پال گوگین کے رنگ۔ کینوس۔ برش اپنے تھے اس طرح ہمایونی مصوروں کے رنگ۔ برش ۔ کاغذ ۔ اسلوب اور طرز نگارش اپنا تھا ہر چیز وہ اپنے ساتھ لائے تھے حتٰی کہ کاشغری سفیدہ ۔ سمرقندی اور ہریری (ہراتی) کاغذ ۔ تبریزی لاجورد (نیلا) ماوراالنہر کا سرخ اور سبز (زمرد) جہانگیر اور شاھجہان کے عہد تک اور یہاں تک کہ راجپوت اور سکھوں کے عہد تک ایران سے درآمد کئے جاتے رہے ہیں۔ بقول یورپین ناقدین مسلمانوں کی آمد کے ساتھ کاغذ ہندوستان آیا ہے اور مغلوں کی آمد سے نوسو سال پیشتر ہندوستان میں کسی ہندو یا بدھ مصوری کا وجود نہیں تھا۔ مغلوں سے پیشتر کوئی راجپوت مختصر نگاری موجود نہ تھی ۔ چھٹی اور ساتویں صدی میں دیواری مصوری ضرور رو پذیر رہی ہے ۔ گپتا عہد میں سنگتراشی اور تعمیر کی روایات زندہ ہوں تو ہوں لیکن کسی قسم کی مصوری زندہ نہ تھی۔

ابوالفضل ۔ بدایونی اور نفائش الماثر کے مصنف تینوں نے کہیں اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ حمزہ کی تصاویر پر کسی ہندو مصور نے کام کیا ہے کسی یورپین ناقد نے خود یہ نہیں لکھا کہ حمزہ کی تصاویر پر کسی ہندو مصور

کا نام ملتا ہے ۔ بقول ابوالفضل اور دیگر مورخین چودہ سو تصاویر مصور ہوئی تھیں اور ان میں سے جسقدر آج دریافت ہو چکی ہیں جو لنڈن ۔ ویانا اور دیگر جگہ پائی جاتی ہیں اور جن پر اکبر اور اورنگ زیب کی مہریں ثبت ہیں ان میں کسی پر بھی تو کسی ہندو مصور کا نام نہیں ملتا ۔ ابوالفضل نے جب آئین اکبری میں تصویر خانے والے باب کو تکمیل دیا ہے تو معلوم ہوتا ہے مرقع امیر حمزہ سے علاوہ اور دیگر کتب یعنی رزم نامہ ۔ کلیلہ و دمنہ ۔ دراب نامہ وغیرہ تکمیل پا چکی ہوئی تھیں ۔ اور معلوم ہوتا ہے یہ کتب بہت بعد جاکر تکمیل پذیر ہوئی ہیں کیونکہ ان مصوروں کے نام جو ان کی جدولوں پر پائے جاتے ہیں وہ بہت بعد جا کر مصوری کے فن میں تاک ہوئے ہیں اور بہت بعد جا کر ان کو اکبری تصویر خانہ میں کارہائے نمایاں انجام دینے کا موقع ملا ہے ۔ کیونکہ جو پختگی برجستگی اور بندش حمزہ کی تصویروں میں پائی جاتی ہے وہ ان تصویروں میں نہیں پائی جاتی جن پر ہندو مصوروں کے نام ملتے ہیں اگرچہ وہ تصاویر رزم نامہ ۔ دراب نامہ اور کلیلہ و دمنہ کی زینت ہیں ۔

نقادان فن کے نزدیک یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ منیاتور مصوری (MINIATURE PAINTING) کی ابتدا ہی مسلمانوں کے دور سے ہوئی ہے ہندو مورخین جن پام کے پتوں پر بنی ہوئی جین مصوری (JAIN PAINTING) کو قدیم ثابت کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں وہ سولھویں صدی سے اوپر ثابت نہیں ہو سکی ۔ ہندو مصوروں کا ذکر حقارت سے کرنا مقصود ہے اور نہ ان کے کمال سے انکار مدنظر ہے مطلب یہ ہے کہ ہندو مصور شاگردی کے درجہ سے استادی کے رتبہ کو پہنچیے تھے اور مغلوں کی آمد سے پیشتر کوئی ایسا ہندو مصور موجود نہ تھا جو قدیم روایات کا باقی دار واقع ہوا ہو ۔ ابوالفضل کے الفاظ خود اس بات کی غمازی کر رہے ہیں جو اس نے لکھا ہے کہ ہندو شاگردی کے درجہ سے استادی کے رتبہ کو پہنچیے تھے ۔ اس نے لکھا ہے کہ "ایک صد سے زیادہ مصور استادئی فن کا درجہ حاصل کر چکے ہیں اور ان لوگوں کی بڑی تعداد ہے جو کمال فن کے قریب پہنچ چکے ہیں اور بالخصوص یہ بات ہندؤں پر صادق آتی ہے ان کی تصاویر ہمارے تخیل سے بہت بلند ہیں" ۔ اس نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ فلاں باکمال ہندو استاد دربار میں موجود تھا یا فلاں ہندو استاد نے یہ کام انجام دیا تھا ۔ جہاں اس نے یہ بات لکھی ہے

کہ یہ بات ہندؤں پر صادق آتی ہے اس کا مطلب صاف اور واضع ہے کہ خلاف امید ہندؤں نے اس فن کے سیکھنے میں حیرت انگیز مستعدی دکھلائی ہے (جیسا کہ اس نے دسوت اور ساون کے بیان میں ذکر کیا ہے)۔

چند یورپین ناقدین کی تحریروں کے اقتباسات درج ذیل ہیں جن سے ظاہر ہوگا کہ حمزہ کی تصاویر مغل مصوری میں کیا مقام رکھتی ہیں اور ان پر خالص ملکی اور مقامی اثرات کہانتک اثر انداز ہیں - مزید واضع ہوگا کہ مغلوں سے پیشتر مصوری کس عہد تک موجود تھی اور ہند میں میر سید علی تبریزی مغل دبستان مصوری کی اختراع کا کہانتک ذمہ دار ہے -

Dr. Commaraswamy in his book "Rajput Painting" writes .—

"Indian painting for nearly eight centuries, roughly from A. D. 650 to 1427, the latest date of Ajanta to that of the earliest illustrated Jain text so far available is nearly a blank."

Mr. Havel in his book "Indian Sculptures and Painting" says :—

"Again, for several centuries Indian painting would present a complete blank".

"None of the early Rajput paintings are securely dated. It has therefore, been suggested that the style arose as a consequence of Hndu painters returning to their home after having enjoyed previous teaching at the Moghal Court".

Mr. V. A. Smith in his book "History of Fine Art in India and Ceylon" says :—

"Within the limits of India proper the history of the art of painting comes to an abrupt stop at the close of the Ajanta series in A. D. 642. Between that date and the Introduction of the foreign Persian style by order of Akbar more than nine hundred years later, in or about A. D. 1570, is a almost blank, we possess practically no direct knowledge of Indian painting,."

Mr. Percy Brown in his book "Indian Painting says :—

"With the decay of Buddihism in India in the seventh century A. D. the art appears to have declined, and for the exceptional long period of nearly a thousand years."

(2) From the time that the last painter at Ajanta threw down his brush in A. D. 650, until we come into contact with the art of painting again as it was revieved in the reign of the Moghal Emperor".

Mr. N. C. Mehta in his book "Studies in Indian Painting" says :—

" Nothing is know of the pictorial art of Hindustan, during the centuries intervening between the death of Harshavardhan A. D. 648, and accession of Akbar."

Mr. Stanley Clark in his book "Indian Drawings" writes :—

" Hamzah illustrations are the work of a small coterie of artists "Persian and Kalmucks"—trained in the style of the late Timurid school".

" The Hamzah paintings, apart from their technique and the dramatic delineation of the event related in the Romance, are of considerable interest in that they supply valuable details, bodly visualized, of the architecture, costumes, equipment, utensils, and appliances used in aearly Moghal times "

(2) While the school of Humayun possessed a distict and unmistakable style, as seen in surviving works, nevertheles they exhibit, in their stiff drawing and conventional mannerism, strong affinities with the Timurid period" Throughout this early Moghal period ranging approximately from 1555 to 1570 fairly successful attempts were made both in drawing and shading".

M. S. Dimand wrote in his book" A handbook of Mohammedan Decorative Art :—

" The illustrations of the Amir Hamzah, which were probably executed between 1556 and 1575, give us an excellent idea of Moghal customs, Architecture, and consumes,. As one would expect in paintings of this time, the colours, drawing, and ornament are strongly Persian in character".

V. A. Smith says in his book "History of Fine Arts in India and Ceylon" :—

" A remarkable set of twenty four large Paintings on cotton, in Moghal style "The Romance of Amir Hamzah" probably from the brush of Mir Sayid Ali Tabrizi".

Dr. Binyon writes in his book "Persian Miniature Painting" :

" Two painters of Akber's reign are of particulars importance, not only on account of their eminence in their art, but because

of the leading part which they played in the formation of the Moghal school of painting in India. There names were Mir Saiyid Ali Tabrizi, and Khawaja Abdal-Samad, Shirazi."

حمزہ کی تصویریں اطلس پر بنائی گئی ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک یہ اختراع تعجب خیز ہے مگر جن مصوروں نے یہ تصاویر بنائی ہیں ان کیلئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی کیونکہ اس اسلوب پر وہ پوری قدرت رکھتے تھے اور کئی کارہائے نمایاں انجام دے چکے تھے۔ یہ طرز نگارش پندرھویں اور سولھویں صدی میں رواج پذیر رہی ہے۔ اطلس پر سریش اور چاول کی پیچھ کا ھار یعنی کوٹ دے کر سطح کو طیار کر لیا جاتا تھا بعد میں اس پر کاغذ کی مانند کام کیا جاتا تھا۔ ایسی تصاویر اور قطعات بہت دیر پا ثابت ہوئے ہیں۔ در اصل یہ اختراع چین سے آئی ہے اور ایرانی مصوروں نے اسے اپنے ھاں اپنایا ہے۔ ڈاکٹر مارٹن نے اپنی کتاب میں کئی ایسی تصاویر کا ذکر کیا ہے اور کچھ شائع بھی کی ہیں ۔ حمزہ کی تصاویر اسلئے بھی اطلس پر بنائی گئی ہیں کہ اس وقت تک کاغذ کی تنگ دامانی اس قابل نہ تھی کہ حمزہ کے مضامین کی فراخی اور وسعت کو برداشت کر سکتی۔

جمالیاتی حس کو جلا دینے کیلئے حمزہ کی تصاویر محض اختراع ھی نہیں ان میں تجریدی عنصر بھی اسقدر موجود ہے کہ عام مذاق اور عام مذاق کی طبیعتیں انہیں جلد قبول کرنے سے قاصر ہیں ۔ یہ اجتہاد اور منفردیت مغل او ایرانی آرٹ کے درمیان ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ تو تصاویر ہیں رنگوں اور خطوط کا کرشمہ مغلوں کی ذھانت نے تو پتھر اینٹ اور چونے میں زندگی ڈال دی تھی ۔ فتح پور سیکری۔ آگرہ ۔ دھلی ۔ لاھور اور کشمیر آج بھی ان کے اجتہاد ۔ منفردیت ۔ حسن ذوق اور مذاق سلیم کے زندہ شاھد ہیں ۔ سب سے بڑی بات جو ان کے حسن ذوق اور مذاق سلیم سے اس ملک کو نصیب ہوئی وہ یہ تھی کہ مسلمان کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی باغات۔ عمارات تعمیر کرنے کی طرف توجہ دی اور دیکھتے دیکھتے ھندوستان جنت نظیر بن گیا۔ ایک مشترکہ تہذیب کا آغاز ہوا ادنے اور اعلے سر سبز اور خوش حال نظر آنے لگا ۔ تربیت گاھوں ۔ سراؤں ۔ اور ھسپتالوں کے ساتھ ساتھ علم و ادب اور صنعت و حرفت کی درسگاھیں جگہ جگہ قائم ہوئیں اور ان کا نام دھلی ۔ آگرہ او

جے پور۔ کانگڑہ اور راجستانی اسکول کی شکل میں نمودار ہوا۔ اجنٹا اور باغ کے
کے غاروں کے بعد ہندوستانی مصوری کا یہ دوسرا دور تقریباً نو سو سال بعد شروع
ہوتا ہے اور یہ سب کچھ خاندان تیمور کی برکت اور اس کے نیک حکمرانوں
کے نیک ارادوں کے باعث تھا ۔ یہ بابر کی العظمی ۔ ہمایوں۔ اکبر ۔ جہانگیر
اور شاہجہان کی ہنر پروری اور سر پرستی کا نتیجہ تھا۔

امیر حمزہ کی تصویریں لاکھ ہمایوں اور اکبر کے حسن ذوق اور
ہنرپروری کا نتیجہ کیوں نہ ہوں تاج محل کے معمار کی طرح ایک داستان بن کر
رہ جاتیں اگر ابوالفضل یا دیگر مورخ ان پر روشنی نہ ڈالتے وہ اپنے نیک دل
بادشاہ کی خوشنودی اور سرپرستی کا اظہار نہ کرتے تو کار استادان بیکار ہو کر رہ
جاتا ۔ امیر حمزہ کی تصویریں فنی نقطہ نگاہ سے ایک نمایاں پہلو لئے ہوئے اس دور
کی نمائیندگی کرتی ہیں جو علمی ادبی اور تحلیقی دور کہلایا ہے۔ جس میں
ہمایوں اور اکبر کی شخصیت نے ان کے تدبر ۔ اور اعلی ترین ذہانت نے عوام اور
خواص دونوں کو موقع دیا تھا کہ وہ محسوس کریں کہ وہ فاتح قوم کے دوش
بدوش کھڑے بر سر پیکار ہیں ۔ اس دور کی مصوری کی روایات ۔ رنگ ۔ جسامت
اور اجزا پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان ہنرمندوں کی صلاحیت انتہائے
کمال پر پہنچی ہوئی تھی۔ باوجود دربار کی سرپرستی کے نئے نئے موضوع ۔
طرح بندی ۔ شبیہہ نگاری ۔ مرصع کاری ۔ اقلیدیسی اشکال میں اجتہاد اور جدت
ان کی عادت ہو گئی تھی ۔ مناظر کشی ۔ رنگوں کی موزونیت اور جسامت ۔ مشاھدات
کے میلان کی رو سے ان کی مصوری میں اور ایرانی مصوری میں زبردست تفاوت
پایا جاتا ہے ۔ یہ اسلوب یہ طرز نگارش میر سید علی تبریزی ۔ خواجہ عبدالصمد
شیرازی ۔ فرخ بیگ قلماق ۔ آقا رضا ۔ نادرالعصر ۔ اور نادرالزمان جیسے پختہ فن
کاروں کا مرھون منت ہے جو انسانی فطرت ۔ اور ارادی تشکیل نو کے تحت ۔
ترتیب ۔ طرز فکر ۔ جمالیاتی کیفیت محسور کن خوبصورتی مصور کرنے میں پیش
پیش تھے ۔ ان فن کاروں نے یہاں کی آب و ہوا میں اپنے آپ کو پوری طرح
سمو لیا تھا ان کی ہر تعمیری صناعی میں وہ اخوت کار فرما تھی جو وہ اپنے ساتھ
لائے تھے انہوں نے نہ تو کسی کی دل شکنی کا بہانہ تراشہ تھا اور نہ کسی
مذھبی روایات کو اھمیت دی تھی ان کے اعتماد نے وقت کے تقاضوں کے ساتھ

ساتھ فنی اسلوب ۔ طرز نگارش ۔ اور تعمیری صناعی کو وہ درجہ بخشا ہے جو اس سے پیشتر مسلمانوں کی مصوری کے کسی دور کو نصیب نہیں ہوا ۔

اگر ایرانی اور مغل آرٹ کے دو شاہکاروں کا انتخاب کیا جائے جس میں ایک شبیہ سلطان حسین مرزا والئے ہرات کی اور دوسری بادشاہ جہانگیر کی ہو تو ان میں جو نمایاں فرق ہوگا وہ طرز نگارش اور اسلوب کا ہوگا ان دونوں ملکوں کی آب و ہوا ۔ معاشرہ ۔ بادشاہوں کے خد و خال ۔ رنگوں اور خطوں کی ہم آہنگی بھی ان پر اثر انداز نظر آئیگی حالانکہ دونوں شبیہیں بنانے میں وہی قاعدہ ۔ مو قلم اور رنگ استعمال کئے گئے ہیں ۔ ایران میں تنظیم و ترکیب مصوروں کی انفرادیت کے ضامن ہیں تصویروں کی یکسانیاں ۔ شاہی مسندیں ۔ عمارات کا پس منظر ۔ منبت کاری ۔ کاشی کاری ۔ خطاطی کے پیچ و خم اور گولائی ۔ محرابوں کی مسحورکن خوبصورتی ۔ اقلیدسی اشکال ۔ پس منظر میں پھیلے ہوئے درخت ۔ پھول پتے ۔ پہاڑ ۔ مرغزار ۔ آسمان ۔ بادل ۔ بہار اور خزاں جو کچھ بھی ہے ان کے فن کے سامان شان ہے وہ سحر نگار با کمال استاد تھے ان کا فن بادشاہوں کی سرپرستی اور خوشنودی کے تابع پرورش پاتا تھا اس کے برعکس مغل آرٹسٹوں نے دربار کی سرپرستی اور بادشاہ کی دلچسپی کے تحت اپنے اعتماد سے نئے طرز کو اپنایا تھا اور ایرانیوں سے اپنے آپ اور اپنے فن کو مختلف پیش کیا تھا ۔ حمزہ کی تصاویر میں پس منظر میں پھیلے ہوئے درخت ۔ پھول پتے ۔ مرغزار ۔ پہاڑ ۔ بادل ۔ آسمان ۔ محلات اور مقامی اثرات اسی اجتہاد اور اعتماد کا نتیجہ ہیں ۔

میر سید علی تبریزی اور اس کے ساتھی جب کابل میں ہمایوں کے حکم سے داستان امیر حمزہ کو تصویروں کے قالب میں ڈھال رہے تھے خود ہمایوں کو بھی یہ احساس نہ تھا کہ ان پہاڑوں اور وادیوں میں جہاں سلطان محمود غزنوی اور اس کے جانشینوں نے فرمانروائی کی تھی مغل علوم و فنون کو اور عظمت و عروج کے سلسلے کو اور بھی آگے بڑھائینگے اور ان کا یہ کارنامہ ایسی تہذیب اور تمدن کی صورت اختیار کر لیگا جیسے رہتی دنیا تک دوام حاصل رہیگا ۔ امیر حمزہ کی جو تصاویر کابل میں تیار ہوئی ہیں ان میں کابل کی فضا اور زندگی کی جھلک موجود ہے ۔ اکبر کے عہد میں جب بھی فن کار ہندوستان منتقل

هوئے هیں اور انهوں نے ترقی کا دوسرا قدم اٹھایا ہے تو سب سے بڑا کمال
اور وصف جو مصوری میں رونما هوا ہے وہ مقامی رنگ اور مقامی زندگی کی عکاسی ہے۔
اگر امیر حمزہ کی تصویروں کا جائزہ لیا جائے تو همیں ان میں پس منظر ۔ پرسپیکٹ ٹیو
(Perspective) رنگوں کی حلاوت اور جسامت اس درجہ ملیگی کہ هم انهیں
شاہ نامہ اور خمسہ نظامی کی تصویریں سمجھنے لگینگے اور دیگر خصوصیات کا
مطالعہ کرینگے تو وہ ایرانی مصور اجنتا اور باغ کے غاروں سے ساحر نظر آئینگے
حالانکہ اجنتا اور باغ کے غاروں کا آرٹ غاروں میں مدفون تھا ۔ زمانے کے انقلاب
اور انتشار نے بتکدے اور معبد مسمار کر دئیے ہیں اور شہر ویران اور سنسان
ہو گئے تھے آٹھویں صدی عیسوی تک کوئی بدھ مت کا نام لیوا بھی نظر نہ
آتا تھا۔

هندوستان میں غزنی ۔ غوری ۔ خلجی ۔ تغلق ۔ لودھی اور مغل حکمرانوں
نے جس طرح حکومتیں کی هیں اس طرح دکن میں بھی مسلمانوں کی اپنی روایات
هیں گل برگہ میں بہمنی سلطنت کے بانی علاؤالدین حسن گنگو نے ابتدا میں
ایک قلعہ اور ایک مسجد تعمیر کروائی تھی۔ مسجد کا معمار رفیع بن شمس
بن منصور قزوینی تھا جس نے اسے آٹھویں صدی هجری میں تعمیر کیا تھا یہ
هندوستان میں اسلامی فن تعمیر کی پہلی بیس کش تھی جو باوجود گردش
ایام اور انقلابات زمانہ کے آجتک سلامت ہے اس پر هندوؤں کے فن تعمیر کا کوئی
اثر نہیں ۔ جب بہمنی سلطنت بیدر میں منتقل هوئی ہے تو وهاں بھی انهوں
نے اپنی ضرورت کا احساس کرتے هوئے فطرت سے مجبور بہت بڑا اضافہ کیا ہے
خصوصیت سے احمد شاہ والی بہمنی نے اپنے گنبد کے اندرونی نقش و نگار اپنی
زندگی میں تحریر کروائے تھے۔ یہ نقش نگار شکراللہ قزوینی کے تیار کردہ هیں
جو ایرانی النسل تھا ۔ قزوینی کا نام آج بھی وهاں کی عمارات پر موجود ہے ۔ یہ
تمام کتبات رسم الخط کے اعتبار سے نسخ ۔ ثلث ۔ اور کوفی طرز تحریر میں هیں ۔
یہی حال قطب شاهیوں کا ہے جن کا پایہ تخت گولکنڈہ تھا ۔ بیجاپور میں
عادل شاہ کے مزار پر گول گنبد بھی بہ حثیت فنی خوبیوں کے دکھنی آرٹ
کی ناقابل فراموش تخلیق ہے ۔ اس طرز تعمیر اور نقش و نگار سے اس بات کا
اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کسقدر مقامی آرٹسٹ اور معمار دست یاب هو سکتے

تھے جو اسلامی فنون پر اثر انداز ہو سکتے ۔ ان شاہکاروں اور دکھنی حکمرانوں کے دور سے گذر کر انسیویں صدی عیسوی تک اجنتا کے غاروں کا کوئی نام و نشان نہیں ملتا ۔ اور نہ کوئی سلطنت کسی پہلو سے اجنتا کے غاروں پر روشنی ڈالتی ہے ہندوستان کی کسی تاریخ یا تحریر میں اجنتا کے غاروں کا کہیں ذکر نہیں وہ انسانی دست رس اور نظر سے اسقدر دور جا پڑی تھیں کہ بابر ۔ ہمایوں ۔ اکبر ۔ جہانگیر اور شاہجہان جیسے انحاد پسند اور ہنرپرور بادشاہ بھی ان کے دیکھنے سے محروم رہے ۔ یہانتک کہ اورنگزیب کو جس کی عمر کا بیشتر حصہ تسخیر دکن میں گذرا ہے یہ نعمت دیکھی نصیب نہ ہوئی ۔ ورنہ مغل وہ بلند نظر حکمران تھے جنہوں نے مہابھارت ۔ رامائن جسی مذہبی کتابوں کے تراجم اور باتصویر مرقعے تیار کروا کر تمام ملک مں پھیلا دئے تھے ان کی بے تعصبی اور بلند نگاہی کا ثبوت ہے کہ انہوں نے کرشن ۔ پانڈو۔ کوروؤں اور ہندو رشی دیوتاؤں کو خطوں اور رنگوں میں ملبوس کیا تھا اگر ان کے پیش نظر اجنتا کے غار ہوتے تو اپنی بلند نظری اور حسن دوی کے تحت ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کرتے جو مہابھارت اور رامائن کے ساتھ کر چکے تھے ۔

دکھن میں مسلمان حکومتیں علم و ادب اور فنوں لطیفہ مں مغلوں کے دوش بدوش اپنی تہذیبی اور ثقافتی قدروں کو فروغ دے رہی تھیں ان کا فن عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں کا ترجمان ہے ۔ لباس ۔ طرز زندگی ۔ سامان حرب اور سامان موسیقی جو کچھ بھی دکھنی تصویروں میں نظر آتا ہے ایرانیوں اور مغلوں سے مختلف ہے لیکن کسی لباس ۔ رزم برم یا اطوار میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی کہ ان پر بدھ مت یا اجنتا کے طور طریق کا اثر معلوم ہو سکے ۔ اگر ان مغلوں اور دکھنیوں کو ان غاروں اور بدھ مت سے متاثر ہونے کا موقع ہاتھ آتا تو دکھنی اور مغل حکمران ایران ۔ توران ۔ عراق اور بغداد سے صناع اور مصور طلب نہ کرتے نہ ہندوؤں کو مسلمان آرٹسٹوں کی شاگردی میں دیا جاتا اور نہ ہندوؤں کو مصوری کی تعلیم کی خاطر ایران بھیجا جاتا ۔ جسطرح اکبر اور جہانگیر کے عہد میں خواجہ عبدالصمد شیرازی اور سید میر علی تبریزی کی توجہ اور کوشش سے ہندو شاگردی سے استادی کے رتبہ کو پہنچے ۔ اسی طرح دکھن میں عادل شاہی اور قطب شاہیوں کے عہد میں ملاں فرخ حسین

شیرازی اور حاجی بابا بغدادی کی قیادت میں مقامی ہندؤں کو مصوری کی تعلیم کا موقع دیا گیا۔

ہر تصویر کے پیچھے ایک داستان ہوتی ہے اور ہر داستان تصویر کے قالب میں ڈھل کر ہی داستان بنتی ہے خواہ وہ کسی نامور سلطان کی ہو یا کسی ایسے فرد کی جو عوام سے اٹھا ہو اور عوام ہی میں مر گیا ہو۔ داستان امیر حمزہ کو تصویروں کا قلب و جگر عطا کرنے کو مصوروں نے ہر کردار کو اپنی نظر میں جگہ اور اھمیب دیکر زندہ جاوید بنا دیا ہے بادشاھوں کا مشغلہ ایک ایسے انہاک میں ڈھل گیا ہے کہ آج مغلوں کا فن اپنی طرز نگارش اور انفرادیت میں زمانے بھر سے مختلف اور یکتا ہے اور یہ اسی کا سبب ہے کہ آج مغل مصوری کے ساتھ ساتھ کانگڑہ اور راجستانی مصوری بھی زندہ ہے۔ کیونکہ ہم کانگڑہ اور راجستانی مصوری میں مغل مصوری کی مانند وہی سنگ مرمر کے ایوان اور محل۔ دیوان خانے۔ ستون اور محرابیں۔ لباس روایات۔ طرز معاشرت دیکھتے ہیں جو مغلوں کی کائنات بھی بہانک کے بابا نندا۔ کرشن اور رادھا کو بھی مغل لباس میں دکھایا گیا ہے۔

اگر ہم گجراتی طرز نگارش اور تصویر کشی کو مغلوں اور بہمنوں سے جا ملائیں تو بھی یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ کوئی گجراتی یا ہندی مصوری ان سے پیشتر موجود تھی یا ان کے زمانے میں کوئی ہندو قدیم مصوری رائج تھی۔ مغلوں سے چار سو سال پیشتر گجرات میں اسلامی سلطنت قائم تھی اور فن تعمیر اور نقاشی اس زمانے میں بھی مسلمانوں کے جزو زندگی تھے صرف اسقدر فرق تھا کہ سلطان گجرات امور سلطنت عربی خط نسخ میں انجام دیتے تھے کیونکہ محمد بن عمر آصفی کی کتاب ظفرالوالی عربی رسم‌الخط میں تحریر شدہ ہے۔ آٹھویں صدی ہجری کے خاتمہ پر شاہ مظفر نے گجرات میں حکومت قائم کی ہے احمد شاہ قطب‌الدین بھی کوئی پون سال بعد گجرات کا حکمران ہوا ہے۔ اس وقت تک مسلمانوں کا مذہبی اور معاشرتی نظام پورے طور پر گجرائیتوں میں سرائت کر چکا تھا اور گجراتیوں اور مسلمانوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ گجرات سے جو قدیم تصاویر اور مرقع ہاتھ آئے ہیں گو ان کی حیثیت (Primemetive) آرٹ کی ہے

مگر پھر بھی یہ تصویر کشی اسی کانٹہ پر کی گئی ہے جو مسلمان اپنے ساتھ لائے تھے۔ ابتدائی سے ابتدائی تصویر میں اسلامی تہذیب اور تمدن کے اہم نشان ملتے ہیں ۔ ان تصاویر میں مردوں ۔ عورتوں اور بچوں نے ایسا لباس زیب تن کر رکھا ہے جس سے ستر پوشی کا مدعا ظاہر ہوتا ہے۔ اور یہ اجنتا اور باغ کی تصویروں سے مختلف ہے ۔ پس منظر میں عمارتوں میں گنبد ۔ اقلیدسی اشکال ۔ بیل ۔ بوٹے ۔ لوحیں اور رزاسبانی کو بھی دخل ہے جو مسلمانوں کی مصوری کا حصہ ہیں ۔ اس کے علاوہ عبادت کے نشان رحلیں اور قرآن اللہ اور حضور کا نام ملتے ہیں جو سب مسلمانوں کا ترکہ ہیں نہ کہ اجنتا ۔ باغ گپتا یا جینیوں کا۔

سید میر علی تبریزی ۔ خواجہ عبدالصمد شیرازی ۔ فرخ بیگ قلماق۔ اور آقا رضا کے بعد نادرالعصر ۔ نادرالزمان ۔ استاد صادق ۔ استاد مراد ۔ مسکین ۔ حسن نقاش ۔ خواجہ شریف اور ہاشم کے علاوہ اور بھی ایرانی النسل فن کار جن کو ہندوستان کی محبت اور دولت یہاں کھینچ لائی تھی مغل دبستان مصوری کو بروئے کار لانے میں معاون ثابت ہوئے تھے۔ ابوالفضل یا کسی اور مورخ نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ دربار اکبری میں کوئی ایسا ہندو مصور یا استاد کامل ۔ کشمیر ۔ گجرات یا دکن سے آکر ان فن کاروں کے ساتھ شامل ہوا تھا جو امیر حمزہ کی تصاویر بنانے میں برسر پیکار تھے یا کوئی ایسا فن کا موجود تھا جو فن کی اہمیت اور قدروں کو پہلے سے جانتا تھا۔ اکبری تصویر خانہ کے سلسلے میں ابوالفضل نے آئین میں صرف اسقدر لکھا ہے کہ اکبری دبستان مصوری میں ایک سو کے قریب مصور کام کرتے ہیں جو ہندو فن کار ایرانی استادوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں ان کی حیثیت شاگردوں کی سی ہے ان میں دسونت اور بساون صرف اچھا کام کرنے لگے ہیں جو خواجہ عبدالصمد کے شاگرد ہیں انہوں نے اپنے استاد سے فن سیکھنے میں اچھی ذہانت دکھلائی ہے ان کے علاوہ کسولعل ۔ لال ۔ مکند ۔ مادھو ۔ جگن ۔ کھیم کرن ۔ سانولا ۔ تارا ہربنس۔ اور رام بھی ہیں جو فن مصوری میں ابھی تعلیم کی راہ طے کر رہے ہیں ۔

جہاں تک داستان امیر حمزہ کی تصویروں کا تعلق مغل اور ایرانی مصوری سے ہے اس سلسلے میں تصویرتیمور کا گھرانہ فنی اور تاریخی نقطہ نگاہ سے خاص

مینت رکھتی ہے۔ آج یہ تصویر برٹش میوزم کی ملکیت ہے میوزم والوں کو
۱۹۱۳ میں خستہ و خراب حالت میں ملی تھی۔ مغل مصوری کے ارتقا اور
مطالعہ سے متعلق اس تصویر کے ساتھ ایک گم شدہ باب وابستہ ہے۔ صاحب
ر نقاد پھروں تصویر کے سامنے کھڑا گذشتہ واقعات کو خود بخود دھرانے
تا ہے۔ تصویر کی پہنائیوں میں اس کے خالق نے وہ کائنات کھڑی کر دی ہے
۔ لفظوں کی محتاج نہیں وہ رنگوں اور خطوط کی دنیا کچھ کہے بغیر اپنا مدعا
ن کرتی ہے اور احساس دلاتی ہے کہ کسقدر بلند اور عیرفانی اجزا مغل
ٹ کی بقا کے ضامن ہیں۔ تصویر گھرانہ تیمور جہاں مغل مصوری کی امتیازی
صوصیات اور انفرادیت کی ضامن ہے وہاں اس خوشگوار اختلاط اور اشتراک
ل کی آئینہ دار بھی ہے جو ابتدا ہی سے مغلوں کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ تصویر
کھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے چودھویں کا چاند ضیا پاشی کر رہا ہے
ر جشن مہتابی برپا ہے یا یہ احساس ہوتا ہے تصویر کسی جشن نو روز
یادگار ہے۔ یا یہ محسوس ہوتا ہے ہمایوں نے کس مکس حیات کے بعد
۔گی کے خوشگوار مراحل میں قدم رکھا ہے اور پورا امن و امان حاصل کر
ہے جس کی یاد میں یہ جشن منایا جا رہا ہے۔ کیونکہ مغل ایسے شاندار
شن منانے کے ہمیشہ عادی رہے ہیں۔ تصویر داستان امیر حمزہ کی تصویروں
، قدرے بڑی ہے اس کا سائز "۴۴ × ۴۵" ہے اور حمزہ کی تصویروں کا
ئز "۲۲ × ۲۸" انچ ہے۔ اور امیر حمزہ کی تصویروں کی طرح یہ بھی اطلس
ہی ہے کچھ تو پختگی اور دیر پا رہنے کے خیال سے بھی یہ اطلس پر بنائی
ئی ہیں اور کچھ ان مضامین نے فن کاروں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اس
تراع میں اپنے فن کو آزمائیں۔

تصویر میں جہاں نما یعنی نشست گاہ بنائی گئی ہے۔ اس قسم کی نشست
ہیں ایرانی تصویروں میں کثرت سے بنائی گئی ہیں خصوصیت سے برٹش میوزم
لے مشہور خمسہ نظامی میں تو یہ جہاں نما پورے عروج پر نظر آتا ہے۔ ایسی
ست گاہ ہمیشہ بادشاہوں کیلئے بنائی جاتی ہے۔ اس تصویر میں اس کی وضع
ع حمزہ کی تصویروں سے بہت ملتی جلتی ہے۔ تصویر کیونکہ خستہ و خراب
الت میں ملی ہے کہا نہیں جا سکتا تصویر کے جو حصے ضائع ہو چکے ہیں

ان کا تصویر کے نفس مضمون سے کسقدر تعلق تھا اگر تصویر مکمل حالت میں ملتی تو گمان ہو سکتا ہے کہ اس پر مصور کا نام بھی ملتا کیونکہ ہر فرد کا نام تصویر پر لکھا ہوا موجود ہے جس سے تصویر کے تاریخی اور فنی پہلوں پر روشنی پڑتی ہے۔ مغلوں کے فطری رحجانات تصویر کی ایک ایک جزیات سے عیاں ہیں جن کو تصویر کے خالق نے بڑی چابکدستی سے مصور کیا ہے۔ بعض اوقات احساس ہوتا ہے کہ شطرنج کی کوئی بساط بچھی ہے اور ہر کردار خواہ بادشاہ کا ہے یا مصاحب کا پھول کا ہے یا پتی کا درخت کا ہے یا پھل کا جیت کی چال چل رہا ہے۔ تصویر کے پس منظر میں جہاں نما کے دائیں جانب جو درخت نظر آتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا تیمور کا خانوادہ سطح زمین سے ابھر کر شاخ در شاخ پھیلتا چلا گیا ہے زندگی کی کھلا گھمی اور بالیدگی اس کا پیدائشی حق بن گئی ہے۔ تصویر فطری رحجان کے ساتھ ساتھ ان فاتحین کی عکسی کرتی ہے جنھوں نے ہندوستان کو اپنا مسکن بنا لیا تھا اور یہیں کے ہوکر رہ گئے تھے۔ اس میں حسن بھی ہے اور زندگی کی بھر پور شدت بھی۔ جہاں نما یعنی نسست گاہ میں چار صورتیں بنائی گئی ہیں بائیں جانب اکبر۔ جہانگیر۔ اور شاہجہان بیٹھے ہیں اور دائیں جانب مسند پر تیمور بیٹھا ہے جہاں نما سے باہر بائیں جانب ان شخصیتوں کی صف چلی گئی ہے جنھوں نے ہندوستان کو اکبر۔ جہانگیر اور شاہجہان جیسے انحاد پسند۔ بلند نظر۔ اور صاحب ذوق فرماں روا دئے تھے اس صف میں پہلے میرانشاہ پھر سلطان محمد۔ پھر ابو سعید۔ پھر بابر کا باپ شیخ عمر اور بابر نظر آتے ہیں بابر کے بعد ہمایوں بادشاہ اور اس کے ساتھ مرزا کامران بیٹھا ہے۔ تصویر کے حاشیہ تک یہ صف برابر چلی گئی ہے۔ مصور نے میرانشاہ کے چہرے کا رنگ بمقابلہ دوسروں کے سرخ سیاہی مائل بنایا ہے جس سے تدبر کے آثار پائے جاتے ہیں۔ سلطان محمد اور ابو سعید کے پر وقار چہروں پر وہ جوہر موجود ہیں جن سے انکے کردار کی تکمیل ہوتی ہے۔ شیخ عمر انداز نشست سے اپنی عظمت کا اظہار کر رہا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی اولاد اس سر زمین پر پھلی پھولی اور تاریخ میں اس سے ایک اہم باب کا اضافہ ہوا۔ دائیں جانب اس خانوادہ کی دوسری شاخ بیٹھی ہے جس میں ابوبکر۔ بایسنقر مرزا۔ شاہرخ مرزا۔ اور دو اور شہزادے براجمان ہیں۔ اس تصویر سے متعلق

یورپین نقادوں کے مختلف نظرئے ھیں ۔ کوئی کہتا ھے یہ تصویر اصل نہیں نقل ھے کوئی کہتا ھے یہ اصل ھے کوئی دوسری اس کے مفہوم کی ترجمانی نہیں کرتی ۔ ڈاکٹر بنیسن کا خیال ھے یہ تصویر شاھجہان کے وقت بنی ھے اور جہان نما میں مسند پر ھمایوں بیٹھا ھے اور اس کے سامنے اکبر۔ جہانگیر اور شاھجہان بیٹھے ھیں ۔ ڈاکٹر بنین (Binyan) نے اس تصویر پر خاص توجہ دی ھے اور اس کو سمجھنے کی بھی سب سے زیادہ کوشش کی ھے ۔ مگر براہ راست کسی مشرقی زبان میں ماہر نہ ہونے کے ان سے یہ بات نظر انداز ہو گئی ھے کہ جہاں میرانشاہ ۔ سلطان محمد ۔ ابو سعید اور شیخ عمر سے آگے بابر اور کامران کے درمیاں ھمایوں بیٹھا ھے اس پر اس کا نام بالتصریح ھمایوں بادشاہ لکھا ھے اس بات کی رو سے تصویر کی اھمیت بڑھ جاتی ھے اور یقین ہوتا ھے کہ مسند شاھی پر تیمور کے سوا اور کوئی جلوہ گر نہیں ۔ اور یہ حقیقت ھے کہ اگر ایسا نہ ھو تو تصویر گھرانہ تیمور نامکمل سمجھی جائیگی اور یہ اسلئے بھی ھے کہ تیمور کے گھرانے کا کوئی فرد اس بات کی جرات نہیں کر سکتا تھا کہ امیر تیمور کی شبیہہ جہاں نما میں سے مٹا کر وھاں ھمایوں کی شبیہہ بنا دے اور اس کے حضور اکبر ۔ جہانگیر اور شاھجہاں کو بٹھلا دے ۔

ابوالفضل نے آئین اکبری میں تصویر خانہ کے باب میں سب سے آخر اس بات کا ذکر کیا ھے کہ ”اعلی حضرت کے حکم سے ملازمین بارگاہ کی تصویریں بنائی گئیں اور ان مختلف تصویروں کے مجموعے سے ایک کتاب سترگ تیار ہوئی جس نے مردوں کو حیات تازہ اور زندوں کو زندگئی جاوید عطا کی،، گھرانہ تیمور کی یہ تصویر اگر ابوالفضل کی نظر سے گذری ہوتی تو ضروری تھا کہ تصویر خانہ کے باب میں جہاں اس نے دوسری کتابوں اور تصویروں کا ذکر کیا ھے اس کا بھی ذکر کرتا اور بیان کرتا کہ اس قسم کی اس قطع و برید کی کوئی تصویر محل میں یا تصویر خانہ میں موجود ھے اسے فلاں مصور نے بنایا ھے اور وہ اعلیٰ حضرت کی نگاہ میں کیا اھمیت رکھتی ھے اس کی تاریخی اور فنی حیثیت کیا ھے ۔ چنانچہ ابوالفضل نے کسی ایسی تصویر کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا جو ھمایوں یا اکبر کے عہد میں تیار ہوئی ھو اور جس سے گمان ھو سکے کہ اس کا مطلب تصویر تیمور کے گھرانہ سے ھے ۔ ابوالفضل نے تصویر خانہ کے سلسلے

میں کئی ایسی نانوں کا ذکر کیا ہے جن سے - کتاب سترگ - چنگیز نامہ - ظفر نامہ - اکبر نامہ - رزم نامہ - رامائن - نل دمن - دراب نامہ اور کلیلہ دمنہ وغیرہ پر روشنی پڑتی ہے -

بقول ڈاکٹر بنین(Binyan)مذکورہ بالا تصویر تیمور کا گھرانہ میں جہان نما میں ہمایوں کے حضور اکبر - جہانگیر اور شاہ جہاں کو بہ عقدت تمام بیٹھے دکھایا گیا ہے اور باہر بائیں جانب کی صف میں بابر اور مرزا کامران کے درمیان خود ہمایوں کی موجودگی بہت بڑی سوچ کا موجب ہے کہ ایک تصویر میں ہمایوں کو دو جگہ کیوں بنایا گیا ہے - اس کے علاوہ اس تصویر میں ایک اور الجھن موجود ہے وہ یہ کہ اکبر - جہانگیر اور شاہجہان کی تصاویر پر ان کے نام کے ساتھ بادشاہ لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے جہان نما کے اندرونی حصے میں اکبر - جہانگیر اور شاہجہان کے سوا تمام تصویر پہلے سے تکمیل شدہ حالت میں تھی اور جہان نما کا اندرونی حصہ جہاں ہمایوں یا تیمور کے حضور میں اس کی اولاد در اولاد بہ عقدت تمام بیٹھی ہے وہ شاہجہاں کے عہد میں تیار ہوا ہے جب اکبر اور جہانگیر فردوس مکانی ہو چکے ہیں اور شاہجہانؑ سریر ارائے سلطنت ہوا ہے اور بادشاہ شاہجہان کے لقب سے ملقب ہے - یہ مسلم شدہ بات ہے کہ یہ تصویر شاہجہان کے عہد میں ہرگز نہیں بنی اول تو یہ طرز نگارش اس وقت موجود نہ تھی دوسرے یہ کہا نہیں جا سکتا کہ عہد شاہجہانی میں میر سید علی تبریزی - خواجہ عبدالصمد شیرازی - اور فرخ بیگ قلماق میں سے کوئی موجود تھا یا نہیں جو اس طرز نگارش کے ذمہ دار تھے -

ابوالفضل کے بعد جہانگیر نے تصاویر اور مصوروں کا ذکر دل کھول کر کیا ہے لیکن اس تصویر کا ذکر نہ تو خود تزوک میں کیا ہے اور نہ اس کے عہد کے کسی مورخ نے بیان کیا ہے - اگر جہانگیر کی نظر سے یہ تصویر گذری ہوتی تو وہ خلیل مرزا شاہرخی کی تصویر معرکہ تیمور کی طرح اس کا بھی ذکر کرتا جو خان عالم ایران سے لایا تھا اور جس کو دیکھکر اس نے کہا تھا کہ اگر اس پر خلیل مرزا شاہرخی نہ لکھا ہوتا تو میں سمجھتا یہ تصویر بہزاد کی بنی ہوئی ہے - اکبر اعظم کے بعد تصویر تیمور کے گھرانے کا ذکر تو

در کنار امیر حمزہ کی تصویروں کا ذکر کہیں نہیں ملتا جن کو تکمیل دینے میں مغل دبستان مصوری کو زندگی جاوید نصیب ہوئی ہے ۔ اگرچہ امیر حمزہ کی تصاویر پر اکبر اور اورنگ زیب کی مہریں ثبت ہیں ۔

میرا خیال ہے تصویر گھرانہ تیمور کابل وغیرہ میں ہمایوں کے عہد میں تیار ہوئی ہے اور اس کے بعد بعض حالات کی رو سے نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے اور توشہ خانہ میں پڑی رہی ہے ۔ تا آنکہ بعد میں دوبارہ ہاتھ آئی ہے ۔ تصویر ہاتھ آنے پر جہاں یا میں کسی کو گنجائش نظر آئی ہے اور اس نے اکبر ۔ جہانگیر ۔ اور شاہجہان کو بھی شامل کر دیا ہے اور اس طرح پس منظر میں دائیں بائیں دو شہزادوں کا بھی اضافہ کر دیا ہے ۔ یہ دونوں باتیں اس بات کا ثبوت مہیا کرتی ہیں کہ یہ سب کچھ بعد میں اضافہ کیا گیا ہے ۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا کہ یہ سب کچھ کب اور کس کے حکم سے تکمیل دیا گیا ہے اگر شاہجہاں کے حکم سے ایسا کیا گیا ہوتا تو یہ ضروری تھا کہ پس منظر میں پرویز کی شبیہ نہ بنائی جاتی ۔ اسی طرح اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ تصویر ہمایوں کے حکم سے تیار ہوئی ہے تو کیونکر ہو سکتا ہے کہ مسند پر بھی ہمایوں متمکن ہو اور پھر بابر کی جانب بابر اور کامران کے درمیان بھی موجود ہو ۔ اور پھر یہ کہ مرزا کامران بھی موجود ہو جو ہمایوں کا زندگی بھر بد ترین دشمن رہا ہو ۔ پرویز ۔ اور کامران ۔ کے ناموں سے یہ بھی شک گذرتا ہے کہ کسی نا سمجھ انسان نے بعد میں تمام کرداروں پر نام لکھ دئے ہیں اور اس بات کا خیال نہیں کیا کہ اس کے اس فعل سے کسقدر بڑا مغالطہ پیدا ہو رہا ہے ۔ لیکن بعض باتوں کو دیکھکر خیال ہوتا ہے کہ کسی مبالغے کی قطعاً گنجائش نہیں ہے ۔

تصویر کا بنانے والا کون تھا کس نے اس کی طرح ڈالی ۔ اس کی استخوان بندی میں کس کس نے ہاتھ بٹایا کس کس نے چہرہ کشائی اور رنگ امیزی کی اس سے متعلق نہ تصویر خود کچھ بتلاتی ہے اور نہ اس پر کوئی تاریخ یا تحریر روشنی ڈالتی ہے اگرچہ اکبر اور جہانگیر کے عہد میں تیار ہونے والی

تصاویر اور مرقعوں پر اکثر پایا جاتا ہے کہ طرح بندی ۔ چہرہ کشائی اور رنگ امیزی کس کس نے انجام دی ہے ۔

بعض کا خیال ہے یہ تصویر استاد میر علی تبریزی نے بنائی ہے اور بعض خواجہ عبدالصمد شیرازی کو اس کا خالق قرار دیتے ہیں یہ ان ہنر مندوں کی فن کاری کا کرشمہ ہے جنہوں نے داستان امیر حمزہ کو تصویروں کے قالب میں زندگی بخشی ہے اور ان کو ایک خاص مقام عطا کیا ہے سوائے اس حصہ کے جس میں ہمایوں یا تیمور کے سامنے اکبر ۔ جہانگیر اور شاہجہاں بیٹھے ہیں ویسے بھی ۔ اگر فنی نکتہ نگاہ سے ان صورتوں کا مطالعہ کیا جائے تو تصویر کے تمام کرداروں میں ہمایوں کے ہمرا آنے والے فن کاروں کا ہاتھ کار فرما نظر آئیگا اور اکبر ۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے چہروں پر وہ طرز نگارش اثر انداز نظر آئیگی جو عہد شاہجہانی کی مرہون منت ہے ۔تھوڑی دیر کیلئے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ جہاں نما میں ہمایوں نہیں تیمو ر بیٹھا ہے تو پھر بھی اس تصویر کا یہ حصہ بعد کی تخلیق ہے یعنی یہ حصہ کسی دوسرے مصور نے اس وقت بنایا ہے جب یکرخی چہرے کی اختراع نے پختگی اختیار کر لی ہے ۔

بعض اوقات خیال ہوتا ہے شاید موجودہ تصویر اصل تصویر کی نقل ہی ہے جس میں جہاں نما میں امیر تیمور مسند پر متمکن تھا اور باہر اس کے دائیں بائیں اس کی اولاد در اولاد اور اس کے جانشین اسی ترتیب اور انداز سے بیٹھے تھے اور جہاں نما کے اندر باقی جگہ خالی پڑی تھی اور جب تصویر تلاش ہوئی ہے تو خالی جگہ کو اکبر ۔ جہانگیر اور شاہجہاں کا اضافہ کر کے پر کیا گیا ہے ۔ اس بات پر اگر غور کیا جائے تو کچھ صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ اکبر ۔ جہانگیر اور شاہجہاں کی شبیہہ بن جانے سے جہاں نما کے اندر کا حصہ ذرا گھٹا گھٹا یعنی (Crowdy) محسوس ہوتا ہے اور یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اکبر ۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے بنانے میں کچھ زبردستی کی گئی ہے ۔ گویا ان شبیہوں کو زبردستی ٹھونس دیا گیا ہے کیونکہ ان میں وہ فراخی اور وسعت نظر نہیں آتی جو تصویر کے دوسرے حصہ میں موجود ہے اس قسم کی زیادتی جہاں نما کے پس منظر میں بھی کی گئی ہے جہاں دائیں بائیں دو شہزادے کھڑے کئے گئے ہیں ان میں بائیں جانب پرویز شاہ جہاں کا بڑا بھائی داراشکوہ کا خسر

کھڑا ہے ۔ اور دوسری جانب کوئی دوسرا شہزادہ کھڑا ہے۔ تصویر کا تمام ماحول ابتدائی مغل اور ایرانی دستان مصوری کا مظہر ہے سوا اس حصہ کے جو بعد میں اضافہ کیا گیا ہے ۔

براؤن کا خیال ہے یہ تصویر خواجہ عبد الصمد کی بنائی ہوئی ہے۔

خواجہ عبدالصمد شرازی کی وہ تصویر جو طہران میوزم کی ملکیت ہے اور جس پر خواجہ کے دستخط ثبت ہیں ۔ جس میں اکبر اپنے باپ ہمایوں کی خدمت میں ایک تصویر پیش کر رہا ہے خالص ایرانی ماحول میں ہے اور صفوی اور بہزاد اسکول سے مشابہت رکھتی ہے ۔ اس تصویر اور گھرانہ تیمور والی تصویر میں طرز نگارش ۔ ترتیب اور ٹیکنک کی رو سے نمایاں فرق ہے جسے ایک سمجھدار مطالع نگار الگ کر کے دیکھ سکتا ہے اور پرکھ سکتا ہے کہ تیمور کے گھرانے والی تصویر میں خواجہ کا ہاتھ نہیں ہے ۔ اگر یہ تصویر خواجہ کی بنی ہوئی ہوتی تو ہمایوں اور اکبر کی موجودگی میں اس نے جو تصویر طہران میوزم والی بنائی ہے اس میں وہ کچھ قدم آگے نظر آتا ۔ ہو سکتا ہے تصویر گھرانہ تیمور کی طرح میر سید علی تبریزی نے ڈالی ہو لیکن موجودہ تصویر ہر قسم کے تقین سے بالاتر ہے ۔ ہو سکتا ہے تصویر دونوں میں سے کسی ایک کا بھی کارنامہ نہ ہو لیکن یہ یقینی امر ہے کہ یہ خواجہ عبدالصمد کی کسی صورت نہیں ہے ۔ طہران میوزم والی تصویر بعض حالات میں بعض اجزا کی موجودگی سے یہ مشابہت ضرور پیدا کرتی ہے کہ یہ تصویر گھرانہ تیمور خواجہ عبدالصمد کی تخلیق ہے لیکن گھرانہ تیمور کی تصویر میں کرداروں کی بناوٹ اعضا کے تناسب میں موزونیت ۔ پختگی اور ندرت اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ یہ تصویر کسی اور نادر فن کار مصور کی سحر نگاری کا کرشمہ ہے ۔ کیونکہ خواجہ کی تصویر میں کرداروں میں (Perspective) اور (Balance) ایسا نہیں جیسا کہ تصویر تیمور کے گھرانہ کے کرداروں میں موجود ہے ۔ تصویر کا تمام مرحول ایرانی ہے سوا اس حصہ کے جو مغل طرز میں اضافہ کیا گیا ہے اور تصویر کے ہر کردار میں ایک Balance اور Perspective موجود ہے ۔ ہر کردار ایک پختگی ۔ موزونیت اور ندرت پیش کرتا ہے ۔ براؤن کا یہ بھی خیال ہے ابتدا میں جہاں نما میں تیمور کے سامنے صرف اکبر بیٹھا تھا جس کے

هاتھ میں کتاب ہے جو دے رہا ہے یا لے رہا ہے۔ اور جہانگیر نے اپنے وقت میں اپنی شبیہہ کا اس جگہ اضافہ کیا ہے اور شاھجہاں نے اپنے وقت میں اضافہ کرنے میں کمی نہیں کی۔ جہانگیر نے توزک میں یا کہیں اور اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ اس نے کسی ایسی تصویر میں اپنی شبیہہ کا اضافہ کیا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ جہانگیر اور شاھجہاں ایسی کم ظرفی کرنے کے خوگر نہ تھے۔ ان کی بلندھمتی سرشت اس بات کا مظہر تھی کہ وہ اس مضمون کی کئی تصاویر بنوا لیتے جیسا کہ جہانگیر اور شاھجہاں کے عہد کی کئی تصاویر اس مضمون کو ظاھر کرتی ھیں۔ جن میں تیمور۔ بابر۔ اکبر۔ جہانگیر اور شاھجہاں اکٹھے دکھلائے گئے ھیں۔ ایسی تصاویر کئی عجائب خانوں میں موجود ھیں۔

تصویر تیمور کے گھرانے کے سلسلے میں ایک بات جو میرے مشاھدے میں آئی ہے اور جس سے میرے نظریے کی تائید ھوتی ہے وہ یہ ہے کہ جہاں نما کے اندر جو تصاویر اکبر۔ جہانگیر۔ اور شاھجہاں کی بنائی گئی ھیں ان کا عین یہی اسی سائز کا ایک چربہ ڈاکٹر کمارا سوامی کی کتاب انڈین ڈرائنگ کی دوسری جلد میں پلیٹ نمبر XXV پر موجود ہے اور تعجب کی بات ہے کہ ان پر اکبر۔ جہانگیر اور شاھجہاں کے نام اسی صورت میں اسی جگہ فارسی رسم‌الخط میں اور ناگری رسم‌الخط میں لکھے ھیں۔ ڈاکٹر کمارا سوامی نے یہ کتاب ۱۹۱۲ء - ۱۹۱۱ء میں شائع کی ہے اور یہ تصویر برٹش میوزم والوں کو ۱۹۱۳ء میں ھاتھ آئی ہے۔ آجتک کسی مبصر نے اس انکشاف کی طرف توجہ نہیں دی اور نہ ڈاکٹر کمارا سوامی اور ڈاکٹر بنین (Binyan) نے خود اس بات کی طرف غور کیا ہے۔ ڈاکٹر بنین (Binyan) سے توقع ھو سکتی تھی کہ وہ اس بات کی طرف توجہ دیتے اور ڈاکٹر کمارا سوامی سے استفسار کرتے کہ یہ چربہ اس نے کس سے اور کہاں سے حاصل کیا ہے ممکن تھا اس استفسار سے اس تصویر کے اس اضافہ پر کوئی خاص روشنی پڑتی اور تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ھوتا۔ چربے سے میرے اس نظریے کی تائید ھوتی ہے کہ اکبر۔ جہانگیر اور شاھجہاں کو جہاں نما میں بنانے میں زبردستی کی گئی ہے اور یہ بعد کا اضافہ ہے۔

معلوم ہوتا ہے کسی مصور گھرانے میں یہ تصویر موجود رہی ہے جس میں یہ چربہ موجود تھا اور جس کے کسی فرد نے اکبر۔ جہانگیر اور شاہجہان کا اضافہ تصویر گھرانہ تیمور میں کیا ہے ۔

ڈاکٹر کمارا سوامی نے چربے پر یہ نوٹ لکھا ہے ۔

The group of three plate (XXV) Akbar, Jahangir and Shahjahan of the great Mugal is traching on skin, group of this sort are not uncommon as finished pictures The Suavity of the line and the possing of the figure exhibit marked Persian influence ; the well expressed character of the several emperorers typical of Moghal portraiture, and is rather a Chinese and Central Asian than a Persian (Sefevidean) element The Emperors' names are inscribed in Nagari and Persian characters.

مثنوی ابرِ گُہَر بار

از

شیخ اصغر علی ایم۔اے

سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور

باسمه العزیز

شیخ اصغر علی ایم - اے -

مثنوی ابرگہر بار

بر صغیر پاک و ہند میں غالب پسندوں بلکہ غالب پرستوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے لیکن ان میں سے بہت کم مرزا کی مثنوی گوئی کے کمال سے واقف ہیں - اور اکثر انہیں محض ایک قصیدہ نگار اور غزل گو شاعر ہی خیال کرتے ہیں - اس کی بڑی وجہ غالباً یہی ہے کہ انہوں نے کوئی ایسی طویل اور مبسوط مثنوی نہیں چھوڑی جو شاھنامہ، سکندر نامہ یا مخزن اسرار قسم کی چیز ہو - ملا جلا کر مرزا کی کل چودہ مثنویاں بنتی ہیں جو مجموعی طور پر بائیس سو ساٹھ (۲۲۶۰) اشعار پر مشتمل ہیں اور ان میں سے سوائے ابر گہر بار کے سب کی سب بہت مختصر ہیں - ابر گوہر بار اگرچہ مثنوی نا تمام ہے اور غالب کی مجوزہ طویل مثنوی کے دیباچے کی حیثیت رکھتی ہے لیکن پھر بھی یہ مرزا کا ایک ایسا شاھکار ہے جو دنیائے مثنوی میں ان کی بقا کا ضامن اور ان کی شہرت کا محافظ ہے اس ابر سے ایسے ایسے موتی برسے ہیں کہ انہیں دیکھ کر "ابر گہر بار" کے خالق کی صناعی اور فن کاری کی داد دئے بغیر نہیں رہا جاتا -

مرزا غالب کا ارادہ تھا کہ وہ سرور کونین کے غزوات کو مثنوی کی صورت میں نظم کریں - اور شاھنامہ فردوسی کے مقابلہ میں شاھنامہ اسلام قسم کی مثنوی لکھیں لیکن افسوس کہ ان کا یہ عظیم الشان خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا اور مرزا اپنی دوسری سینکڑوں حسرتوں کے ساتھ اس کی تکمیل کی حسرت بھی ساتھ لے گئے -

غالب خود اپنی مثنوی کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں

"در ضمیر زود اثر پذیر من چناں فرود آمد کہ غزوات خداوند دنیا و دیں حضرت امام المرسلین علیہ من رب العالمین بہ بندنگارش اندر آرم۔ توحید و مناجات و منقبت و ساقی نامہ و مغنی نامہ پیدائی پذیرفت ۔ ۱

مولانا حالی یادگار غالب میں اس مثنوی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں ۔

"اس مثنوی میں جس کا نام مرزا نے ابر گہر بار رکھا ۔ ان کا ارادہ آنحضرت صلعم کے غزوات بیان کرنے کا تھا ۔ مگر چونکہ یہ ان کی آخری تصنیف تھی اور انہیں عمر میں طرح طرح کے عوائق اور موانع پیش آئے اس وجہ سے غزوات کے شروع کرنے کی نوبت نہیں پہنچی ۔ صرف دیباچے کے چند عنوانات لکھنے پائے تھے کہ مکروہات روزگار نے گھیر لیا ۔ مگر یہ مثنوی ان کی تمام مثنویوں میں ممتاز ہے ۲ "

مولانا حالی نے مرزا کی اس مثنوی کو ان کی آخری تصنیف قرار دیا ہے اور اس کی عدم تکمیل کا باعث آخر عمر کے عوائق و موانع ٹھہرائے ہیں ۔ مرزا غالب نے خود مثنوی کا دیباچہ لکھتے ہوئے جس کے ایک حصہ کا مختصر اقتباس اوپر دیا ہے ۔ اپنے آپ کو ستر سال کا بڈھا کہا ہے ۔ کہ مثنوی کی طباعت و اشاعت کے وقت یعنی ۱۲۸۰ھ میں واقعی مرزا اسی سن کے تھے ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں مرزا غالب کے ایک معتبر معاصر سر سید احمد خان کا بیان بھی نظر آتا ہے وہ اپنی تصنیف "آثارالصنادید" مطبوعہ ۱۸۴۷ء میں رقمطراز ہیں

"ایک مثنوی مشتمل اوپر غزوات حضرت رسالت دستگاہی ختم پناہی صلی اللہ علیہ وسلم کے اگرچہ ہنوز نا تمام ہے لیکن پھر بھی قریب پندرہ سولہ جزو کے ہو چکی ہے ۔ انشاء اللہ تعالی جس وقت اتمام کو پہنچیے گی گلدستہ بزم احباب ہوگی" ۳

---

۱ ۔ غالب ــــ ابر گہربار مطبوعہ ۱۲۸۰ھ (اکمل المطابع) ص ۳ ۔

۲ ۔ مولانا حالی ــــ یادگار غالب ص ۳۳۲ ۔

۳ ۔ سرسید احمد خان ــــ آثار الصنادید ۔ چوتھا باب ص ۶۵ ۔

اس وقت مثنوی کے زمانۂ تصنیف کے بارے میں بظاہر دو معاصر اور ثقہ راویوں کے دو متضاد بیانات ہمارے سامنے ہیں ۔ حالی اسے غالب کے بڑھاپے کی آخری تصنیف بتاتے ہیں ۔ اور خود مثنوی کا دیباچہ اور اس کا سن اشاعت اس بیان کو تقویت پہنچاتا ہے ۔ دوسری طرف سر سید اسے ۴۶-۱۸۴۵ کے زمانے کی تصنیف بتاتے ہیں جب کہ مرزا صاحب ابھی صحیح معنوں میں بوڑھے نہ ہوئے تھے ۔ بلکہ ان کا سن ابھی پچاس سے بھی کم تھا ۔

چونکہ اس سلسلے میں ان دو بیانات کے علاوہ اور کوئی خارجی شہادت دستیاب نہیں ہو سکی اس لئے ہم مثنوی کے داخلی شواہد کی مدد سے اس کے زمانہ تصنیف کا پتہ چلاتے ہیں ۔

پوری مثنوی پڑھیں تو اس کے ابتدائی حصوں، حمد، نعت اور مناجات کے کسی شعر سے ہمیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ شاعر بوڑھا ہے ۔ لیکن منقبت سے جوں جوں مغنی نامہ اور ساقی نامہ کی طرف جاتے ہیں یہ احساس گہرا ہوتا چلا جاتا ہے ۔ ان آخری حصوں میں بیسیوں شعر ایسے ملتے ہیں ۔ جن سے مرزا کے بڑھاپے اور عالم پیری کی عکاسی ہوتی ہے ۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیے ۔

کنونم که وقت گذشتن رسید زمان بھی باز گشتن رسید

اپنے شباب اور عالم پیر ، کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

نبود ارچه لب هائے خندان مرا ولے در دهن بود دندان مرا

چه گریم که لب هائے خندان کجا جگر خائم ار غصه دندان کجا

ساقی نامہ میں اپنے بڑھاپے کا رونا یوں رویا ہے

ز سر باد پنداری بیرون شده سهی سرو من بید مجنون شده

بود قد خم گشته چوگان من سرم گوئی و اندیشه میدان من

ایک اور شعر بالوں کی سفیدی کے متعلق ہے

سیاهی ز موئی سرم زود رفت مگر کآتش افسرد و کاهی دود رفت

اس حصے میں اپنے بڑھاپے کے احساس کے باوجود غالب نے کہیں کہیں

خم ٹھونکنے اور سنبھالا لینے کی کوشش کی ہے لیکن یہ جوش اور جذبہ قدرے مصنوعی معلوم ہوتا ہے ۔

نتالم ز پیری جوانم ہرائی هنوزم بود طبع زور آزمائی
سخن سنج معنی طرازم ہنوز بسوائے شیوہ نازم ہنوز
ز دل نفس غم سر برون می زند ہنوزم جگر موج خون می زند
ز حرفے کہ اندر ضمیر آیدم ہنوز از دھن بوئے شیر آیدم

ساقی نامہ کے ذیل کے شعر سے اس حصہ مثنوی کے زمانہ تصنیف پر خاصی روشنی پڑتی ہے ۔

ہانا تو دانستہ کز دو سال نوشم مے الا بہ بزم خیال

اس شعر سے صاف جھلکتا ہے کہ مرزا کو شراب کو ترستے ہوئے پورے دو سال ہوگئے ہیں اور یہ ٹھیک ۱۸۵۷ء کے بعد کا دور ہے جب مرزا کو ایک عرصہ تک مالی پریشانیوں کی وجہ سے شراب دستیاب نہ ہو سکی ۔

مندرجہ بالا اسی اور اسی قسل کے اور بہت سے شعروں سے یہ اندازہ لگانے میں ہم حق بجانب ہیں کہ مثنوی کے آخری دس حصے یعنی منقبت ، مغنی نامہ اور ساقی نامہ اس دور کی پیداوار ہیں جب مرزا کو اپنے بڑھاپے کا شدید احساس تھا ۔ اور مرزا واقعتاً بوڑھے ہو رہے تھے ۔ لیکن چونکہ مثنوی کے ابتدائی حصص اس قسم کے احساسات و جذبات سے یکسر خالی ہیں ۔ اس لئے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا ۔ کہ یہ حصے بہت پہلے کے لکھے ہوئے ہیں، اس زمانہ کے جب غالب ابھی بوڑھا نہ ہوا تھا ۔ مثنوی کے جن چند اجزا کا سر سید مرحوم نے ذکر کیا ہے وہ غالباً نعت و مناجات تک کے حصوں پر مشتمل ہونگے ۔ گویا مرزا صاحب کی یہ مثنوی نا تمام کسی ایک سال یا ایک زمانہ میں نہیں لکھی گئی بلکہ ایک لمبے عرصے میں رک رک کر تصنیف ہوئی ۔ اور مرزا نے اس مثنوی کا آغاز یقیناً آثارالصنادید مطبوعہ ۱۸۴۷ء کی اشاعت سے قبل کردیا ہوگا کہ سر سید کو اس کا علم ہوا اور انہوں نے اس کا ذکر بڑے فخر سے اپنی تصنیف میں کیا ۔ لیکن پھر کچھ ایسے حالات رونما ہوگئے ہونگے کہ مرزا کو یہ کام ایک لمبے عرصے کے لئے معطل کرنا پڑا ہوگا ۔ وہ حالات یہ ہو سکتے ہیں۔

مرزا ۱۸۴۷ء میں جوئے بازی کے الزام میں قید ہوئے ۱۔ واقعہ قید سے انکو اس قدر ذہنی کوفت ہوئی کہ ان کا رہا سہا سکون بھی برباد ہو گیا ۔ پھر اس سے ان کی نیک نامی اور شہرت پر جو حرف آیا اس سے ان کا یہ دینی جذبہ بھی مارے شرم کے ٹھنڈا پڑ گیا ہوگا ۔ اس کے بعد مرزا کا دربار شاہی سے کسی قدر تعلق پیدا ہو گیا ۲ ۱۸۵۰ء میں مرزا ''مہر نیم روز'' لکھنے پر مامور ہو گئے ۳ ۔ پھر ولی عہد مرزا فخرو کی استادی کا فخر حاصل ہوا ۔ اس کے جلد ہی بعد ذوق چل بسے اور بادشاہ کے کلام کی اصلاح کا بار بھی انھی پر آن پڑا اس پورے دور میں مرزا انتہائی طور پر عدیم الفرصت رہے بعد ازاں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا ۔ جس کی وجہ سے وہ اقتصادی زبوں حالی اور ذہنی پریشانی کے بہت بری طرح شکار ہوئے ۔ اس دور میں انھوں نے پھر اس عمارت کی تعمیر کی طرف توجہ کی جس کی نیو وہ خود دس بارہ برس پہلے رکھ چکے تھے ۔ اور اس مثنوی کی تمہید کے بقیہ جز معنی نامہ ، ساقی نامہ وغیرہ لکھے تبکہ پھر نامساعد حالات نے آ گھیرا ۔ اور ایسی ایسی پریشانیوں میں مبتلا ہوئے کہ اس مثنوی کو نامکمل چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ۔ اس دور میں انھوں نے دستنبو لکھی ۔ پھر برہان قاطع اور قاطع برہان کے چکر میں الجھ گئے ۔ اس پر مستزاد بڑھاپا ۔ بیماریاں ۔ کلیات و مکاتیب وغیرہ کی اشاعت کی مصروفیت اسی زمانہ میں انھوں نے ۱۲۸۰ھ میں مثنوی ابر گہر بار کو الگ چھپوایا ۔ اور اس پر ایک مقدمہ لکھا ۔ چونکہ یہ کتاب مرزا کے آخری زمانے میں چھپی ۔ اور اس سے قبل مرزا کی اکثر تصانیف شائع ہو چکی تھیں ۔ اس لئے مولانا حالی نے اس مثنوی کی تصنیف کو مرزا کے آخری دور سے منسوب کر دیا ۔ حالانکہ اس کا نصف سے زیادہ حصہ ۱۸۴۷ء سے قبل لکھا جا چکا تھا ۔

مرزا غالب ابر گہر بار لکھ کر فردوسی کے شاہنامہ کا جواب پیش کرنا چاہتے تھے ۔ چنانچہ وہ بڑے زور دار انداز میں کہتے ہیں ۔

---

۱ ۔ حالی ــــ یادگار غالب ص ۵ و ص ۳۲ ۔

۲ ۔ حالی ــــ یادگار غالب ص ۳۴ ۔

۳ ۔ حالی ــــ یادگار غالب ص ۳۶ ۔

ز فردوسیم نکته انگیز تر — ز مرغ سحر خوان سحر خیز تر
فرو مردن شمع ساسانیان — بود صبح اقبال ایمانیان
رقم سنج منسور یزدانیم — ز ایمانیان گویم ایمانیم
کسے را که نارد به بیگانگاں — خرد در شمارد ز دیوانگاں

لیکن ان سارے دعووں کے ساتھ ساتھ مرزا اس راہ کی دشوار گذاری اور ان گھاٹیوں کی خار داری کا بھی احساس رکھتے ہیں ۔ چنانچہ فرماتے ہیں ۔

دریں رہ بسیچ سفرها بسے است — بود راست لیکن خطرہ بسے است
ز پالغزها کاندریں رہ بود — بود رہ دراز ارچہ کوتہ بود
بمستی نوان نغز گفتار بود — مرا باید از خویش هشیار بود
سخن گفتن و پاس راہ داشتن — سخن را ز سستی نگہداشتن

ان اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ دوسرے موانع کے علاوہ مثنوی کی عدم تکمیلیت کا باعث ان دقتوں اور خطرات کا احساس بھی تھا جو ایک خالص مذہبی چیز کو لباس شعر پہنانے میں ہوتے ہیں ۔

مثنوی کے اشعار کی تعداد : زمانہ تصنیف کی طرح مرزا کی اس مثنوی کے اشعار کی تعداد کے بارے میں بھی کچھ اختلاف پایا جاتا ہے ۔ مولانا حالی نے ان کی تعداد ۹۲۸ لکھی ہے ۱ اور مولانا غلام رسول مہر نے انکی تعداد گیارہ سو سے زائد بتائی ہے ۲ حالانکہ کلیات نظم غالب مطبوعہ ۱۲۹۸ھ اور ۱۳۴۳ھ میں انکی تعداد ۱۰۹۳ ہے ۔ لیکن مثنوی ابر گہر بار کے ایک دوسرے نسخہ مطبوعہ اکمل المطابع ۱۲۸۰ھ میں اشعار کی تعداد ۱۰٦۴ ہے ۔ کلیات اور اکمل المطابع والے نسخوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ اول الذکر میں ۲۹ شعر ایسے ہیں جو موخرالذکر میں موجود نہیں ۔

مرزا نے اس مثنوی کی تصنیف میں قدیم فن مثنوی نگاری کو پوری طرح ملحوظ خاطر رکھا تھا ۔ اور اس کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت لکھنا شروع کیا تھا ۔

---

۱ ۔ یادگار غالب ص ۳۳۲
۲ ۔ غلام رسول مہر غالب ص ۳٦۴

عنوان	تعداد اشعار مطابق نسخہ کلیات
حمد	۱۱۴
مناجات و حکایت	۷۹ + ۱۴۵ = ۲۲۴
نعت	۵۷
معراج	۲۸۰
منقبت	۱۲۸
مغنی نامہ	۱۳۰
ساقی نامہ	۱۵۰
میزان اشعار	۱۰۹۳

یہاں ہم ہر حصے کا فرداً فرداً تنقیدی جائزہ لیتے ہیں اور مرزا کی قادرالکلامی، زور بیان اور رفعت تخیل کے مختلف نمونے پیش کرتے ہیں ۔

حمد : مثنوی کا آغاز حمد سے ہوتا ہے اور حمد کی ابتدا ذیل کے شعروں سے ۔

سپاسے کزو نامہ نامی شود — سخن در گذارش گرامی شود
سپاسے کہ آغاز گفتار زوست — سخن چوں خط از رخ نمودار زوست
سپاسے کہ شوریدگان الست — دهندش ببانگ قلم دل ز دست
سپاسے بپوزش در آمیختہ — ز دل جستہ و با دل آویختہ
سپاسے دوئی سوز وکثرت ربائے — سپاسے دل افروز و بینش فزائے
خدا را سزد کز دروں پروری — بدیں شیوہ بخشد شناساوری
خدائے کہ زانگونہ روزی دھد — کہ ہم روزی و ہم دو روزی دھد

مرزا غالب نے حمد میں شاعری کا ایک بلند معیار قائم کیا ہے جو مناجات میں پہنچ کر اور بھی بلند ہو جاتا ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے اشعار رسمی ہیں ۔ اور چونکہ اس مضمون میں متقدمین و متوسطین نے اس قدر کہا ہے کہ اچھوتے مضمون پیدا کرنا اور کسی نئے خیال کا پیش

کرنا کچھ آسان نہیں ۔ اس لئے مرزا مجبور تھے کہ پرانے خیالات کو لفظوں کے رد و بدل سے نیا روپ دے دیں ۔ مرزا صاحب کے اشعار کی لفظی در و بست نہایت عمدہ ہے اور فرسودہ مضامین بھی جب ایک نئے رنگ میں ہمارے سامنے آتے ہیں تو ایک نئی بہار دے جاتے ہیں ۔ لیکن ایسے اشعار بھی ایک خاصی تعداد میں موجود ہیں جو بالکل جدید و نادر ہیں ۔ قارئین کی ضیافت طبع کے لئے چند ایک یہاں نقل کئے جاتے ہیں ۔

دوئی بے کفِ مردهٔ در رهش خودی دادگر شحنهٔ درگهش

اگر جلوه روشن در آواز خوش خم رنگ خوش پردهٔ ساز خوش

جهان جیست آئینه آگهی فضائی نظر گاه وجه اللهی
نه هر سو که رو آوری سوئے اوست خود آن رو که آوردهٔ روئے اوست

پوری حمد میں مرزا کا انداز ثناگوئی حکیمانہ ہے ۔ وہ اپنے قارئین کو خدا کی جھلک اس انداز میں دکھاتے ہیں کہ اسے چشم بصیرت اور نور عقل سے دیکھا جا سکے ۔ ان کے نزدیک اللہ کو عقلی طور پر سمجھنا اس لئے ضروری ہے کہ عقل اس نے پیدا ہی اس غرض کے لئے کی ہے کہ اسے پہچانا جا سکے ۔

بدانش ترا دیده‌ور کرده اند چراغی درین بزم بر کرده اند
خرد کز جهانیست پیشش خبر بنا شد ز عنوان خویشش خبر
نه بیند جز این هیچ بینندهٔ که ما را بود آفرینندهٔ

مرزا نے حمد میں اپنی نگاہ ژرف بیں کی بدولت علم و حکمت کے خوبصورت اور چمکدار موتی بکھیرے ہیں ۔ انہوں نے انسانی جذبات سے زیادہ انسانی عقل و ہوش کو خطاب کیا ہے ۔ اور خدا کے وجود اور اس کی یکتائی کو ایک سلجھے ہوئے انداز میں پیش کیا ہے ۔ آتش پرست، سورج کے پجاری، خدا کی تلاش میں جنگل جنگل پھرنے والے، بتوں کو سجدہ کرنے والے ان کے نزدیک سب ایک ہی معبود حقیقی کے پیرو اور متلاشی ہیں ۔ صرف فرق یہ ہے کہ وہ

نادانی کے باعث راستے میں کھو گئے ورنہ ان کا منتہائے مقصود وہی ہے جو ایک موحد خدا پرست کا ہے۔

نظر گاہ جمع پریشاں یکیست   پرستندہ انبوہ و یزداں یکیست
کدامی کشش کان اراں سوئے نیست   بد و نیک را جز بوے روئے نیست

مرزا کے نزدیک نالہ نے اور شور می سب اسی ذات ایزد کی بدولت ہے۔ وہ ذات جو روح کو عقل و دانش کے موتیوں سے آراستہ کرتی ہے وہ ذات جو دنیا کو ایک دستور پر قائم کئے ہوئے ہے۔ وہ ذات جو اپنے متلاشیوں کو اپنا راستہ دکھانی اور خوف زدوں کے غم اور خوف کو دور کرتی ہے۔ بادلوں کی اشک باری اور بجلی کی بے قراری سب اسی کے دم سے ہے۔ وہ دلوں کے بھید اور خاموش زبانوں کے رازوں سے واقف ہے۔ اس کی شراب الست کے ایک گھونٹ سے کائنات کا ہر ہر ذرہ رقص میں ہے۔ مناجاتی اس کی ہار ادا کر رہے ہیں۔ اور حرامی بھی اس کی پرستش میں مصروف۔ ہر ہونٹ اس کی تعریف میں نغمہ ریز ہے اور ہر سر اس کے خیال میں مست۔

پوری حمد کے مفہوم و مطالب کو بیان کرنا طوالت مضمون کو دعوت دینا ہے لہذا ہم حمد سے مناجات کی طرف اقدام کرتے ہیں۔

مرزا کی اس مثنوی میں ایک بات بڑے مزے کی ہے۔ اور وہ یہ کہ مثنوی کے ایک حصے کا اس کے دوسرے حصے سے گہرا ربط پایا جاتا ہے۔ اور وہ دو مختلف حصوں کو اس طرح مربوط کر دیتے ہیں۔ جس طرح ایک قصیدہ نگار تشبیب اور مدح کے اشعار کو۔ وہ حمد کے آخری چار شعروں ہی میں پتہ دے رہے ہیں کہ اب وہ مناجات شروع کرنے والے ہیں۔

چوں ایں جا رسیدم، ہمایوں سروش   بمن بانگ برزد کہ غالب خموش
بپاشید در لرزہ بندم ز بند   تپاں ہم چو بر روئی آتش سپند
چو از وی پزیرائے راز آمدم   مناجات را پردہ ساز آمدم
بساز نیایش شدم زخمہ ریز   بداں تا بدینساں کنم زخمہ تیز

مناجات: ہمارے خیال میں مرزا کی جملہ مثنویات میں عموماً اور اس مثنوی میں خصوصاً یہ حصہ ایک منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ مناجات

میں ھمیں وہ زور بیان اور جوش جذبات نظر آتا ہے کہ باقی حصے اس سے خالی ہیں ۔ در حقیقت مرزا اپنی نفسیاتی کیفیات کو اجاگر کرنے کی اس لاشعوری منزل میں تھے جہاں انکی رندی، بے باکی، طنز اور نک گونہ بے خودی خود بخود پھوٹی پڑتی ہے ۔ مناجات پڑھتے وقت یہ معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ناکردہ گناہوں کی داد نہ ملنے پر فریاد کر رہے ہوں ۔ اور لطف یہ ہے کہ مناجات کے لئے انہوں نے حمد کی منزل سے قریب تر کوئی جگہ نہ پائی حالانکہ حمد کے بعد نعت پھر منقبت مثنوی کی قدیم روایت ہے ۔ لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب حمد کہتے کہتے اپنے خلوص اور جذبات کی الجھنوں میں پھنس گئے اور کچھ ایسے کھوئے کہ لب حمد گو نے ساز شکوہ و عذر آفرینی چھیڑ دئے ۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ یہاں حمد سے زیادہ کامیاب ہوئے ہیں ۔ اور اس کا احساس انہیں خود بھی ہے ۔ دیباچہ میں اس کے متعلق لکھتے ہیں ۔

''بسا سخنہائے دلاویز و مہرانگیز گفتہ آمد وینہا در مناجات بہ شیوۂ ابداع بداں معنی رندانہ و قلندرانہ سخن سرودہ شد کہ سروشاں ہمی را لب از شور ہایا ہوئی نے خالہ زد ۔ ''[۲]

علامہ اقبال کے شکوہ اور مرزا غالب کی مناجات ساتھ ساتھ پڑھنے سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اگر مسدس حالی نے علامہ کو متاثر کیا تھا ۔ تو مرزا کی مناجات بھی ضرور ان پر اثر انداز ہوئی ہوگی ۔ مناجات اور شکوۂ اقبال میں ایک طرح کی مماثلت نظر آتی ہے وہاں بھی خدا سے گلے اور شکوے ہیں اور یہاں بھی خدا سے شکائتیں اور طعن آمیز باتیں ہیں ۔ لیکن دونوں میں اتحاد مضمون ہوتے ہوئے بھی نقطہ نظر کا بڑا فرق ہے ۔ اقبال کا شکوہ ایک قومی احساس اور اجتماعی نظریہ کے تحت لکھا گیا ۔ بخلاف اس کے غالب کا شکوہ، جو مناجات کا سب سے اہم اور دلچسپ حصہ ہے بالکل ذاتی اور انفرادی خیالات و جذبات کا حامل ہے ۔ غالب کا شکوہ ایک شاعر کا شکوہ ہے ۔ رند کا شکوہ ہے ۔۔ اقبال کا شکوہ ایک فلسفی کا شکوہ ہے ۔ ایک قلندر کا شکوہ ہے ۔ غالب کے شکوہ کا مرکز اس کی ذات ہے ۔ اقبال کے شکوہ کا مرکز اس کی قوم اور ملت ہے ۔

---

۲ - غالب - مثنوی ناتمام موسوم بہ ابرگوہر بار (اکمل المطابع ۱۲۸۰ھ) صفحہ ۳

خطاب دونوں کا خدا سے ہے - دونوں کے لہجے میں تلخی آ گئی ہے - دونوں دربار الہی میں بے باکی سے گفتگو کرتے ہیں - اور بڑے بے تکلف دوست معلوم ہوتے ہیں -

اگرچہ ان تمام خصوصیات کو اچھی طرح واضح کرنے کے لئے پوری مناجات دیکھنے کے قابل ہے - لیکن ہم انتخاب پر اکتفا کرتے ہیں -
آغاز مناجات ملاحظہ ہو -

خدایا زبانے کہ نحسیدۂ	بہ نیروئی جانے کہ بخشیدۂ
دما دم بہ جنبش گراید ہمی	ز راز تو حرفی سراید ہمی
نہ آخر سخن را کسائس ز تست	نہ تا بود چندیں تپائس ز تست
چہ باشد حسن پردہ ہا ساختن	سگالی سحر پردہ انداختن
بدیں روئے روشن نقاب از چہ رو	چو کس جز تو نبود حجاب ازچہ رو

مناجات کا ابتدائی حصہ تمہید کی حیثیت رکھتا ہے اور توصیف و تمجید پر مشتمل ہے - تمام شعروں میں ایک خاص انداز میں خدا کی بزرگی اور برتری بیان کی گئی ہے اب اگر ایک عام شاعر ہوتا تو تمجید کے بعد فوراً اپنی گذارشات کو بیان کرنا شروع کر دیتا - لیکن ہمارا شاعر محض موزوں فکر نہیں بلکہ فن کار ہے وہ اپنے قاری و سامع کی ذہنی کیفیات کو پیش نظر رکھتا ہے - وہ جانتا ہے کہ انسانی ذہن کے سامنے اگر رنگینی، طرفگی اور تنوع نہ ہو تو وہ بور ہو جاتا ہے - حکایت دراز وہی کامیاب ہو سکتی ہے جو لذیز بھی ہو - اور ایک اچھے فن کار کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے تیشہ فن سے فکر کے بے ستون کاٹ کر دلکشی کے چشمے نکالتا اور کیف آور مناظر تیار کرتا ہے - جسے دیکھ کر اکتاتا ہوا کیجا نگاہ ناظر دنگ اور زبان نقاد واہ واہ کرنے لگتی ہے - کسی سپاٹ کہانی اور رنگین قصہ میں یہی تو فرق ہوتا ہے - قصہ بجائے خود کوئی حقیقت نہیں رکھتا - یہ ایک فنکار کا قلم ہے جو اس میں خوبی پیدا کرتا ہے - ایک دلچسپ اور دلفریب کہانی ایک انجان قصہ گو کے ہاتھ میں آکر بے مزہ اور سپاٹ ہو جاتی ہے اور ایک عام اور فرسودہ بات ایک فن کار شاعر یا انشا پرداز کے ہاتھوں بامزہ اور پرکیف صورت اختیار کر لیتی ہے -

بالکل یہی بات پیش نظر مناجات میں ہے ۔ دعا ہر آدمی کرتا ہے عام انسان بھی اور شاعر بھی ۔ داستان گو بھی اور انشاپرداز بھی ۔ لیکن ہر ایک اپنے اپنے مخصوص انداز اور مرعوب رنگ میں۔ پھر مناجات ایک ایسی چیز ہے جو ہر شخص کی ذات خاص سے تعلق رکھتی ہے ۔ اس میں جامعیت اور دلچسپ ہمہ گیری پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں ۔

مرزا غالب ان سب باتوں کو ذہن میں رکھتے ہیں ۔ ان کی طبعیت رواں ہے ۔ خیالات میں جولانی ہے ۔ ذہن جوش سے ابلا پڑتا ہے ۔ وہ ایک آتش بازی کے انار کی طرح گندھک اور پٹاس سے نہیں بلکہ دکھوں اور دردوں سے بھرے پڑے ہیں ان کی ہزاروں خواہشیں ایسی ہیں جو شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکیں ۔ سیکڑوں تمنائیں گردش ایام کی نذر ہو گئیں ۔ وہ دل میں حسرتوں کا طوفان لئے ہوئے ہیں ۔ انہیں اپنے گناہوں کا اعتراف بھی ہے ۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ عمر بھر کوئی نیکی کا کام نہ ہوا۔ حشر کے میدان کا خیال آتا ہے تو روح کانپ جاتی ہے ۔ ایک طرف دوزخ ہے ۔ دوسری طرف جنت اور ادھر حضرت غالب جو دوزخ سے خائف لیکن جنت سے غیر مطمئن ، خالص زمینی اور ارضی انسان ۔ دنیا اور اس کی لذتوں کے مائل ۔ دنیوی حسن کے عاشق ۔ یہاں کے مہ وشوں کو حوران بہشتی پر ترجیح دینے والے !

ان سب باتوں کو ذہن میں رکھئے اور ذرا تصور فرمائیے کہ غالب مناجات کو کس انداز میں پیش کریں کہ اپنے دل کا غبار بھی نکال لیں ۔ طبعیت کا بوجھ بھی ہلکا کر لیں ۔ علم و بصر خدا کے سامنے ایک دفعہ اپنے تمام گلے اور شکوے بھی بیان کر دیں اور اس پہ مستزاد یہ کہ دوزخ سے بھی چھٹکارا حاصل ہو جائے ۔ جنت انہیں ملے یا نہ ملے اس کی انہیں کچھ ایسی پرواہ نہیں !

حکایت: غالب ایک طرف تو قاری کے ذہن کو مصروف رکھنا چاہتے ہیں ۔ اور دوسری طرف خدا کو ایک کہانی اور ایک تمثیل سنا کر اپنی بخشش کروانا چاہتے ہیں ۔ وہ عام سائلوں کی طرح سوال کرنا نہیں جانتے۔ بلکہ ایک فن کار کی طرح اپنی بات اور حاجت ''در حدیث دیگراں،، بیان کرنے کے عادی

هں ۔ چنانچه وه ایک حکایت شروع کر دیتے هیں ۔ یہاں یه عرض کر دینا مناسب هوگا که اس حکایت سے جہاں وه قاری کی دلچسپی کی برقراری اور اس کی ذوق تسکین اور اپنی مطلب برآری کو ملحوظ رکھتے هں ۔ وهاں وه شعوری طور پر اپنے زور بیان کی داد حاصل کرنے کے بھی درپے هیں ۔ فردوسی کی تقلید میں اس کا خاص انداز اپنا کر اپنی قدرت بیان اور ندرت ادا کا خراج تحسین حاصل کرنے کے متمنی هں ۔ حکایت کا آغاز ان اشعار سے هوتا هے ۔

شنیدم که شاهی دریں دیر ننگ　　ز پهلو بروں راند لشکر بجنگ

گزیں شهسواراں عناں بر عناں　　سهیں نیزه داراں سناں بر سناں

به پیچش ز چرمیں عناں هائے سخت　　زحل را بدلو اندروں پاره رخت

ملاحظه فرمائیے غالب موقع کی مناسبت سے ایسے الفاظ لاتے هیں جن سے صوتی اعتبار سے ایک دبدبه اور هیبت ظاهر هوتی هے۔ مثلا سهیں ، گزیں ، اورنگ ، لشکر بجنگ ، نیزه دار ، عناں هائے سخت ، بدلو ، افسر ، وغیره ۔ اس حکایت کا خاکه یه هے که ایک بادشاه اپنے دشمن سے نبرد آزما هونے کے لئے ایک عظیم‌الشان فوج کو ساتھ لیکر روانه هوتا هے ۔ اور اپنے حریف پر فتح حاصل کرتا اور ایک فیاض فاتح کی طرح تمام مال غنیمت لشکریوں میں بانٹ دیتا هے ۔ واقعه نگاری اور منظر نگاری مرزا کے لئے مقصود بالذات تھی یا نہیں لیکن یہاں اس قسم کے اچھے نمونے ضرور نظر آ رهے هیں ۔ مثلا لشکریوں کے نیزوں کی قلمی تصویر ملاحظه فرمائیے

بجنبش ز رخشاں سنانهائی تیز　　بروی هوا نور خور نور ریز

یعنی ایک تو نیزوں کی چمک اور پھر ان کی تیزی که نور خورشید پاره پاره هوا جاتا هے ۔ یہاں تشبیه مرکب نے شعر کو ڈھلکتا موتی بنا دیا هے ۔

بادشاه فتح کے نشے میں سرشار ملک کو واپس لوٹتا هے اور دستور کے موافق آگے آگے ایک قاصد کے هاتھ یه حکم بھیجتا هے که فتح کی خوشی میں شہر میں چراغاں کیا جائے ۔ شہر کی آراستگی کا منظر مرزا کے فنکارانه موئے قلم کا مرهون منت هے ۔

هم از شام مشعل بر افروختند   امیناں به کوشش نفس سوختند
به مہتاب شستند سیائے خاک   فشاندند پرویں به دیبائے خاک

دیکھئے زمین کی پسائی کو چاند سے دھونا اور پھر خاک رشم پر پرویں کی پچی کاری کیسا لطیف اور اچھوتا خیال ہے ۔

به بازارها سو بسو صف بصف   به پیرایه بندی کشودند کف
ز هر پرده نقشے بر انگیختند   بهر گوشه چینی در آویختند
بداں گونه آئینه‌ها ساختند   که بینندگاں چشم و دل باختند
سحرگاه چوں داد بار آفتاب   ز هر گوشه سرزد هزار آفتاب

بازاروں کو آئینوں سے مرصع کرنا اور پھر طلوع آفتاب نہیں بلکه بار آفتاب کے وقت ہزاروں آفتابوں کا طلوع اور جلوہ آرائی کتنی عمدہ نسبه اور نازک خیال ہے ۔ یہی نہیں بلکه راستوں کی سجاوٹ کے لئے سمندروں سے سیپیاں اٹھ اٹھ کر کناروں پر موتی بکھیر رہی ہیں ۔ اور زمیں اپنے جوش سے اپنی کانوں میں چھپے ہوئے جواہر اگل رہی ہے ۔ مرزا نے الفاظ کے جادو سے منظر کو آئینه خانه بنا دیا ہے ۔ سارا شہر دلہن کی طرح آراسته ہے ہر شخص خوش اور مسرور ہے ۔ ہر طرف مسرتوں کے قہقہے بلند ہو رہے ہیں اور خوشیوں کے پھول مسکرا رہے ہیں ۔ لیکن ایسے میں ایک گوشه ایسا بھی ہے جہاں کچھ قیدی کھڑے ہیں ۔ مرزا نے ان قیدیوں کی مرقعه نگاری خوب کی ہے ۔ ملاحظه فرمائیے ۔

گروہے ز بےمایه زندانیاں   علی‌الرغم نوکسه سامانیاں
بر اجزائے تن جا بجا بند سخت   بهر بند لختے ز بن لخت لخت
نفس گرم شغل حراغاں ز آه   ز گرمی خس و خار سوزاں براه

اتنے میں بادشاہ شہر کا چکر کاٹتا پوری شان و شوکت اور جاہ و جلال کے ساتھ ان خونی جگر اور خسته حال لوگوں کے پاس آنکلتا ہے ۔ جونہی یہ قیدی بادشاہ کو دیکھتے ہیں اپنے آنسوؤں کے موتی اس پر نچھاور کرنے اور اپنی خون شدہ حسرتوں کے یاقوت دل کے خوانوں میں سجا کر پیش کرتے ہیں ۔

ز اشک فرو خوردہ مشتی گہر ملک را فشاندند بر رہگذر
ز خون گشتہ پنہاں ہوسہائے خویش کشیدند خوانہائے یاقوت پیش

بادشاہ ان کی اس بے کسی اور پریشانی کی حالت سے بہت متاثر ہوتا ہے اور ان پر رحم کھا کر ان کی رہائی کا حکم دے دیتا ہے اور انہیں لعل وجواہر عطا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ خستہ دل لوگ بھی تو آخر میرے ہی ہیں -

که اینان جگر خستگان من اند به آهن فروستگان من اند
لباس از گلیم و زر از آهن است گر آهن ز من ور گلیم از من است
نیا ورده اند آنچه آورده اند زمن برده اند آنچه آورده اند
ازآن روکه در تب ز تاب من اند هماں ذرهٔ آفتاب من اند

یہاں آکر یہ حکایت ختم ہوجاتی ہے اور مرزا کی التجا اس خدا سے شروع ہوتی ہے جو اس جیسے ہزاروں رحم دل بادشاہوں کا خالق ہے جو اس جذبہ رحم و کرم کا پروردگار اور بے شمار خونی جگروں کا واقف اسرار ہے -

اعتراف گناہ : چنانچہ وہ خدائے قدوس سے عرض کرتے ہیں -

تو نیز اے که هر چیز و هر کس ز تست بهار و خزاں و گل و خس ز تست

آگے کہتے ہیں کہ اے خدا جب میدان حشر میں سب لوگ تیرے حضور میں جمع ہوں اور اپنی نیکیوں پر مفتخر اپنے اپنے اعمال کے درہائے شہوار تیرے سامنے پیش کریں تو اس ہنگامے میں شرم کے مارےاور خستہ دل لوگوں کے گروہ میں ایک میں بھی ہونگا جس نے ساری عمر رنج و مصیبت میں بسر کی یہاں مرزا کی اپنی خستہ حالی کا بیان خود انہی کے الفاظ ہیں سنیے !

در آن حلقه من باشم و سینهٔ ز غمهائے ایام گنجینهٔ
در آب و در آتش بسر بردهٔ زدشواری زیستن مردهٔ
تن از سایهٔ خود به بیم اندروں دل از غم به پهلو دو نیم اندروں
ز ناسازئی و ناتوانی بهم دم اندرکشاکش زپیوند دم

اس کے بعد غالب اپنی بخشش کی درخواست پیش کرتے ہیں - جو رندانہ عاجزی، پر اعتبار ناز اور ایک لطیف طنز کا دلچسپ مرکب ہے - کہتے ہیں

به بخشائے بر ناکسیهائے من   تهی دست و درمانده ام وائے من
مدوش ترازو منه بار من   نسنجیده بگزار کردار من
بکردار سنجی میفزائے رنج   گر انباری درد عمر بسنج

کیونکه ع "مرا مایه عمر رنج است و درد"۔ کس حسرت بھرے لہجے میں مرزا نے یه مصرعه کہا ھے جو انکی پوری داستان حیات کا غماز ھے ۔ پھر کہتے ھیں که میں تو دم سرد کی وجه سے منطقه زمہریر ھوں ۔ اور آگے دیکھئے کس بھول پن سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تجویز پیش کرتے ھیں

به پرسش مرا درهم افشرده گیر   پر کاه را صرصر برده گیر
پس آنگه بدوزخ فرستاده داں   درآتش خس از باد افتاده داں

مرزا کہتے ھیں که مجھے قیامت کی بازپرس سے مستثنٰی رکھ اور یه سمجھ لے که مجھ سے بازپرس ھو چکی اور ایک پرکاہ کو باد صرصر لے اڑی اور یه فرض کرے که میں دوزخ میں بھیجا جا چکا اور ھوا سے ایک تنکا دھکتی آگ میں گر چکا ۔

عذر گناہ : مرزا کہتے ھیں که اگر مجھ سے باز پرس کرنا ضروری ھے تو پھر اے خدا مجھے بھی صفائی کا موقعه دے ۔ اب تک تو غالب مناجات کے صرف ایک پہلو پر ھی زور دے رھے تھے ۔ یعنی یه که بغیر حساب کتاب کے ھی چھٹکارا ھو جائے لیکن جب اس طرح سے چھٹکارا ھوتا نظر نہیں آتا تو پہلو بدل کر اپنی صفائی کے لئے آگے بڑھتے ھیں ۔ اب وہ محض ملزم نہیں رھتے بلکه ملزم کے ساتھ ساتھ وکیل بھی بن جاتے ھیں ۔ انداز میں شوخی پیدا ھوجاتی ھے ۔ گذارش کا لہجه گستاخی میں تبدیل ھونا شروع ھو جاتا ھے ۔ اب اپنی صفائی میں وہ گلے بھی کریں گے اور شکوے بھی ۔ اپنی بے بسی اور قدرت کی ستم ظریفی یه سب چیزیں بیان ھوکر رھینگی ۔ لیکن لطف یه ھے که وہ اس بحث اور شکوے کے لئے بھی طاقت گفتار کی درخواست خدا ھی سے کرتے ھیں ۔

مرا نیز یارائے گفتار ده   چوگویم بر آں گفته زنہار ده
دریں خستگی پوزش از من مجوئی   بود بندۂ خسته گستاخ گوئی

دل از غصه خوں شد نهفتن چه سود چو تا گفته دانی نه گفتن چه سود،
زباں گرچه من دارم اما ز تست به تست ار چه گفتارم اما ز تست

حسرتوں کی فہرست : اس کے بعد عرض کرتے ہیں کہ تو جانتا ہے کہ
کہ نہ میں کافر ہوں نہ سورج کا پجاری اور نہ بت پرست
نہ میں ڈاکو ہوں نہ قاتل۔ ہاں ایک عیب مجھ میں ہے کہ شراب
پیتا ہوں۔ اور یہی باعث ہے میری زندگی کے بقا کا۔ میں غم‌زدہ ہوں اور شراب
غم ربا ہے۔ اگر شراب نہ پیوں تو کیسے جیئوں اگر تجھے شراب اور عیش و
وعشرت کا حساب و کتاب لینا ہے تو جمشید سے لے۔ بہرام سے لے۔ پرویز سے لے
نہ کہ مجھ سے کہ جس نے کبھی کبھار بھیک مانگ کر شراب سے اپنا منہ
کالا کیا۔ بھلا ایسی شراب نوشی کا محاسبہ چه معنی دارد۔ جس میں نہ شراب خانہ
میسر ہو ، نہ گل و گلشن ہو ، نہ محبوب ہو اور نہ محفل رقص و سرور ــــ
اور پھر ایسی شراب جو رات کو پی تو صبح کو اس کے عوض خون جگر کی قربانی
دینا پڑی ـــ ہائے بادہ نوش معشوقہ کی تمنا اور شراب فروش کے تقاضائے دام ـــ
کیا بتاؤں کہ یہ عمر عزیز کس طور بسر ہوئی۔ بہتیرے دن بغیر معشوق کے
گذرے اور کتنی بہاریں بلا شراب کے بسر ہوئیں۔ متعدد برساتیں اور چاندنی راتیں
شراب و شاهد کی عدم موجودگی میں کٹیں۔ ہائے وہ کیا حسرت بھرے دن تھے
کہ آسمان پر کبھی بدلیاں ہوتی تھیں اور کبھی چاند اور میرا جام ان دونوں
وقتوں میں خالی ہوتا تھا۔ وہ کیسی بہاریں تھیں کہ جن میں، میں نان و نفقہ
کے لئے ترسا کرتا تھا۔ دنیا گل ولالہ سے مزین اور رنگ و بو سے دلاویز ہوتی تھی
اور میں اپنے حجرہ میں پڑا کڑھا کرتا تھا۔ ان عیش کے ہنگاموں میں مجھے
رقص بسمل کے سوا کچھ حاصل نہ تھا۔ اور یہ بھی خواہش دل کی مقدار کے
مطابق نصیب نہ ہوا۔ بھلا یہ بھی کوئی نصیب تھے کہ اگر بغیر شراب کے
تڑپا تو جان گئی اور اگر شراب میسر آئی تو پیالہ ٹوٹ گیا ـــ اے خدا تو میری
شراب آلود گدڑی دیکھ کر کیا کرے گا۔ میرا شراب کی ٹوٹ میں ٹوٹا ہوا جسم
دیکھ لے ـــ عمر بھر ہمسایوں سے نہ بنی۔ کم مایہ لوگوں سے بھیک مانگتا رہا۔
نالائقوں کے احسان تلے دب کر رہ گیا۔ تو نے مجھے ساری عمر بے نوا رکھا۔

اور اسی وجہ سے میرا دل گرفتار تمنا رہا۔ یہی باتیں غالب کے چیدہ چیدہ شعروں میں سنیئے تا کہ شراب دوآتشہ کا لطف پیدا ہو۔

ہمانا تو دانی کہ کافرنیم	پرستار خورشید و آذر نیم
نکشتم کسے را بہ اهریمنی	نبردم ز کس مایہ در رہزنی
بگرمی کہ آتش بگورم ازوست	بہنگامہ پرواز مورم ازوست

"آتش بگورم ازوست، اور "پرواز مورم ازوست، منتہائے بلاغت ہے۔ نشہ شراب سے جو عارضی نشاط اور امنگ پیدا ہوجاتی ہے اس کو پرواز مور سے بہتر کسی استعارے میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ کیونکہ جس طرح چیونٹی کی پرواز اس کی موت کی علامت ہے اسی طرح نشہ شراب کا عارضی نشاط آخر کار موجب ہلاکت ہوتا ہے،،(۱)

من اندوہ گیں و می اندوہ ربائی	چہ میگردم اے بندہ پرور خدائی
حساب می و رامش و رنگ و بوئی	ز جمشید و بہرام و پرویز جوئی
نہ از من کہ از تاب می گاہ گاہ	بدریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ
نہ بستانسرائے نہ می خانہ	نہ دستانسرائے نہ جانانہ
نہ رقص پری پیکراں بر بساط	نہ غوغائے رامشگران در رباط

غالب کا زمزمہ شکایت ابھی ختم نہیں ہوا۔ اب جب بات چل نکلی ہے تو پھر کیوں نہ وہ دل کی ساری بھڑاس نکال لیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ تو نے مجھے کون سی بادشاہی بخشی تھی کہ مجھ سے حساب کتاب مانگ رہا ہے۔ اور کون سے تو نے مجھے سونے سے لدے ہوئے ہاتھی دئے کہ جب ہاتھی آتے تو میں سونا چاندی فقیروں میں بانٹ دیتا(۲) پھر وہی معشوق کا حسرت سے ذکر کرتے اور کہتے ہیں۔

بداں عمر ناخوش کہ من داشتم	ز جاں خار در پیرہن داشتم
چودل زین ہوسہا بجوش آمدی	زدل بانگ خونم بگوش آمدی

۱۔ حالی — یادگار غالب صفحہ ۳۲۔

۲۔ ظہوری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب اس نے ساقی نامہ پیش کیا تو جواہرات سے لدا ہوا ہاتھی انعام میں پایا یہاں غالباً اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

هنوزم ہماں دل بجوش اندرست | ز دل بانگ خونم بگوش اندرست
چوں آں نامرادی بیاد آیدم | بفردوس هم دل نیا سایدم
دلی را که کمتر شکیبه به باغ | در آتش چه سوزی نسوزنده داغ
صبوحی خورم گر شراب طهور | کجا زهرۂ صبح و جام بلور
دم شبرو یہائے مستانه کو | ہہنگامه عوغائے مستانه کو

جنت پسند نہیں : مرزا غالب کا بیان یہاں ختم نہیں ہو جاتا بلکه وه رندانه شوخی اور انتہائے جرأت سے آگے بڑھتا ہے اور اس بہشت پر بھی ہل پڑتا ہے جس کی خاطر لوگ عمر بھر عبادتیں کرتے ہیں ۔ چنانچه مرزا کہتے ہیں که اس سپاٹ پاکیزه شراب خانے یعنی جنت میں ہاؤ وہو کی گنجائش کہاں ہوگی اور وه مے خانه کیا جس میں ناؤ نوش کا ایک ہنگامه اور پکڑ دھکڑ نه ہو۔ وه ابرو باراں کی سیه مستی کہاں ہو گی ۔ جس باغ میں خزاں نه ہو وہاں بہار بے کیف ہوتی ہے ۔ جس حور کے متعلق غم ہجرنه ہوگا۔ دوق وصال کہاں سے آئے گا۔ ان جانے پہچانے معشوق سے محبت کیا مزه دے گی ۔ اور ایسا وصل کتنا بے لطف ہوگا جس میں انتظار کی لذت نه ہوگی۔

غالب کہتے ہیں ہمیں تو ایسے محبوب کی تمنا ہے جو دم بوسه گریز کرے اور قسمیں کھا کھا کر فریب دے ۔ غالب کسی شوخ وشنگ محبوب کے متمنی ہیں نه که ایسے معشوق کے جو فرماں بردار ہو اور تلخ گوئی کی بھی مجال نه رکھتا ہو اب غالب کھل کھیلے ہیں ۔ ان کا بیان ابتدال کی حدوں کو چھوتا ہوا آگے بڑھتا ہے ۔ وه کہتے ہیں که آنکھیں لڑانا، نظر بازی اور ذوق دیدار بھلا بہشت میں کہاں میسر آئے گا ۔ وہاں تو روزن دیوار ہی نہیں ہوگا وه دلاله کی چشم آرزومند اور ماه پرکاله کا دل تشنه بہشت میں کہاں نصیب ہونگے۔

در آں پاک مے خانه بے خروش | چه گنجائی شورش نائی و نوش
سیه مستی ابر باراں کجا ؟ | خزاں چو نباشد بہاراں کجا ؟
اگر حور در دل خیالش که چه ؟ | غم هجر و ذوق وصالش که چه؟
چه منت نہد ناشناسا نگار ؟ | چه لذت دهد وصل بے انتظار ؟

گریزد دم بوسہ اینش کجا ؟ فریبد بہ سوگند وینش کجا ؟
نظر بازی و ذوق دیدار کو ؟ بفردوس روزن بہ دیوار کو ؟
نہ چشم آرزومند دلالہ ! نہ دل تشنہ ماہ پر کالہ !

غالب کا بہشت کے متعلق یہ نظریہ ان کے اردو شعروں میں بھی بیان ہوا ہے اور یہ نظریہ بڑا دلچسپ ہے - کہتے ہیں

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں ایسی جنت کو کیا کرے کوئی

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاق نسیاں کا

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی
ہمکو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
وہ چیز جس کے لئے ہو ہمیں بہشت عزیز سوائے بادۂ گلفام و مشکبو کیا ہے

غالب نے اس قسم کے خیالات وجذبات کا اظہار اپنے خطوط میں بھی کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں -

"میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی - اقامت جاودانی ہے اسی نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے - اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے - ہے ہے ! وہ اجیرن ہوجائے گی - طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی - وہی زمردین کاخ - وہی طوبیٰ کی ایک شاخ - چشم بد دور - وہی ایک حور (۱) "

بہشت کے متعلق ان خیالات کا اتنے مواقع پر اظہار محض سرسری اور سرا ہے قسم کی چیز نہیں ہوسکتی بلکہ ان کی تہ میں غالب کا ذہن پوری طرح بے نقاب ہوتا نظر آتا ہے -

علم نفسیات کی رو سے جنت اس دنیا سے مایوس لوگوں کے لئے ایک سہارا کی حثیت رکھتی ہے - جنت عوام کی ان آرزوؤں کا خواب ہوتی ہے جو ان کی دنیوی زندگی میں شرمندہ تکمیل نہ ہوسکی ہوں - جب اس دنیا میں ہماری خواہشات بر نہیں آتیں تو ہم اس امید پر جئے جاتے ہیں کہ چلئے بہشت میں

---

(۱) - غالب - عود ہندی - خط بنام مرزا حاتم علی مہر ص ۱۱۴

ان چیزوں سے بہتر چیزیں هاتھ آ جائیں گی ۔ لیکن غالب ایک حقیقت پسند انسان هیں ۔ وہ جن چیزوں سے اس دنیا میں محروم رهے اور جن خواهشات کے ارمان میں وہ یہاں تڑپتے رهے وہ انھیں جنت میں بھی پوری هوتی دکھائی نہیں دیتیں وہ یہاں کسی ستم پیشہ ڈومنی کی یاد میں تڑپتے رهے اور کسی نظر باز شوخ و شنگ محبوبہ کو ترستے رهے ۔ اب جب وہ جنت کے محبوب کا سہارا لینے کی کوشش کرتے هیں تو ان کے ذوق محبت کی تسکین نہیں هوتی ۔ جنت میں تو هوس کالعدم هوگی اور مرزا ٹھیرے خالص زمینی هوس کے بندے ۔ وہ دنیا کو واقعاتی رنگ میں دیکھنے کے قائل هیں ۔ خیالی یا روحانی دنیا سے انہیں کوئی واسطہ نہیں ۔ دنیا کی شراب انہیں جی بھر کر پینا نصیب نہ هوئی وہ جنت کی شراب طہور کی آس میں کس طرح مطمئن هوجائیں وہ بے کیف اور کم تلخ شراب کے قائل نہیں هیں ۔ ان کا ایک شعر ہے

تا بادہ تلخ تر شود وسینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

غالب کے بہشت کے متعلق یہ خیالات اس وجہ سے بھی هو سکتے هیں کہ جنت ایک لالچ ہے جو لوگوں کی عبادت کا مقصود اور مرکز قرار پا گیا ہے اور جس سے عبادت کا اصل خلوص اور جوهر جاتا رهتا ہے ۔ بے لوث عبادت کے متعلق مرزا کا مشہور شعر ہے

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبین کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

لیکن اس سے کہیں زیادہ وہ هوس ارضی ہے جس کا اظہار مثنوی کے مندرجہ بالا اشعار میں هوا ہے ۔ اگر غالب اس دنیا میں اس قدر محروم و مایوس نہ رهتے تو شاید بہشت کے متعلق ان خیالات میں یہ تیزی اور تلخی نہ هوتی ۔

نظریہ حیات و نظریہ محبت : مثنوی کے اس حصہ سے همیں مرزا کے نظریہ حیات اور نظریہ حسن و عشق کے بارے میں خاصا مواد ملتا ہے ان کا نظریہ حیات "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کے محور کے گرد گھومتا ہے ۔ وہ زندگی سے لطف اندوز اور متمتع هونے کے قائل هیں ۔

وہ شراب کے شیدائی ہیں - مے شانہ کے، بدمستی کے، ہائی و ہو کے، ناؤ نوش اور ہنگاموں کے - وہ شراب طہور سے کہیں زیادہ شراب خانہ ساز اور وسکی کے معتقد ہیں - وہ ایک نازن، پرہیزگار حور سے بڑھ کر ایک چالاک، ہوشیار اور نظرباز نازنین کے قائل ہیں - وہ نسوانی حسن کے دلدادہ ہیں - انہوں نے بہشت کے ذکر میں حور کا تذکرہ کئی مرتبہ کیا ہے لیکن غلمان کا نام ڈھونڈے بھی نہ ملے گا - وہ ایرانی شعرا کی طرح ترک شیراز کے عاشق نہیں - ان کے عشق میں ہوس کا عنصر نمایاں ہے - ان کی محبت کی بنیاد ہوس کی اینٹوں اور لذت کے گارے سے رکھی گئی ہے - وہ رقص و سرور اور ناچ رنگ کے دلدادہ ہیں چاندنی راتیں اور حسین برساتیں انہیں بیتاب کر دیتی ہیں -

غالب ابھی عدالت محشر میں بیان دے رہے ہیں - لیکن اب ان کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا ہے - ان کے دل کی ساری بھڑاس نکل چکی ہے - وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ دربار الٰہی ہے - یہ تو محض ان کا کرم تھا کہ غالب کو اتنا کچھ کہنے کی اجازت ملی - ورنہ کہاں غالب اور کہاں ذات ایزد - اب وہ پھر لوٹ کر وہی لب و لہجہ اختیار کرنا چاہتے ہیں جس سے انہوں نے ابتدا کی تھی - وہ اپنے پورے حقوق جتانے اور تمام دلائل مہیا کرنے کے بعد اپنی اپیل کے آخری حصہ میں "رحم" اور "ہمدردانہ غور" کی استدعا کرتے ہیں - اور آخری شعروں میں اس ساری تندی و تیزی کو دھو دینا چاہتے ہیں -

نعت : اس مثنوی میں نعت کا حصہ بھی تقریباً اسی قدر ممتاز ہے جس قدر کہ مناجات - فرق صرف یہ ہے کہ وہاں شوخی سے کلام میں جو دلچسپی اور رعنائی پیدا ہو گئی ہے وہ یہاں بہت کم ہے - مرزا ایک رند مشرب انسان تھے وہ اس اصول کے قائل تھے کہ "با خدا دیوانہ باش و با محمد ہشیار"، چنانچہ نعت میں وہ انتہائے ادب کو ملحوظ رکھے ہوئے ہیں تمام اشعار میں عقیدت، محبت اور عشق کے جذبات نمایاں ہیں - پہلے نو شعر تمہید میں لکھے ہیں اور اس کے بعد سرور کونین کی توصیف اور مدح شروع ہوتی ہے - یہاں بعض اشعار میں مرزا نے بالکل اچھوتے مضمون پیدا کئے ہیں -

بے آنکہ او را ببوسد قدم — لب آوردہ یثرب ز زمزم لبم
بلندی دہ کعبہ بالائے او — گرامی کن سجدہ سیمائے اوٗ
ز خو نیکہ در کربلا شد سبیل — ادا کرد وام زماں خلیل
کہ با گردش چرخ نیلوفری — بود سبز جائش بہ پیغمبری

بیان معراج: مثنوی کا یہ حصہ ۸۰ ۲ اشعار پر مشتمل ہے اور ضخامت کے اعتبار سے طویل تریں ہے۔ اس حصہ کے بارے میں خود مرزا کی رائے ملاحظہ فرمائیے۔

" در بارۂ معراج عروج فکر آں پایہ یافت کہ سخن از جائیکہ می رفت هم بدانجا رسید،، (۱) لیکن در اصل یہ موضوع مرزا کے بس کا نہیں تھا۔ یہاں نظامی ایسے حکیم کا دھن چاھئیے تھا۔ مرزا فلسفہ کےطالب علم نہیں تھے۔ نہ انہیں افلاک کے فرق و التیام کی بحث کا علم تھا۔ پھر بھی انہوں نے بساط بھر دقت نظر سے کام لیا ہے۔ اور اپنی همت بھر کامیاب ہوئے ہیں۔ اور بعض شعر بہت اچھوتے کہے ہیں مثلاً۔

چناں گشتہ سرتاسر اجزائے خاک — فروغانی و روشن و تابناک
کہ گوئی مگر مہر زیر زمیں — فروزاں فوہ بود و پشت نگیں

یعنی خاک کے ذرے اس رات میں اس قدر روشن اور چمک دار تھے کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ سورج زمیں کے نیچے اس طرح ہے جس طرح انگوٹھی کے نگ کے نیچے ڈاک۔ ملاحظہ فرمائیے کیسی نادر اور اچھوتی تشبیہ ہے۔

ایک اور شعر بڑے مزے کا ہے۔ فرماتے ہیں۔

شدہ چشم اعمی دراں جوش نور — تماشا گر حال اهل قبور

یعنی اندھے کی آنکھ اس رات جوش نور کی بدولت اتنی روشن ہوگئی کہ وہ زندوں کے حال سے تو درکنار مردوں تک کے حالات کا تماشا کرنے لگی۔

---

۱ - غالب - مثنوی ابر گہر بار (اکمل المطابع) صفحہ ۳

مرزا نے ابتدائی ۲۹ شعروں میں اس رات کے حسن، روشنی اور چمک دمک کی تعریف بیان کی ہے اور واقعی بیان کا حق ادا کر دیا شب معراج کی تعریف کے بعد حضرت جبرئیل کا تعارف کراتے ہیں

مہین پردہ دار در کبریا کشا ئندۂ پردہ بر انبیاء
ہمایون ہمای پیام آورے آوردن نامہ نام آورے
روان و خرد را روانی بدو نبی را دم رازدانی بدو
امینی نخستین خرد نام او ز سر جوش نور حق آشام او

جب حضرت روح الامین سرور کونین کو پیغام ربانی دیتے ہیں تو غالب اسے یوں ادا کرتے ہیں۔

بہ دور نو شد لن ترانی کہن فصاحت مکرر نسنجد سخن
ترا خواستگار است یزدان پاک هر آئینہ از لن ترانی چہ باک
ز امن چہ گوئی کہ راہ ایمن است ستمگر بر شو کہ شب روشن است

براق کی تعریف میں مرزا نے بعض بہت عمدہ شعر کہے ہیں ۔

ستائش برفتار زان حد گذشت کہ تا گوئی آید ز آمد گذشت
سبک خیزیش خندہ زن بر نسیم کہ در جنبش انگیزد از گل شمیم
ز ساق و سمش گر بہ بزم مدام کنی ساز تشبیہ مینا و جام
نباشد شگفت ار بدیدن رسد کہ آن بادہ پیش از رسیدن رسد

رسول خدا صلی اللہ علیہ و سلم کی سواری کی کیفیت کو مرزا نے خوب ادا کیا ہے ۔

ز بس ذوق ناسودہ بر یال دست بر آن بارہ یک بارگی بر نشست
مثل زد درین ماجرا بلبلے کہ باد آمد و برد بوئے گلے

حضور کی سواری آسمان کی طرف بڑھتی ہے اور آپ کی برکت سے چاند کو یہ مرتبہ ملتا ہے کہ سورج کی مستعار روشنی اب خود اس کی اپنی ذات میں پیدا ہو جاتی ہے

قدم تا بر اورنگ ماهش رسید با کلیل کیوان کلاهش رسید
ببالید چندان ز بیشی بدر کہ بے منت مهر گردید بدر
ز مہ گر کند مهر پہلو تہی چہ غم چو ز خویشش بود فرہی

اتنے میں عطارد جو دبیر فلک کے نام سے مشہور ہے حضور کی مدح گستری کے لئے حاضر ہوتا ہے اور عالم تصور میں اس نے مرزا کا روپ دھار رکھا ہے۔

در اندیشہ پیوند غالب گرفت   بخود درشد و شکل غالب گرفت

غالب خود دبیر الملک ہیں۔ وہ کس طرح پسند کرسکتے ہیں کہ عطارد یعنی دبیر فلک ان سے اس معاملے میں سبقت لے جائے اور حضور کی مدح گستری کا شرف اسے حاصل ہو جائے چنانچہ اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لئے وہ عطارد کو اپنا لباس عطا کرتے ہیں یا خود عطارد کا روپ دھارتے ہیں ــــ اس سے اس گہری محبت اور والہانہ عقیدت کا اظہار ہوتا ہے جو غالب کو ختم المرسلین سے تھی۔ اب غالب حضور کی خدمت میں حاضر ہیں اور نعت کے چند شعر کہ کر نجات اور بخشش کے لئے استدعا کرتے ہیں۔ اس کے بعد عطارد رخصت ہوتا ہے اور تیسرے آسمان پر ناہید نغمہ سرائی کرتا ہے۔ زہرہ بھی آپ کی مدح میں ایک گیت گاتا ہے اور آپ اسے نور کی چادر انعام میں دیتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں مرزا نے تمام آسمانوں کا ذکر تفصیل سے کیا ہے لیکن ان میں باوجود اصطلاحات ہیئت اور رعایات لفظی کے حقیقی زور اور فلسفیانہ نکتہ آفرینی کا فقدان ہے۔ البتہ اس سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ مرزا کو ہیئت و نجوم سے عملی نہ سہی، علمی طور پر ضرور شغف تھا۔

بیان معراج غالب کی واقعہ نگاری کا ایک اچھا نمونہ ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا کو زبان و بیان پر بدرجہ اتم قدرت تھی۔ مرزا کی طبیعت روانی میں ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا معلوم ہوتا ہے۔ نہ اس کی راہ میں قلت الفاظ حائل ہوتی ہے نہ فرو مایگئی خیالات۔ جب ہم ابر گوہربار کے ان مضمون کو دیکھتے ہیں جہاں مرزا کا قلم رواں دواں صفحوں کے صفحے رنگین کرتا جاتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ مرزا نے مثنوی گوئی کی طرف توجہ کیوں نہ کی۔ مرزا کی مثنوی میں تشبیہات کی فراوانی ہے اور استعارات کی کثرت۔ اشعار کی بندش چست اور تراکیب درست اور موزوں ہیں۔ مرقع نگاری میں بھی وہ کمال رکھتے ہیں۔

منقبت : نعت کے بعد منقبت کہنا مثنوی گوئی کے لوازمات میں سے ہے اور اس سے انحراف گویا اس کی روایتی ٹیکنیک کی خلاف ورزی کے مترادف ہے

لیکن اگر منقبت کہنا طویل مثنوی کے فن میں لازم نہ بھی ہوتا جب بھی مرزا منقبت ضرور کہتے کیونکہ اس معاملہ میں روایت سے بڑھ کر وہ عقیدت اور نیازمندی ہے جو مرزا حضرت علی سے رکھتے ہیں اور جس کی وجہ سے وہ منقبت کو اتنا ضروری خیال کرتے ہیں جتنا نعت کو۔۔۔ مرزا کے فارسی کلام کا مطالعہ کرنے والے حضرات خصوصیت سے جانتے ہیں کہ حضرت علی کے ساتھ مرزا کی وابستگی و دلبستگی کس درجہ تھی۔ وہ حضرت علی کا نام لے کر مست ہو جاتے ہیں بلکہ وہ اسد اللہی و علی اللہی بننے میں بھی تردد نہیں کرتے۔

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس   هم اسداللهیم و هم اسداللهیم

منصورهٔ فرقه علی اللهیان منم   آوازهٔ انا اسدالله درافکنم

مرزا نے توحید میں ایک، اور نعت میں دو قصیدے کہے ہیں۔ لیکن حضرت علی کی منقبت میں پانچ بڑے زور دار اور طویل قصائد ہیں۔ اس کے علاوہ چند ایک قصاید آئمہ کی منقبت میں بھی ہیں۔ لیکن ان قصاید سے قطع نظر انکی پیش نظر منقبت بھی خاصی بلند ہے۔ اس میں ۱۲۸ شعر ہیں اور مرزا نے بعض شعروں میں بڑے اچھوتے مضمون پیدا کئے ہیں۔ منقبت کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

هزار آفریں بر من و دیں من   که منعم پرستیست آئین من

چراغے که روشن کند خانه ام   تو گوئی منش نیز پروانه ام

حریفے که نوشم مے از ساغرش   بهر جرعه گردم بگرد سرش

مرزا کہتے ہیں کہ حضرت علی کا نام ہر وقت ورد زباں ہے اور میرا دل راز دار علی ہے میں اسی اسم مبارک کا پروردہ ہوں اور اسی نام نامی کی بدولت میرا وجود ہے۔ میں بزم طرب میں حضرت علی کا ہم نوا ہوں۔ تنہائی میں راز گو اور ہنگامہ میں اس کا متلاشی ہوں۔ خدا نے مجھے گوہر جاں اس لئے عطا فرمایا ہے کہ اسے حضرت علی پر قربان کروں۔ پھر کہتے ہیں

نبی را پذیرم به پیمان او   خدا را پرستم به ایمان او

خدایش روا نیست هر چند گفت   علی را توانم خداوند گفت

پس از شاه کس غیر دستور نیست   خداوند من از خدا دور نیست

مرزا کہتے ہیں کہ اگر نبی اکرم کا سایہ نہ تھا تو اس میں تردد کی ضرورت نہیں ۔ اس لئے کہ آپ کو اس کی حاجت ہی نہ تھی ۔ کیونکہ دو جسم اگرچہ الگ الگ ظہور میں آئے لیکن ان کا اثر ایک ہی جسم میں ظاہر ہوا ہے ۔ یعنی حضرت علی اور حضور ایک ہی نور اور ایک ہی سایہ رکھنے والے دو قالب ہیں ۔ ایسے لطیف اتحاد کی صورت میں اگر دو جسموں کے لئے ایک ہی سایہ ہو تو کافی ہے ۔

بداں اتحادے کہ صافی بود　　دو تن را یکے سایہ کافی بود
ازاں سایہ یک جا گرایش کند　　کہ احمد ز حیدر نمائش کند

مرزا اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ ان کے دوست ستائش حیدر کے معاملے میں ان پر غلو کا الزام دھرتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں ۔

بہ نادانی از شور گفتار من　　سگالند زانگونہ هنجار من
کہ آرائش گفتگو کردہ ام　　بحیدر ستائی غلو کردہ ام ۔

مرزا جواباً کہتے ہیں کہ میں تو اس معاملے میں الٹا اپنی تنگ مائگی کی وجہ سے شرمندہ ہوں ۔ کیونکہ

چہ باشد ازیں بیش شرمندگی　　کہ خور راستائم بر خشندگی
بہ بحر از روانی سرائم سرور　　بخلد از ریاحین فرستم درود
بہ گلشن برم برگے از نسترن　　بہ پیچاک سنبل فروشم شکن
ستائم کسے را کہ در داستاں　　شوم با سخن آفریں هم زباں
بہ رد و قبول کسانم چہ کار　　علی بایدم با جہانم چہ کار
ندارد غم و غصہ یزدان پاک　　علی را اگر بندہ باشم چہ باک

منقبت کے کل ۱۳۰ شعر ہیں ۔ کلام میں روانی اور زور شروع سے آخر تک قائم ہے اس حصۂ مثنوی میں مرزا کے مذہب پر روشنی پڑی ہے اور اس شعر سے کہ

جوانی بریں در بسر کردہ ام　　شبی در خیالش سحر کردہ ام

ناقدین پر یہ راز کھل جاتا ہے کہ مرزا عالم شباب میں بھی شیعہ تھے ۔ اور بڑھاپے میں بھی ۔ جبکہ مثنوی کا یہ حصہ لکھا گیا ۔ خاک نجف میں مرنے کی

آرزو بہت قوی تھی بلکہ وہ یہاں عرفی پر رشک کرتے ہیں اور اس کو خراج تحسین ادا کرتے ہیں جو اپنے اس شعر کے مطابق۔

به کاوش مره از گور تا نجف بروم　　اگر به هند بمیرم وگر بملک تاتار

مرنے کے بعد بھی نجف جا پہنچا۔

مرزا کے ذیل کے شعر سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شیعہ تھے۔

همانا پس از خاتم المرسلین　　بود با بمهدی علی جانشین

بعض شعروں سے مرزا کے غالی عقیدہ کے معتقد ہونے کا گمان ہوتا ہے مثلاً

لبم در شمار ولی اللهیست　　دلم راز دار علی اللهیست

لیکن یہ محض فرط عقیدت کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے ورنہ اس مثنوی میں وہ صاف کہتے ہیں۔

خدایش روا نیست هر چند گفت　　علی را توانم خداوند گفت

ایک اور جگہ ترکیب بند میں لکھتے ہیں :-

دین حق دارم معاذالله نصری نیستم　　گر نداند عیب جو بارے خدا داناستے

مثنوی کا یہ حصہ زبان و بیان کے اعتبار سے اہم ہے اور مضمون و مطالب کی نوعیت سے بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ اس سے مرزا کے عقاید مذہب اور خیالات پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔

مغنی نامه : مثنوی میں ساقی نامے اور مغنی نامے کا التزام بھی اسکی تکنیک کے اجزا میں سے ہے۔ مثنوی گو شعرا بالعموم آغاز داستان سے قبل عالم خیال میں ایک بزم طرب آراستہ کرتے ہیں جس میں مغنی بھی ہوتا ہے اور ساقی بھی اور شاعر ان دونوں سے ہم کلام ہوتا ہے۔ انہیں بربط و نے پر راگ گانے، ستار پر کسی گیت چھیڑنے، شراب خاص پلانے اور خم پر خم لنڈھانے کی دعوت دیتا ہے۔ اور خود کو راگ و رنگ کا عاشق، موسیقی شناس اور شہسوار مے خانہ ظاہر کرتا ہے۔

مثنوی میں یہ حصے ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ ان میں ایک خاص قسم کی غزلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس میں شاعر اپنے ما فی الضمیر

کو بے نقاب کرتا ہے ۔ حمد ، نعت اور منقبت میں اسکی عقیدت کا اظہار ہوتا ہے ۔ ان میں اس کے مذہبی جذبات منعکس ہوتے ہیں ۔ داستان کے حصہ میں ویسے جگ بیتی ہوتی ہے ۔ لیکن مثنوی کا یہی ایک حصہ ہوتا ہے جہاں وہ اپنے خالص دلی جذبات کو بغیر کسی بیرونی اثر اور دباؤ کے بیان کر سکتا ہے ۔ ان میں شاعر اپنا نظریہ حیات پیش کر سکتا ہے فلفسہ غم، حسن و عشق، حقیقت شراب ، انسانی زندگی کی تلخیاں اور راحتیں، زیست کے نشیب و فراز اور ان میں اپنا تجربہ اور اپنی رائے، عرض کہ اگر وہ چاہے تو بہت کچھ لکھ سکتا ہے ۔

مرزا کا مغنی نامہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے ۔ اور اس میں ایسا مواد موجود ہے جس سے کئی ایک پہلو آشکار ہوئے ہیں ۔ کہتے ہیں :

مغنی دگر زخمہ بر تار زن ‫ ‫ گل از نغمۂ تر بدستار زن
به پردازش آں گل افشاں نوائے ‫ ‫ نگویم غم از دل، دل از من ربائے
دل از خویش بردار و بر ساز نہ ‫ ‫ غم از خویش گوشے بر آواز نہ

مغنی نامہ میں سب سے پہلی چیز جو قابل غور ہے وہ غالب کا عقل و خرد کے متعلق بیان ہے وہ کہتے ہیں کہ کلام اگرچہ موتیوں سے بھرا ہوا خزانہ ہے لیکن عقل کی بدولت ہی اس کی تابش اور چمک دمک ہے ۔ کیونکہ کوے کے پروں جیسی سیاہ رات میں سوتی چراغ کی روشنی کے بغیر اچھی طرح نظر نہیں آتے ۔ پھر خرد کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

خرد چشمۂ زندگانی برد ‫ ‫ خرد را به پیری جوانی بود
فروغ سحرگاه روحانیاں ‫ ‫ چراغ شبستان یونانیاں
نخستیں نمودار هستی گرائے ‫ ‫ خرد بود کالا سیاهی زدائے
خرد جویم از خود بود مرگ من ‫ ‫ به هستی خرد بس بود برگ من
بهستی خرد رهنمائے خود است ‫ ‫ رود گرز خود هم بجائے خود است

مرزا عقل و خرد کو سخن کا منبع خیال کرتے ہیں ۔ ان کے خیال میں سخن اگر شراب ہے تو خرد بمصداق صراحی کے ہے ۔

سخن باده اندیشه مینائے او ‫ ‫ زباں بے سخن لائے پالائے او
به پیمودن باده پیمانه گوش ‫ ‫ خرد ساقی و خود خرد جرعۂ نوش

غالب کے نزدیک عقل خدا کو پہچاننے کا ایک ذریعہ ہے

فروغ خرد فرۂ ایزدیست　　خدا ناشناسی ز نابخردیست

ان کے خیال میں نظر کے لئے دانائی اور عمل کے لئے توانائی کی ضرورت ہے۔ اور یہ خرد ھی سے ممکن ہے - یہی عقل ھی غصہ کی حالت میں نشاط شجاعت بخشتی اور خواھشات کے ھجوم میں قناعت کی تلقین کرتی ہے -

خرد کے علاوہ مرزا نے جس چیز پر اظہار خیال فرمایا ہے - وہ غم ہے - وہ غم کو عطیہ خداوندی سمجھتے ھیں - کہتے ھیں :

ز یزداں غم آمد دل افروز من　　چراغ شب و اختر روز من

وہ غم کا شکوہ کرنا خلاف عقل سمجھتے ھیں:

نشاید کہ من شکوہ سنجم ز غم　　خرد رنجد ار من خورم رنجم ز غم
غم دل ز من مرحبا جوئی باد　　دلم زار و لب مرحبا گوئے باد
دلم هم چو غالب بغم شاد باد　　بدیں کنج ویرانہ آباد باد

غالب کے ذیل کے اشعار سے انکا فلسفہ غم مرتب کیا جا سکتا ہے :

بدانش غم آموزگار منست　　خزان عزیزان بہار منست
غمی کز ازل در سرشت منست　　بود دوزخ اما بہشت منست
بغم خوشدلم غمگسارم غمست　　نہ بے دانشی پردہ دارم غمست

غالب کا غم ایک مضمحل اور بیمار آدمی کا غم نہیں ہے بلکہ وہ ایک صحت مند انسان کا غم ہے - مرزا غم سے گریزاں نہیں - بلکہ وہ اس میں ایک خاص کیفیت، لذت اور کیف محسوس کرتے ھیں - مرزا کی بلند ھمتی کے شایان شان نہیں کہ وہ غم کے آگے سر جھکا دیں - وہ اپنی شوخی، حکیمانہ ظرافت اور بالغ نظری سے جو فلسفہ سے مملو ہے غم کی تلخی کو نہ صرف کم کر لیتے ھیں بلکہ وھی دوزخ غم ان کے لئے بہشت بن جاتا ہے - وہ ”مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آسان ھو گئیں“ کے مصداق غم سہتے سہتے غم کے ایسے عادی ھوئے کہ اس میں حظ اٹھانے لگے - کبھی وہ شراب عقل میں سرشار ھو کر اور کبھی شراب خانہ ساز کے نشہ میں مست ھو کر غم کو بھول جاتے ھیں -

نہیں بلکہ وہی غم ان کے لئے غمگسار دوست بن جاتا ہے - غم سے غمگساری کا کام لینا اور اس طرح اپنے دل کو تسکین بہم پہنچانا غالب کی بالغ نظری کا عمدہ ثبوت ہے - مرزا کے غم میں وقار ہے ایک ضبط ہے اور ایک رکھ رکھاؤ ہے - مرزا جب غم کو عقل کی عینک سے دیکھتے ہیں تو وہی غم جو دوسروں کے لئے مایوسی اور ہلاکت کے دروازے کھولتا ہے غالب کے لئے راہنما ثابت ہوتا ہے اور سخن طرازی کے لئے ایک تحریک :

بدیں بادہ کاندیشہ پیمودہ است   غمم خضر راہ سخن بودہ است

مغنی نامہ میں مرزا اپنی حالت زار کا نظامی اور زلالی سے مقابلہ و موازنہ بھی کرتے ہیں اور کہتے ہیں :

نظامی نیئم کز خضر در خیال   بیاموزم آئین سحر حلال

زلالی نیئم کز نظامی بخواب   بہ گلزار دانش برم جوئے آب

نظامی کشد ناز تا ہم کجا   زلالی بود خفتہ خوابم کجا

نظامی بحرف از سروش آمدہ   ز لالی ازو در خروش آمدہ

من از خویشتن با دل دردمند   نوائے غزل برکشیدہ بلند

نباشم گر از گنجہ گنجم بس است   بغم گر چنیں پردہ سنجم بس است

کنونم بسر شور گفتار نیست   بساز غزل زخمہ بر تار نیست

معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی کا یہ حصہ لکھتے وقت غالب کو بہت سی مشکلات پیش آئیں انہیں ان کا احساس ہے اور وہ کہتے ہیں :

مرا بیں چوں مشکل افتادہ است   چہ خونہاست کاندر دل افتادہ است

خود از درد بیتاب و خود چارہ جوئی   خود آشفتہ مغز و خود افسانہ گوئی

بہ تنہائی از ہمدمان خودم   بدل مردگی نوحہ خوان خودم

کسم در سخن کار فرمائی نیست   بہ بخشندگی ہمت افزائی نیست

زبان و بیان کے لحاظ سے یہ حصہ بھی خوب ہے - اکثر شعر اچھے نکل گئے ہیں - البتہ فلسفیانہ موشگافیوں کی وجہ سے کہیں کہیں دلچسپی غائب ہو گئی ہے -

ساقی نامہ : مثنوی ساقی نامہ کے بعد ختم ہے لیکن مرزا یا تو یہاں پہنچ کر تازہ دم ہونے کی کوشش میں ہیں یا مٹے گلگلوں کے تصور نے انہیں ایسا

سرمست کر دیا ہے کہ تھکن کا احساس نہ رہا۔ بہر حال باوجود بڑھاپے کے اس حصہ میں جوش و سرمستی کا پلہ بھاری ہے۔ خیال تھا کہ مرزا نے ساقی نامہ کے لئے اپنے معنوی استاد ظہوری سے فیض حاصل کیا ہوگا جس کا ساقی نامہ پاک و ہند میں شہرہ آفاق ہے لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے مرزا کے ساقی نامے کو ظہوری سے کوئی نسبت نہیں۔ البتہ ظہوری نے اپنے ساقی نامہ کی ابتدا تعریف مے فروش سے کی ہے:

بآئین جم حضرت مے فروش　　بکف جام از بہر ارباب ہوش

مرزا نے بھی آئین جم یاد دلا کر ساقی کو پکارا ہے:

بیا ساقی آئین جم تازہ کن　　طراز بساط کرم تازہ کن

لیکن یہ تقلید نہیں بلکہ ساقی کو مخاطب کرنے کی قدیم رسم ہے۔ پھر مرزا اور ظہوری میں فرق یہ ہے کہ ظہوری ایرانی ہونے کے باوجود ایرانی مے نوشوں کی یاد میں نہیں پیتا۔ لیکن مرزا آداب مے نوشی کا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ اور ''جام بنام بہرام'' اور ''سرود بنام بہرام'' سے ابتدا کرتے ہیں۔ اس کے بعد بچارے نظامی کو نشانہ تضحیک بناتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

مبادا نظامی ر راحت برد　　بدستاں سوء خانقاهت برد
فریبش مخمور چوں مے آشام نیست　　ستم دیدۂ گردش جام نیست
ورع پیشہ مسکین چہ داند ترا　　بہ آرائش نامہ خواند ترا
رضا جوئے من شو کہ ساغر کشم　　گرم نیل و جیحوں دهی در کشم

غالب کی بلا نوشی کا دعوی دیکھو کہ نیل و جیحوں کو چڑھا جانے کو تیار ہیں۔ کیوں نہ ہو دو سال سے ''مے طلب'' ہیں:-

همانا تو دانستهٔ کز دو سال　　ننوشتم مے الا بہ بزم خیال

ساقی نامہ میں ساقی سے خطاب ہے اور مے نوشی کی تمنا۔ مگر نشاط کے لئے نہیں محض بے خودی کے لئے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

وہ شراب شیراز کے متمنی ہیں جس میں عکس رخ یار دیکھ سکیں۔

یہاں وہ صوفیانہ انداز اختیار کرتے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ می و ساقی، جام سفال، بے خوار، انجمن، گل و بلبل، بوستان، مہ و انجم، زمین و آسمان غرض ہر چیز وہم ہے لیکن جھٹ ہی وہ ہوش میں آتے ہیں کہ کہاں می خوار و رند شاعر اور کہاں معرفت

تصوف نزیبد سخن پیشہ را سخن پیشہ رند کثر اندیشہ را
نشان مند ایں روشنائی نہٴ غزل خوان و بے خور سنائی نہٴ

غزل پڑھو۔ محفل نشاط آراستہ کرو ۔ اگر یہ بھی نہیں ہو سکتا تو بادشاہوں کی پرانی کہانیاں سناؤ۔ پھر وہ اس قسم کا مشغلہ بھی فرسودہ اور بیکار بتاتے ہیں البتہ داستان حق کو ترجیح دیتے ہیں لیکن عاجزی سے نہیں بلکہ:

سخن را خود آنگونہ دانم سرود کزیں نیز خوشتر توانم سرود
ولے تاب در خود نیابم کنوں صریر قلم بر نتابم کنوں!

ساقی نامہ میں یہ مقام بہت خوب ہے یہاں مرزا بڑھاپے میں جوان اور جوانی میں مست ہیں ۔ وہ فقر و فاقہ کا ذکر کرتے ہیں مگر بڑے بے فکرے معلوم ہوتے ہیں ۔ انہیں احساس ہے کہ عالم پیری میں یہ باتیں زیب نہیں دیتیں ۔ مگر عذر پیش کرتے ہیں ۔

دریغا کہ در ورزش گفتگوئے بہ پیری خود آرائی آوردہ روئے
بہر نائیم روئے پیری سیاہ ز مو بود بر فرق مشکیں کلاہ

غالب نے شعروں سے وہ تصویر کھینچی ہے کہ دیکھا کیجئے اور لفظوں سے ایسا رنگ بھرا ہے کہ مصور دنگ ہو جائیں:

دریغ از ترقیٴ معکوس من کہ باشد سرمن بپا بوس من

سر سے ہوائے تکبر جاتی رہی ۔ میرا قد سرو سہی ہو گیا اور بید مجنوں بن گیا۔ لیکن یہ تذکرہ اس لئے نہیں کیا گیا کہ میں فن کاری سے بھاگ رہا ہوں۔ نہیں——میں خیال میں نکتہ آفرینی، طبیعت میں رعنائی، سخن سنجی میں شیوہ ہائے ناز و نیاز سے واقف ہوں ۔ جگر خون ہے ۔ دل گداختہ پہلو میں ہے ۔ یہ ٹھیک ہے کہ جسم میں خون نہیں مگر پلکوں کو دیکھو تو خون تازہ کے قطرے دامن پر ٹپکا رہی ہیں ۔ اسی زور کی وجہ سے یہ حالت ہے کہ

ز حرفے کہ اندر ضمیر آیدم ہنوز از دھن بوئے شیر آیدم

غالب یہاں شاعرانہ تعلی سے کام لیتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ جب میں کوئی نادر تخیل نظم کرتا ہوں تو جناب خصر بھی پھڑک کر داد دینے لگتے ہیں ۔ مجھ میں یہ قدرت ہے کہ میں خدا کی مدد سے قدیم کو جدید کر دوں ۔ وہ تخت تیار کروں کہ اس کے پائے فرشتوں کے پروں سے تیار ہوں ۔ وہ درخت بوؤں کہ چاند اور زهره اس کے سائے میں آکر بیٹھیں ۔ وہ راستہ اختیار کروں کہ خصر بھی میری پیروی کریں ۔ وہ چیز لکھوں کہ پیغمبر بھی لا ریب فیہ لکھ دیں ۔

آگے چل کر غالب ، فردوسی سے مقابلہ و موازنہ کرتے ہیں ۔ اور وہ اس وجہ سے اپنے آپ کو بلند رتبہ خیال کرتے ہیں کہ فردوسی کے ہیرو رستم اور کیخسرو تھے اور ان کے ہیرو پیغمبر آخرالزماں اور انکے وزیر حضرت علی ابن ابی طالب ہیں !

ز فردوسیم نکتہ انگیز تر　　　ز مرغ سحر خواں سحر خیز تر
فرو مردن شمع ساسانیاں　　　بود صبح اقبال ایمانیاں
رقم سنج مسور یزدانیم　　　ز ایرانیاں گویم ایمانیم

لیکن غالب کو اس موقعہ کی نزاکت اور ایسے کام میں فنکار کی مشکلات کا علم ہے ۔ اس راہ میں لغزش اور پھسلن ہے ۔ پھر مستی جو کلام میں جوش پیدا کرتی ہے یہاں بے کار ہے ۔ ضرورت ہے کہ ہوش و حواس بجا رہیں ۔ سخن گوئی ، سخن سنجی، ادب و تہذیب کے نازک موڑوں پر فن اور فن پارے کی نوک پلک درست رکھنا اور پھر اس مشکل میں ایک طرف موسم سرما، آگ و کباب ، مرغ و شراب کی بہار ہو ۔ دوسری طرف نہ رود و سرود، نہ شراب و کباب ۔ اب دیکھنا چاہئیے کہ شاعر کے لئے کسی دقتیں ہیں ۔ وہ کہاں سے رنگینی پیدا کرے ۔ اب کہنے کو تو بادشاہ کے تذکرے ہیں لیکن فقر و شاہی کے امتیاز کو برقرار رکھنا ضروری ہے ۔

ان دقتوں کا ذکر کرتے کرتے وہ ہمت باندھ کر تیار ہوتے ہیں اور اپنی ہمت پر فخر و ناز کرتے ہیں ۔ اور ظہوری، جامی، نظامی اور فردوسی سب کو للکارتے ہیں گویا انہوں نے اپنے خاکے کو رنگیں کر دیا ۔ اور اب خود ہی

اسے دیکھ دیکھ کر جھوم رہے ہیں ۔ اور یہ نشاط بے خودی تک لئے جاتا ہے ۔ مرزا کے یہ شعر بڑے زور دار ہیں ۔ اب وہ تازہ دم ہو رہے ہیں ۔ اور نئے سفر کے لئے تیاری کر چکے ہیں ۔ ملاحظہ فرمائیے ۔

زباں را برامش گرو کردمے ۔۔۔ دم جنبش زخمہ نو کردمے
همم زخمہ از دیگراں تیز تر ۔۔۔ همم ساز دانش نوا خیز تر
به آزادگی خسروی می کنم ۔۔۔ بدیں پشت دولت قوی می‌کنم
نباشد اگر پائے دیں درمیاں ۔۔۔ نہم ہفتخواں بلکه هفتاد خواں
پرم از تو برتر ببال گزاف ۔۔۔ تو سی مرغ آری و من کوه قاف
تو سوسن فرستی بخنیاگری ۔۔۔ مرا جنبش کلک رقص پری
تو کاں بادہ ہائے گوارا زنی ۔۔۔ دم از نقل و می آشکارا زنی
من و جام بے بادہ در خوں زدن ۔۔۔ بلب تشنگی جوش جیحوں زدن

اس تقریب سے وہ پھر لوازمات ساقی نامہ کا ذکر کرنے لگتے ہیں اور پھر خود ہی خیال آتا ہے کہ ابھی تو کہا تھا :

دریں بزم اوباش را بار نیست ۔۔۔ می و ساغر و زخمہ و تار نیست

اس لئے رکتے ہیں اور کہتے ہیں :

دگر غالب اے عہد و رائے تو سست ۔۔۔ بہ پیمان دانش وفائے تو سست
حدیث مے و شیشہ و جام چیست؟ ۔۔۔ چہ گوئی و ایں شیوہ را نام چیست؟
نگفتی کہ بیزار گشتم ز مے ۔۔۔ بریدم ز بزم و گزشتم ز مے

اور آخری شعر ؎

ترا بخت در کار یاری دہاد ۔۔۔ بہ پیوند دین استواری دہاد

ایک لحاظ سے مرزا نے اچھا کیا کہ اس مثنوی کو یہیں چھوڑ دیا ۔ اس لئے کہ اس موضوع پر لکھنے کے لئے یا تو جوانی ہوتی یا مذہبی جنون یا امید نفع ظاہر اور یہاں کچھ بھی نہ تھا ۔ اس لئے نہ وہ ملا باذل بن سکتے تھے نہ فردوسی ۔ البتہ اگر کوشش کرتے تو ظہوری ضرور بن جاتے اور جامی سے تو اب بھی نیچے نہیں رہے ۔

در حقیقت یہ مثنوی جس ماحول سے متاثر ہو کر لکھنا چاہی تھی اس نے مرزا کا ساتھ چھوڑ دیا ۔ ورنہ معاشی بحران اور ہر طرف سے مایوسی انہیں

اللہ کی طرف کھینچ رہی تھی - وہ پاک درگاہوں سے لو لگانا چاہتے تھے - وہ اپنی دینی یادگار چھوڑنا چاہتے تھے - لیکن فردوسی اور نظامی کا خیال بھی تھا - اس لئے کچھ تو تاب مقابلہ نہ دیکھ کر کچھ رندیت کا زور محسوس کرکے بیٹھ رہے - قلعے کی نوکری کے بعد وہ کسی کام کے بھی نہ رہے تھے - کچھ تو بڑھاپا اس پر مصائب زمانہ اور حادثات دوراں، ان سب نے مل ملا غالب کا قلم روک دیا -

حول مخطوط من دیوان شعر الباخرزی

از

سعید احمد اکبر آبادی ایم اے پرنسپل کلکتہ مدرسة کلکتہ

قد عرف الادیب الکبیر ابوالقاسم[1] علی بن الحسن الباخرزی (المقتول فی سنة ۴۶۷ھ-۱۰۷۵م) بکتابه الذائع الصیت ـ "دمیة القصر و عصرة اهل العصر" ـ منذ ثمانیة قرون ـ و کان کتابه هذا ذیلاً علی یتیمة الدهر للثعالبی (المتوفی سنة ۴۲۹ھ) و قد أقر بفضله أبناء جیله کما اعترف سبقه فی حلبه الشعر و الادب أعیان ممن تأخر عصر هم أمثال السمعانی (م سنة ۵۶۲) و ابی الحسن البیهقی (م سنة ۵۶۵) و العماد الکاتب الاصفهانی (م سنة ۵۹۷) و ابن خلکان (م سنة ۶۸۱) و یاقوت و من حد احذوهم من المؤلفین فی اخبارالشعراء و تراجم الادباء ـ

کلما لفتنا النظر الی جلة الکتاب الذین عاشوا فی صدر الدولة السلجوقیة واستظلوا بظلالها الفینانة ، وجدنا الباخرزی من بینهم اجل قدراً و اکثر ذخراً و أنبه ذکرا ، حائزاً بالبراعة فی اللغتین العربیة و الفارسیة ـ و یعتبر کتابه دمیة القصر اکبر أترا دبّی من نفثات قلمه و کانْ رحمه الله افرغ جهده فی تنمیق هذا الکتاب و تدوینه و قد طبع اول مرّة فی سنة ۱۹۳۰م بعنایة البحاثة الکبیرالاستاذ محمد راغب الطباخّ رحمه الله و لکن بقیت الحاجة الی اعادة الطبع منه عن نسخة محکمة البناء کاملة الضبط اذ کانت الطبعة الاولی ناقصة إلی اقصی الغایة کما لا یخفی علی الافاضل الاعلام ـ

و هناک أثر آخر من حیوة صاحبنا الادبیة و هو دیوان شعره الضخم الکبیرالذّی شاع ذکره و اشتهر امره فیما غبر أما الیوم

---

(۱) کنیته المشهورة "ابوالحسن" و الصواب ما اخترته (راجع : ارشاد الادیب)

فقد اصبحت نسخة من جملة النوادر الی حد کبیر - و کان انتخب منه بعض ادباء القرن السادس فی مجموع صغیر و قد طالع نسخة من هذا المنتخب الادیب العلّام سدید الدین محمد العوفی - و هو من رجال القرن السادس و السابع - و کان وجدها فی مکتبة تاج الملک شرف الدولة و الدین عمدة الوزراء محمد بن الحسن فنقل منها قطعتین اثبتهما فی ترجمه الباخرزی فی کتابه الجلیل لباب الالباب(۱) و کان هذا المنتخب موسوماً ''بالا حسن فی شعر علی بن الحسن'' و کذا اختار من دیوان شعره ابو الوفاء محمد بن محمد الاخسیکتی (المتوفی بعد سنه ۵۲۰) و سمّی مجموعه ''اختیار البکر من الطیب من شعر علی بن الحسن بن ابی الطیب و قد دلّنا علیه البحاثة الحبیر بروکلمان(۲) الألمانی-

و توجد مع بعض النسخ المخطوطه من کتاب دمیه القصر قطعة من شعر الباخرزی کما وجدها الأستاد محمد راعب الطّباخ فی طلیعة النسخه المحفوظة فی خزانة المدرسه الاحمدیه بحلب فسرها مع الدمیه باسم الملتقط من دیوان ابی الحسن علی بن الحسن الباخرزی و اضاف الیها ما تجمّع عنده من شعر صاحب الدمیة عن کتب شتی و مصادر متفرقة - فجاءت تلک القطعة مع زیادات الطباخ فی ۵۲ صحفه و عدد الابیات عدا ما جمعه الطباخ نحو ثمانمائه بیت و سته و اربعون بیتا و عن تلک القطعه یقول الدکتور مرجلیوث فی مقاله المستودع فی دائره المعارف الاسلامیه ما نصه(۳):

In some MSS it is followed by a selection from the author's poems, of which a bulky diwan once existed.

اما نسخة الأصل من دیوان شعر الباخرزی فلم نعرف الا عن مخطوط منها فی خزانه ''طوب قبو'' کما دل علیه بروکلمان فی ضمیمة(۴) تاریخه -

---

(۱) لباب الالباب - ج ۱ ۶۸ - ۷۱ (طبعه براؤن)

(۲) تاریخ الاداب العربیة ج ۱/۲۹۲ طبعه ۱۹۴۳م (Geschichte der Arabiechen Litterature)

(۳) ج ۱/۶۰۰ طبعة سنه ۱۹۴۳م (Ency. of Islam)

(۴) ج ۱/۴۴۶

ثم اتفق لی الاطلاع على مخطوط آخر من الديوان و إنما يسرنی جداً ان نكشف عنه القناع و هو محفوظ فی خزانه المجمع الاسيوى (The Asiatic Society of Bengal) بكلكته المحمية و رقمه A-1110 و قد لعبت به ايدى الحدثان طويلاً حتى اذهبت من طرفيه أوراقاً - لايجليها الخرص والـخمين - و هذا المخطوط على علاّته حقيق بأن يعد من نوادر الثمينة مجموع اوراقه ٢٢٨ ورقة و فی كل صحيفة نحو راحد و عسرين سطراً بحكم الاغلبية أما الابيات فعددها ثمانية آلاف بيت و مائه و ثمانية أبيات - مابين قصائد طوال و قصار و مقطوعات متنوعه من المدائح والتهانی والرثاء والهجاء و الاخوانيات و المطارحات والمداعبات و معانی الحب والمجون و الخلاعة -

و قد كتب هذا المخطوط فيما يدل ظاهره فی القرن الحادی عشر بخطّ متراوح بين النسخ و التعليق و الذی تولی نساخته اظنه لا يتحرى الصواب فی النقل والضبط ، الا انه استنسخ هذا المخطوط من اصل متقدم عتيق فاستصعب المنقول منه فجاء النقل مصحّفا فی مواضع كثيرة -

طالما استجلب الباخرزی عناية الادباء بشعره حتى ان الاعاظم من رجال عصره شغفوا ببنات صدره و فی طليعـهم الوزير الصفّی محمد بن علی بن حسّول الذّی هو من علية الكُتّاب و كان الباخرزی مدحه بقصيدة غراء فقضى الوزير عجبا و قال بشعره معجبا :

لو لا وهن ركبتی لرقصت على نسيبه فهذا كلام كله طيّب(١)

والشيخ ابوالقاسم السجری - الذّی عد اشعر أقرانه و آدب اهل زمانه نقرأ عنه فی الدمية مانصه :

"و لهذا الفاضل شغف ببنات خواطری و لا يزال يخطبها الی و انا اعضلها"(٢)

---

(١) راجع دمية القصر - ص ٩٠ - طبعة الطباخ -
(٢) أيضاً ص ١٥٨

والقاضي ابو منصور محمد بن عبد الجبار السمعاني - و هو امام مرو و حبرها - اثنى عليه بما أغنى حيث يقول(١) فيه :

حسن شعر و على قد جمعا لک جمعا یا علی بن الحسن
انت فی عین العُلى کحل و من رد قولی فهو فی عین الوسن

و کان ابوالفتح الحسن بن ابرهیم الصیمری - مع کبر سنه و علو کعبه یخاطبه فیما یکتب إلیه بالمعجز البدیع(٢) وانه شهد بالفضل لهذا الفتی الباخرزی فی شعره اذقال :

کلامک معجز و کذاک حلو من العیب المهجن للکلام
فدع باخرز حقّا عنک واکتب نظام المعجز الحسن النظام

والشیخ ابوالحسن علی بن عبدالله العثمانی - و هو من أقران ابی علی الباخرزی والد صاحبنا ابی القاسم - یکتب الیه فی بعض مقاطعه(٣):

قد کنت تولع بالبدیع و شعره - فارجع فقد وافی بدیع زمان
أین البدیع من الظریف الفاضل ابن الفاضل الفرد العدیم الثانی

و قد کان فوق کل ذلک ما وقع فی الدار العضدیه ببغداد ، فی مجلس غاص من ملوک العرب والعجم والاکراد و کان الوزیر عمید الملک الکندری وزیر السلطان رکن الدین ابی طالب طغربک السلجوقی یجاذبهم اهداب المحادثه تاره بالعربیه و اخری باحدی لغات العجم و صاحبنا الباخرزی یرفع عقیرته فی هذا المجلس بدالیته الغرّاء التی أوّلها :

أقوت معاهدهم بشط الوادی - فبقیت مقتولا و شطّ الوادی
الی أن انتهی الی قوله :

قالت و قد فتشت عنها کل من لاقیته من حاضر او باد
أنا فی فوادک فارم لحظک نحوه ترنی فقلتِ لها و أین فوادی

---

(١) ایضاً ص ١٥٢
(٢) ایضاً ص ٨٦
(٣) ایضاً ص ٢٠١

فهناک اخذ العمید الکندری یصفق طرباً و یلتوی عجباً و یخاطب امراء العرب قائلاً :

''لنا[١] فی العجم مثله فأتوا فی العرب بمثله'' ۔ و ذلک من أسنی المفاخر و ابهی المناقب فلا غر وان جعله الباخرزی عنواناً لکتاب مفاخره ۔ وقد کفی له فضلاً و علواً ان تتفق هولاءالسادة الأمجاد علی التنویه بشأنه والنند و بشعره ۔

ثم تلاهم السمعانی ۔ صاحب کتاب الانساب ۔ فقال فی ترجمته انه ''واحد[٢] عصره و علّامة دهره ، و ساحر زمانه فی ذهنه و قریحته''۔ و جاء العماد ۔ صاحب الخریده ۔ فالتقط من لفظ السمعانی و قال مع زیادة مستحسنه[٣] أنه ''کان واحد دهره فی فنه و ساحر زمانه فی قریحته و ذهنه ، صاحب الشعرالبدیع و المعنی الرفیع'' ثم ذکر العماد انه ''رأی أبناء العصر باصبهان مشغوفین بشعره متیمین بسحره''۔ وهذا ابن خلکان یقول ما لفظه ۔ ''و دیوان[٤] شعره مجلد کبیر و الغالب علیه الجودة'' ۔

و لما ورد صاحبنا ببغداد فی سنه خمس و خمسین واربعمائة اتفق له التشرف بمقابله الخلیفة القائم (المتوفی سنة ٤٦٧ھ) فأنشد قصیدته الطنانة البائیة برسم الخلافة اولها :

عشنا الی ان رأینا فی الهوی عجبا کل السهور فی الامثال عش رجبا

فاستهجن البغاددة شعره و انما ذکر عنهم السمعانی[٥] ما لفظه :

''و قالوا فیه برودة العجم فانتقل الی الکرخ و سکنها و خالط فضلائها و سوقتها مدة یتخلق باخلاقهم و اقتبس باصطلاتهم ثم انشأ قصیدته التی أولها :

هبت علّی صبا تکاد تقول انّی الیک من الحبیب رسول

---

(١) الدمیة - ص ١٣٢
(٢) الانساب b - 57 - طبعة من جلیوث
(٣) ارشادالاریب - ج ١٣/٢٣ طبعة مصر
(٤) الوفیات ج٣/٦٦ رقم ٤٣٨ طبعة ١٩٤٨ م
(٥) راجع ارشاد ریب ج ١٣/٣٩

سکری تجشمت الربی لتزورنی من علّتی و هونها تعلل

فاستحسنوها و قالوا تغیر شعره ورق طبعه'' ۔

ملت البرودة فی کلام شعراء العجم عامه بحکم البیئه والطبیعه و الفرق بین العربی الصریح و العجمی المستعرب من القضا یا الفطریة فلا بدع ان لم یسلم صاحبنا الباخرزی مع عجمته و اکثاره من النقد و قلّما سلم مکثار ۔

و ربما نسبوا له ابیاتاً لا تصّح له فهذا العماد الکاتب مع جلاله قدره انشد له البیتین :

ما أنت بالسبب الضعیف و انما نُجح الامور بقوه الاسباب

فالیوم حاجتنا الیک و انما یدعی الطبیب لکثرة الاوصاب

و تبعه علی ذلک یا قوت فی ارشاده فوقعا فی هوة من الخطأ والصواب انهما للزبیرین بکّار یقولهما لابن خاقان(۱) ۔ و کذا انشد له ابن خلکان البیتین :

یا خالق الخلق حمل الوری لما طغی الماء علی جاریه

و عبدک الآن طغی ماؤه فی الصلب فاحمله علی جاریه

وتبعه الاستاذ الطباخ رحمه الله فاثبتهما له فی آخر(۲) الملتقط من شعره مع انهما لأبیه ابی علی الحسن(۳) بن علی بن ابی الطیب ۔

انما رأیت اخیراً ان اعرض علیکم اسماء المشاهیر من الوزراء و الامراء والکتاب و العلماء الجلّه الدین مدحهم الباخرزی و بقیت مدائحه فیهم محفوظة فی نسخة دیوانه الموجودة فها کم ما یلی :

(۱) عمید الملک ابو نصر منصور بن محمد الکندری (م ۴۵۶ھ) وزیرالسلطان طغر لبک و استغرقت قصائده فیه نحو ۱۳ ورقة ۔

---

(۱) ایضاً : ج ۳۶/۱۳ (ح ۱)

(۲) ص ۵۱

(۳) ص ۲۵۳

(۲) الشیخ الاجلّ نظام الملک قوام الدین ابو علی الحسن بن علی الطوسی (م ۴۸۵ھ) وزیر السلطان الب ارسلان و السلطان ملک شاہ ۔ و قصائده فیه فی ۲۲ ورقه ۔

(۳) شیخ الدولة ابوالحسن علی بن محمد البرکردی[1] فیه قصائد استغرقت تسعه أوراق ۔

(۴) الشیخ الرئیس ابو القاسم عبد الحمید بن یحی المروزی ۔ قصائده فیه فی ۱۳ ورقة ۔

(۵) الشیخ العمید کمال الدوله ابوالرضی فضل الله بن محمد مدائحه فیه فی ۴ اوراق ۔

(۶) السید الاجل شرف الساده ابو الحسن محمد بن عبد الله[2] الحسینی البلخی

(۷) الشیخ الامام ابوالمعالی عبدالملک[3] بن یوسف الجوینی الشهیر بامام الحرمین ۔

(۸) الاستاذ الامام ابوالقاسم عبدالکریم بن هوازن[4] القشیری ۔

(۹) الشیخ الامام الموفق ابو محمد هبة الله بن محمد بن الحسین ۔

(۱۰) السیدالرئیس ابوالقاسم علی بن موسی الموسوی نقیب العلویة بمرو و هذا الرئیس الموسوی کان الباخرزی لقیه بمرو فی رمضان سنة سبع و اربعین و اربعمائه کما صرح بذلک فی ترجمتی الموسوی[5] والقاضی ابی منصور السمعانی فمدحه بقصیدة طنانة تعدّ من عیون قصائده و قد أورد منها فی الدمیة ثلاثة ابیات فی ترجمة الموسوی ثم نقل قطعة طویلة منها فی ترجمة القاضی السمعانی کما اورد منها یاقوت ۱۲ بیتاً فی الارشاد[6] نقلاً عن البیهقی ۔ والذی یلائم المقام

---

(۱) الدمیه : ص ۱۳۸
(۲) ایضاً : ص ۱۲۸
(۳) ایضاً ص ۱۹۶
(۴) ایضاً ص ۱۹۴
(۵) دمیه القصر ص ۱۲۶، ص ۱۵۲
(۶) ج ۱۳/۳۵ - ۳۷ (مصر)

ان انقل القصیدة برمّتها فاجعلها مسک الختام لمثالی الوجیز۔ والعبارة فی نسخة الدیوان تدل علی خلاف ما ورد من تاریخها فی الدمیة فدونکم نصها:

"(*) و له فی السید الرئیس العالم ابی القاسم علی بن موسی الموسوی نقیب العلویة بمرو و انشدها فی رمضان سنة تسع و اربعین و اربعمائة"۔

والصواب عندی ما وقع فی الدمیة مرّتین کما تقدم و التصحیف بین سبع و تسع قوی الاحتمال لاشتباههما۔ و بعد ذلک نقدم الکم قصیدته إلی الموسوی :

حیالک من تحت ذیل الحی (۱) شعاع کحا شیة المشرفی
بریک تفتق نور جلی (۲) یری کتفتح نور جنی
اعاد الطراز رداء الهوی (۳) و لکن بردی و شیک الهُوی
و اطلع فی جنح لیل السحاب (۴) صباحاً مضیئاً سریع المضی
هی النار نعبد لا لـلصلاة (۵) الیها و نعمد لا للصلی
سوی ان اشراقها موهم (۶) ما یماض ثغر لسعدی نقی
ذکرت عرارة نجد و عزّ (۷) شمیم العراره بعد العشی
و جدّد شوقی وراء الضلوع (۸) الی الربع من بعد احدی بُلی
و من لی بسعدی و من دونها (۹) و قد حجبت خلف مرمی قصی
نعیب الغراب و نبح الذئاب (۱۰) و حرش الضباب ووخدالمطی
یقشّر بالضرب منها اللحا (۱۱) و یشغل عن ضربها باللحی

(*) د (مخطوط) ۶۵/الف - ۶۶/الف ، و دمیة القصر (الابیات: ۴۷ - ۴۹، ۵۲) ایضاً (الابیات ۲۱، ۲۰ - ۲۸، ۳۰ - ۳۰) والارشاد (الابیات: ۱، ۱۷ - ۱۸، ۲۶ - ۲۷، ۳۱ - ۳۸)

(۱) د "حبالک" دمیة القصر "خیالک" والاصلاح عن الارساد

(۳) دمیة - "اعاد طراز" الخ

(۴) ایضاً - و شبک المضی

(۶) ایضا - "و لکن إشراقها" - و "برق" موضع "ثغر" و د "نقی"

(۷) هذا البیت عن بیت حماسّی سائر :

تمتع من شمیم عرار نجد فما بعد العشیه من عرار

(۸) الدمیة - "عهدی" موضع "شوقی" ود "بعد احدی"

و ترمی قوألمها کالسهام (١٢) و تبری هیاکلها کالقسی
بیهماء أحشاء أحسانـهـا (١٣) تشکت الی الرکب وقع الدلی
تغلّ الفطا و هی اهدی الطیور (١٤) نظلّ بها کالغوی الغبی
الی مثلها طال باعی و طاب (١٥) لجبی اجتناب الفراش الوطی
و اسکرنی سرب کاس السری (١٦) علی شد و جنیها الجهوری
و سُمتُ الرکائب حتی انخن (١٧) بسیط الانامل سبط النبی
علی بن موسی مواسی العفاة (١٨) ابی القاسم السید الموسوی
خصیب الثری عضّ نبت المراد (١٩) رحیب الذری عذب ماء الرکی
طما بالندی وادیا راحتیه (٢٠) فطمّا علی آذیات القری
و قد طفق مرو تعتدّ منه (٢١) بخلقٍ رضی و خلق وضی
کما اعتدّ بغداد فما سمعت (٢٢) بالمرتضی و اخیه الرضی
یطرّز سالعود ندُ النوال (٢٣) و یتبع و سمیّه بالولی
به زهی المجد و المکرمات (٢٤) کزهو الردینی بالقعضبی
نسیبٌ له شرف الانتساب (٢٥) اذاقل منه نصیب الدعی
نماه الفخار الی جده (٢٦) ففاز بجدٍّ علیٍّ علی
و لا یتأ شب عیص السری (٢٧) اذاً هو لم یکن ابن السری
معاد معادیه مهما طوی (٢٨) علی بغضه القلبَ تعر الطوی
و امثل احوال اعدائه (٢٩) و کلّهم رهن داء دوی

---

(١٣) د ''احشوا احسائها والدمیه ''بیهماء احشاء احشائها''
(١٩) د ''رحیب الرذی''
(٢٠) د ''اذیات'' والدمیة ''آجنات''
(٢٥) د ''المدعی''
(٢٦) الارشاد - ''قطار'' موضع '' ففاز''
(٢٨) الدمیة - ''معادیة''
(٢٩) ایضاً - ''نهب'' موضع ''رهن''

عصیٌّ مکلّلَـةٌ بالروٰس (۳۰) و روٰسٌ مکلّلَـةٌ بالعصی

ابا قاسم یا سمیم السخاء (۳۱) اذا جف ضرع الغمام السخی

وفدت علیک مع الوافدین (۳۲) وفود البشارة عبّ النعی

وزارک منّی سمیٌّ کنیٌّ (۳۳) فراع حقوق السمی الکنی

و قد هدم النصّ من ناقبی (۳۴) سناماً مشیداً برعی النصی

نهاک القصیدة بکرا تصل (۳۵) علی نحرها حصباتُ الحلی

جعلت هواک جهاً زالها (۳۶) فجاء تک مانسة کالهدی

سحرت بها ألسن السامرین (۳۷) و لم اترک السحر للسامری

و لما نشرت اماویقها (۳۸) طوی الناس دیباجة البحتری

فقُز من جناها نحلو نضیج (۳۹) هنی کخمر من الرّاح نی

و حاوربها جنـة بسطها (۴۰) من الرفرف الخضر العبقری

و رُبَّ کلام یجر السقام (۴۱) بمرعی و بیل و جوّ و بی

یلجلجه طامع قانع (۴۲) بشیع یساق الیه وری

بشیم مخائل عیم جهام (۴۳) و ینط أوشال حسّی بکو

فان حاک هلهل کالعنکبوت (۴۴) نسایج من عرض سابری

و ان صال ولّی قفاه مرارا (۴۵) و ان قال الجم فاه بعی

---

(۳۱) الارشاد - ''الجی'' موضع ''السخی''
(۳۲) ایضاً - ''وفدت الیک''
(۳۳) د - ''سنی کنی''
(۳۵) الارشاد - ''فهذی القصیده بکر'' و حصبات
(۳۹) د ''لحم''
(۴۱) د ''وبیل''
(۴۲) د '' بشیع''
(۴۳) د ''حسن بکی''
(۴۵) د ''الجمر''

بشیح لیبلغ شأو الفحول (۴٦) و ذاک اذا نشأ ابن الخصی
اتـاک الصیام فـعـاشرتـه (۴۷) بعرض نقی و قلب تقی
و اوجبت للقوم هشم الثرید (۴۸) علی شرط منصبک الهاشمی
فعید اذا الافق فی الغرب بتّ (۴۹) سناً س جلی به منجلی
بقیت لتسحب ذیل الفخار (۵۰) و ترفل فی ظلّ مال رخی
و عمرت مادام زغف الدروع (۵۱) عداه اللقاء قمیص الکمی
فلو لم تسدّ مکان النبی (۵۲) لاصبح رتماً مکان النبی

(۴٦) د "مشا" - و أشاح أی جد فی الاثر
(۴۹) د "حلی به منحلی" والاصلاح عن الدمیه

ڈاکٹر فواد سیزگن

اهمیة الروایة الاسلامیة

ایها الحاضرون الکرام -

ارید اعرض علی حضراتکم خلاصة بحث عما یتعلق بمصدر مهم من مصادر التاریخ الاسلامیه و هو عبارة عن الروایة الاسلامیة -

حینما اراد القدماء المسلمون ان یذکروا فی مصادر التاریخ الاسلامی اشاروا الی اهمیة علم الحدیث و قالوا ان علم التاریخ فن من فنون الحدیث والباحثون المحدثون ایضاً - منذ ما ابتدؤ وا بالاشغال بمصادر التاریخ الاسلامی لم یغفلوا عن اهمیة علم الحدیث لانهم من بادی الامر رأوا المکانة الکبیرة التی اخذها اسلوب الروایة فی التالیف الاسلامیة فی قرونها الاولی -

و هنا فرق کبیر بین الاهمیة المعترف بها قدیما و بین التی اعترفوا بها فی القرنین الاخیرین -

و کان عند القدماء قواعد معیّنة واضحة بینهم کانوا ینقدون الاخبار و یقدرونها تحت ضوء هذه القواعد - و قد اصبحت هذه القواعد عندهم علماً سموها بمصطلح الحدیث و اما المحدثون لا یعطون قیمةً کبیرةً لهذه القواعد وَ ینسون فیها اشد الیأس اکثر من اللازم - -

و هو لاء المحدثون مختلفون بینهم ایضاً باختلاف شدید - فمثلاً المستشرق الشهیر گولدزهر متعجب من رأی المستشرق الهالندی دوزی القائل بصحّة قسم کبیر من الحدیث النبوی و مثلاً لوی کاتیانی الاطالیانی یبجّل گولدزیر فی رده دوزی و یحمل قوله علی تفاول ساذج منه - و کذالک نری اختلافاً کبیراً بین هوررونیز و قبهم سورة المستشرق الفرنساوی حیث یعتمد الاول علی الروایة الاسلامیة اعتماداً قویا والآخر ینکر ها اشد الانکار -

یرجع السبب الاول فی هذا الاختلاف الکبیر فیما اظن الی خاصة من خصائص الروایة الاسلامیة التی یصعب فهمها علی المتعودین بروایات موجودة فی الادیان الاخری و هذه الخاصة التی قد سمیت قدیما بکلمة "الاسناد" و هی مرکز اختلاف الفهم -

لا نستطیع هنا ان نتحدث عن تطور الاسناد حدیثاً طویلاً و نکتفی بالاشارة الی نتائج بحث قد نشر فی الایام الاخیرة تحت اسم "دراسات حول مصادر البخاری" و من النتائج ان الاسناد تأسس فی اواخر القرن الاول الهجری و الاحادیث النبویة خاصة و الاخبار الاسلامیة عامة قد دوّنت فی نفس الوقت و جاء بعد عهد التدوین تقریباً من ربع قرن عهد التصنیف - حیث اخذ المحدثون المصنفون یقسمون الاحادیث المدونة علی الابواب - و اخبار المصادر الاسلامیة لهذین العهدین واضحة تماماً و یؤیدها بعض ما وصل لنا من التراث الاسلامی الکبیر -

و اما البحث الحدیث عن هذا التراث فیرجع الی اواسط القرن التاسع عشر المیلادی و یعتبر المستشرق شپرنگر ممن لهم مکانة کبیرة فی دراسة الروایة اسلامیة حیث استطاع ان یجمع بعض الوثائق الاولیة للاحادیث النبویة - و قد تبعه تلمیذه گولدتسهر و اضاف علی نتائج استاذه اشیاء اخری و الف کتابه الضخیم "محمد یانشر ستو دین" و عند نشر تألیفه هذا مکتسبا لمصادر الحدیث النبوی و هذا الکتاب بعد تالیفه بستین سنة لایزال یعد مرجعاً وحیداً فی موضوعه و غیر متغیر النتائج -

و فی الحقیقة قد درس المؤلف الروایة الاسلامیة دراسة واسعة و استفاد من مواد عزیزة من تالیف و لکنه فیما اعتقد قد اغفل من نظره ناحیة مهمة للروایة الاسلامیة إذا اعرضنا عن النتائج الفرعیة التی تغیرت بمضی الزمن و تطور العلوم -

لقد عرّف المحدثون القدماء الإسناد بایصال حدیث او خبر إلی قائله الاول و هو تعریف لا یوافی افادة المحدثین ایاه حیث قالوا "إن الاسناد ذکر اسامی الرواة لحدیث او خبر" و روی شفویا الی ان تید بالکتابة - و هذا لوصف الشفوی سیجعلهم لهم اثر الروایات الموجودة فی الادیان الاخری و اضیف إلی الاسناد الاسلامی -

و قلنا قبل هذا إن المستشرق شپونکر و تلمیذه کولدزیهر کانا یعد ان س مکتشفی المصادر المکتوبة للحدیث النبوی ۔ فمثلاً صادفوا فی بعض المراجع اسماء صحف فی القرن الاول للهجرة و لکنهما حینما راوا الاسانید الموجودة فی المصنفات و مثلاً فی الکتب الستة نسوا ان هناک تحت سلاسل الرواة مصادر مکتوبة ۔ هذه الظاهرة جلیة تماماً فی کتاب کولدزیهر المذکور اثناء قوله: لم یستطع البخاری و لا المصنفون المعاصرون له ان یستفیدوا من شی مکتوب قبلهم و اضطروا ان یرحلوا فی البلدان المختلفه لیجمعوا الاحادیث فیصنفوها ۔ و هذا الفهم لا یوافق ابدا فهم القدماء المحدثین ولاالقواعد المعروفة عندهم فی عصر التالیف ۔

اذا درسنا المصنفات القدیمة للحدیث بالامعان و قرانا کتب مصطلح الحدیث لشاهدنا اسانید الاحادیث و الاخبار تخفی تحتها المصادر المکتوبه ۔ فمثلاً اذا رأینا اسناداً فی صحیح البخاری هکذا حدثنا عبدالله ابن یوسف حدثنا مالک ۔ حدثنا الزهری الی آخر سند الحدیث لنفکرهنا قبل کل شی ان البخاری قد استفاد من کتاب لهذه الاشخاص المذکوره فی الاسناد ۔ و وجود نفس الحدیث فی کتاب الموطا للامام مالک یودینا الی فهم ان البخاری قد اخذ هذا الحدیث من موطا مالک و هذا الفهم لیس شی جدید بل هو فهم الشراح و موافق لقولهم فلنأخذ مثالاً آخر من البخاری حدثنا محمد بن سلام ۔ حدثنا عبدالرزاق حدثنا معمر ابن راشد، حدثنا الزهر ... الخ ۔ سند الحدیث یغلب هنا علی الظن ان البخاری اخذ الحدیث من جامع معمر ابن راشد الذی وصل الینا منه نسختان ۔ و لکننا لا نستطیع ان نجزم بان مصدر البخاری لهذا الحدیث هو جامع معمر ابن راشد ربما هو اخذ الحدیث من کتاب تلمیذه عبدالرزاق و عبدالرزاق اخذ من کتاب معمر ابن راشد ۔ و هذه المسالة تقتضی منهجا خاصاً سوف لا نخوض فی تفصله هنا ۔ والذی یهمنا الآن هو ان البخاری و المحدثین الاخرین اخذوا احادیث کتبه من المصادر المکتوبة قبلهم و کانت العادة عندهم ان یأخذوا من الکتب فیسند الاخبار لاسباب مختلفة فی القرنین الاولین من الهجرة ۔ و کان عندهم القواعد یسمونها ''تحمل العلم''، و کان الاستاذ یقرا کتابه و کتاب شخص آخر علی تلامذة و هم یسمعون منه او احد التلامذة

یقرا علی الشیخ و الشیخ یسمع و یسمون الاول "السماع" و الثانی "القراءة" و قد تطورت عندهم انواع اخری من طرق التحمل کمناوله والمطالبة و الاجازة الی آخر - و فی کل نوع من التحمل کانوا یستعملون صیغة حدثنا او اخبرنا - لاستنادهم من الکتب الی ان جاء البخاری فاراد ان یلخص کتب حدیث النبوی ابب احیاناً الاسانید و حذفها احیاناً اخری بصیغه قال او ذکر او قل او یذکر او یقال - و هذه الصیغة التی سماها المحدثون بعد البخاری التعلیق و ناقشوا سبب قطع الاسناد و حکمه فی التشریح - و لکنهم فیما اظن لم یصلوا الی نتیجه معینة و حسن لدی فی دراستی حول مصادر البخاری ان احمل هذه التعلیقات علی نوع الوجاده من طرق تحمل العلم ای البخاری کان عنده کتب کثیرة - یستطع ان یقرا بعضها علی استاذه او یسمع منه ولکنه کان یعتمد علی صحه هذه الکتب و کان عزیز علیه اهمالها فنقل منها ما یزید عدده علی الفین و حسمائه حدیث -

ففی هذه الحاله ان البخاری اول محدث قد هدد سطرة الاسناد و بهذا التهدید استطاع ان یوسع نطاق المصادر بینما مسلم لم یعلق الاحدیثا واحداً -

عادة المحدثین هذه ای اخذهم من الکتب و اقامتهم فی مکانها الاسانید هی عاده المؤرخین والمفسرین الاسلامیین فی القرون الاولی من الهجرة وقد خفیت هذه العادة علی الباحثین المستشرقین فعدوا مواد المؤلفات الاسلامیه عبارة عن اخبار شفویه فلم یعتمدوا علیها -

فمثلاً قال کولدزیهر إن البخاری لم یستطع الاستفادة من کتب موجودة قبله علی ان معظم مصادر البخاری قد وصلت الینا - و قال المستشرق الفرنساوی "سوره" إن مصادر التاریخ الاسلامی شفویة فی القرنین الاولین و لاجل هذا یضطر المؤرخ الاروبی اذا یکتب تاریخ الاسلامی من بین رماد و زند و کذا المستشرق بلاشر یقول نفس القول فی مصادر التفسیر و فیما یتعلق عن حیاة النبی -

و کذالک المستشرق الالمانی شاخت افاد عدم اعتماده علی الحدیث النبوی فی کل فصل بین فصول کتابه فی التشریع الاسلامی -

فامثلة هذا الفهم كثيرة ۔ لانرى فائدة فی ذکر کلها و لیس غرضنا هنا الطعن فی الناس بل غرضنا هو الاشارة إلى ان الاسانید الموجودة فی المصنفات القدیمة تخفی تحتها مصادر مکتوبة و لیس هی شفویة کما فکر کثیرون من الناس ۔ و لا ندعی هنا ان الاحادیث و الاخبار یجب الاتکون صحیحة لکون مصادرها مکتوبة بل غرضنا هو اقامة مقیاس معتدل فی تقدیر الاحادیث مکان حکم یوافق حقائق الروایة الاسلامیة و ینکرها اشد الانکار ۔

الف ۔ د ۔ نسیم

خواجہ میر درد کا خاندان

خواجہ میر درد اردو کے ان چند شاعروں میں سے ہیں جو اپنے فن اور شخصیت کے اعتبار سے بلند مقام رکھتے ہیں ۔ ان کی ذات میں شخصی کمالات و اوصاف اور خاندانی فضائل و خصائص کا ایسا خوشگوار امتزاج ملتا ہے کہ وہ اس اخص زمرے میں بھی ممتاز نظر آتے ہیں ۔ تذکرہ نگاروں نے انہیں بارھویں صدی ہجری کے اولیائے عظام اور صوفیائے کرام میں شمار کیا ہے اور ان کے خاندان کی ثروت، سیادت، شرافت اور نجابت کے ذکر میں خاص اہتمام سے کام لیا ہے اپنی نجیب الطرفینی اور صحیح النسبی کا خواجہ میر درد کو بھی گہرا احساس تھا اور وہ اسے اپنے اور اپنے خاندان کا طرہ امتیاز اور نشان فضلیت سمجھتے تھے۔ وہ اپنی تصنیف علم‌الکتاب میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ (۱)

" آبا و اجداد پدری و مادری الی‌انفسنا و دریاتنا و نسائنا و همه اطراف ایسان سادات صحیح النسب و ذوات رفیع الحسب بوده اند و هستند .... غرض‌که اوصاف ظاهری و باطنی بزرگان خود تا کجا نگارم که بفضل الہی حدے و نہایتےندارد و هم منجر به خود ستائی نه گردد و احتمال افتخار نه شود "

خواجہ میر درد ماں اور باپ دونوں طرف سے صحیح النسب حسینی سید اور سادات بنی فاطمہ میں سے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب باپ کی طرف سے حضرت خواجہ بہاءالدین نقشبند اور ماں کی جانب سے حضرت محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانی تک پہنچتا ہے۔ اس کا ذکر ان کے والد خواجہ محمد ناصر عندلیب نے

---

۱ ۔ علم‌الکتاب از خواجہ میر درد صفحہ ۸۴ ۔

خود ھی اپنے رسالہ ھوش افزا میں لیا ھے جہاں ایک بزرگ ان کے متعلق کہتے ھیں کہ (۱)

" شما از مادر و پدر صحیح النسب بنی فاطمہ و سید حسینی ھستید کہ سیادت و نجابت شما از آفتاب و ماھتاب مشہور تر است ... .
از جانب پدر از نبیرہ ھائے قدوۃ العرفا خواجہ خواجہ ھا حضرت بہاء الدین المعروف بہ نقشبند ھستید و از طرف والدہ از نبیسہ ھائے محبوب سبحانی سید عبدالقادر جیلانی می شوید،،

بعض تذکرہ نویسوں نے خواجہ میر درد کے سلسلہ پدری کو حضرت محبوب سبحانی سید عبدالقادر جیلانی سے اور سلسلۂ مادری کو حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند سے ملایا ھے جو درست نہیں ھے ۔ خواجہ میر درد کا اپنا بیان بھی ان تذکرہ نویسوں کی رائے کے خلاف ھے ۔ وہ علم الکتاب میں کہتے ھیں کہ (۲)

" حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند قدس سرہ العزیز کہ از سادات حسینی صحیح النسب اند با یازدہ واسطہ جد پدری بندہ اند،،

اس بیان کی رو سے حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند گیارہ واسطوں سے حضرت خواجہ میر درد کے جد امجد ھوئے۔ وہ تصوف کے مشہور سلسلۂ نقشبندیہ کے سربراہ تھے اور ان کا اصل نام محمد بن محمد البخاری تھا (۳) ۔ ان کے نام کے ساتھ لقب خواجہ اور نسبت نقشبندیہ کا اضافہ جسے بعد میں ان کی اولاد نے بھی ورثے میں پایا، بغیر وجہ کے نہیں ھے ۔ لقب خواجہ پر روشنی ڈالتے ھوئے حضرت خواجہ میر درد علم الکتاب میں کہتے ھیں کہ اس کے معنی مالک سردار صاحب اور مولیٰ کے ھیں ۔ اس لئے اس کا اطلاق مولی الموالی علیہ السلام کی اولاد پر ھوتا ھے اور اکابر سادات اسی لقب سے ملقب رھے ھیں ۔ کتاب کی عبارت یہ ھے (۴)

---

۱ ۔ رسالہ ھوش افزا (مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی) از خواجہ ناصر عندلیب صفحہ ۹۶ ب ۔

۲ ۔ علم الکتاب صفحہ ۸۴

۳ ۔ کتاب اعراس بزرگان صفحہ ۴۵

۴ ۔ کتاب اعراس بزرگاں صفحہ ۴۵

" خواجه بمعنی مالک و سردار و صاحب و مولی است لهذا اطلاق آں بر ذریات مولی الموالی علیه السلام کرده اند و اکابر سادات ملقب به لقب خواجگان شده اند و حضرت بهاء الدین نقشبند قدس سره العزیز که از سادات صحیح النسب اند و با یازده واسطه جد پدری بنده اند نیز خواجه می گفتند"

نواجه بهاء الدین کے نقشبند کہلانے کی جو وجوہ بیان کی جاتی ھیں ان میں ثقه جه ان کا پیشه کمخواب بافی و نقشبندی ہے جس کی بنا پر وہ نقشبند مشہور ہوگئے ۔ داراشکوہ نے سفینۃ الاولیا میں رسالہ بہائیہ کے حوالے سے جو خواجه ذکور کے حالات میں ہے لکھا ہے که (۱)

" حضرت می فرمودند که من و پدرم به صنعت کمخواب بافی و نقشبندی مشغول بودیم (ازیں سبب ایں نسبت را بنام من کردند)"

ور پھر لکھا ہے که (۲)

" همیں نقل را بخط حضرت مولانا عبدالرحمن جامی قدس سره نیز نوشته یافتم"

خواجه میر درد اور ان کے آبا و اجداد نے بھی لقب خواجه اور نسبت نقشبندیه کو حضرت خواجه بزرگ سے ورثے میں پایا اور اس سرمائے کو همیشه اپنے لئے باعث تخار و فضلیت سمجھا ۔ خواجه میر درد کے نام میں تو لفظ خواجه ان کے نام کا ز ہے لقب نہیں ۔ یه نام ان کے نانا سید محمد قادری نے رکھا تھا اور انہوں نے ض اس کی مذکورہ صدر فضلیت کی بنا پر اسے جزو نام بنا دیا ہے ۔ اس کی ضاحت خواجه میر درد نے خود ھی اپنی تصنیف علم الکتاب میں کی ہے وہ کہتے ھیں که (۳)

---

۱ ۔ سفینۃ الاولیا از دارا شکوہ صفحه ۷۰

۲ ۔ سفینۃ الاولیا از دارا شکوہ صفحه ۷۰

۳ ۔ علم الکتاب صفحه ۸۴

" ایں اسم فقیر کہ خواجہ میر است وقت تولد بندہ والد بزرگوار والدہ ماجدہ ام سید العارفین میر سید محمد حسینی قادری بن نواب میر احمد خان شہید گذاشتہ اند"

اور پھر لقب خواجہ کا پس منظر بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ (۱)

" بمناسبت ایں وجوہ مسمی بہ خواجہ میر کردہ اند"

حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند سادات بخارا میں سے تھے۔ وہ ۱۸ء میں (۲) بخارا ہی میں (۳) خواجہ عبداللہ بخاری کے گھر پیدا ہوئے جو سید جلال الدین بخاری، سید برہان الدین بخاری، سید کمال الدین بخاری، سید حسین ملقب بہ محبوب، سید حسین اکبر، سید عبداللہ، سید فخرالدین، سید محمود رومی، سید حسین مقتول، سید حسن محمد نقی، سید عبداللہ، سید جامع اور سید علی اکبر کے مزید چند واسطوں سے حضرت امام عسکری کی اولاد تھے۔ ان کے سلسلہ نسب کی ان کڑیوں کا ذکر ریاض الانساب (۴) اور کنزالانساب (۵) کے مصنفین نے کیا ہے۔ خواجہ میر درد نے بھی علم الکتاب میں اس پر کچھ روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں کہ (۶)

" حضرت خواجہ نقشبند بہ سیزدہ واسطہ فرزند حضرت امام عسکری ہستند و ما بہ نسب و پنج واسطہ۔ باقی یازدہ ائمہ بہ ترتیب آبا و اجداد اند"

حضرت خواجہ بہاالدین نقشبند کا روحانی انتساب حضرت سید امیر کلال سے تھا (۷) جن کا شجرہ ایک طرف حضرت ابو بکر صدیق اور دوسری طرف حضرت علی کرم اللہ وجہ

---

۱ - علم الکتاب صفحہ ۸۴
۲ - انیس الطالبین از صلاح بن مبارک ص ۸۴
۳ - فہرست کتب خانہ برٹش میوزیم صفحہ ۲۷
۴ - ریاض الانساب (مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی) - صفحہ ۲۱۰
۵ - کنزالانساب (مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی) صفحہ ۱۰۷
۶ - علم الکتاب صفحہ ۸۴
۷ - شجرۃ الیقین (در بیان خواجہ نقشبند)

ہے ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سلسلہ کے ایک بزرگ جن کا نام شیخ ابوالقاسم تھا شیخ ابوالحسن خرقانی کے مرید بھی تھے جن کی نسبت شیخ ابویزید،حضرت امام جعفر صادق، حضرت خواجہ محمد باقر، حضرت زین الدین علی اور امام حسین کے ذریعے حضرت علی تک تھی اور ایک ایسے بزرگ سے بھی ارادت رکھتے تھےجن کے ذریعہ یہ شجرہ روحانی حضرت ابوبکر صدیق تک پہنچتا ہے۔ علی بن ملا حسین واعظ کاشفی نے اپنی تصنیف رشحات میں شیخ ابوالقاسم تک حضرت خواجہ بہاءالدین نقشبند، حضرت سید امیر کلال، خواجہ علی رامتینی، خواجہ محمود انجیر فغنوی، خواجہ عارف، خواجہ عبدالخالق غجدوانی، خواجہ یوسف ہمدانی، خواجہ ابوعلی فارمدی کے ذریعے صرف واحد سلسلہ روحانی کا ذکر کیا ہے (۱) اس کے بعد اسے حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت علی تک دو شاخوں میں تقسیم کیا ہے۔ حضرت خواجہ بہاءالدین نقشبند نے عموماً اور شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے خصوصاً نسبت صدیقیت پر زیادہ زور دیا ہے۔ لیکن خواجہ میر درد اور ان کے والد کا رجحان (جیسا کہ بعد میں ذکر آئے گا) حضرت علی کی طرف معلوم ہوتا ہے۔

خواجہ بہاءالدین نقشبند ایک مدت تک خلق خدا میں رشد و ہدایت کی شمع جلانے کے بعد شب دو شنبہ ۳ ماہ ربیع الاول ۷۹۱ھ عمر ۷۳ سال فوت ہوکر (۲) شہر بخارا سے ایک کوس کے فاصلے پر قصر عارفاں میں مدفون ہوئے(۳) اور انہوں نے

---

۱ - رشحات از علی بن ملا حسین واعظ کاشفی (مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی) ص۔

۲ - ریاض العارفین ص ۱۳۰

۳ - خواجہ علا الدین عطار کی کہی ہوئی مندرجہ ذیل تاریخ دیکھئے

رفت شاہ نقشبند آں خواجہ دنیا و دین
آں کہ بود شاہراہ دین و دنیا ملتش
مسکن و ماوی او چوں بود قصر عارفاں
قصر عرفاں زاں سبب آمد حساب رحلتش
۷۹۱ھ

اپنے پیچھے ایک لڑکی یادگار چھوڑی جن کا نام فاطمہ ثانی تھا (۱) حضرت فاطمہ ثانی کی شادی خواجہ بزرگ نے اپنی زندگی ہی میں اپنی خانقاہ کے ایک درویش خواجہ علاالدین عطار سے کردی تھی جس واقعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے علی بن حسین واعظ کاشفی نے رشحات میں لکھا ہے کہ (۲)

"حضرت خواجہ بزرگ را صبیہ صغیرہ بودہ است بوالدہ وے گفتہ اند که چوں بہ بلوغ رسد مرا ہماں زماں آگہ کنند چوں آں وقت رسید حضرت خواجہ از سر غاراں شہر آمدند و یکسر بہ حجرہ خواجہ علاالدین که در مدرسہ داشتند رفتند . . . . . . چوں خواجہ علاالدین ایشاں را دیدند در قدم ایشاں سر نہادند و نیازمندی بسیار کردند حضرت خواجہ فرمودند که مرا صبیہ ایست که بہ حد بلوغ رسیدہ و من ماموروم بہ آں که وے را بہ حبالہ عقد تو در آرم خواجہ علاالدین تواضع نمودہ گفتہ اند که ایں سعادت است عظیمے که روئے بمن آوردہ لیکن مرا از اسباب دنیوی ہیچ چیز نیست که صرف کنم و حال ایں است که مشاہدہ می فرمائید حضرت خواجہ فرمودند که ترا او را من عنداللہ رزق مقدر و مقرر است ازاں ہیچ فکرے نیست پس آں عقد واقع شد"

حضرت فاطمہ ثانی کے بطن سے دو بیٹے پیدا ہوئے جن میں سے ایک کا نام خواجہ حسن عطار تھا اور دوسرے کا خواجہ حسین عطار ـــــــ کتب انساب میں آگے ان کی اولاد میں متعدد شاخیں ہو جانے کی وجہ سے مزید کڑیوں کا ذکر بہت کم ملتا ہے ۔ عبدالرزاق بہاری نے کنزالانساب میں خواجہ حسین عطار کے ایک بیٹے یوسف عطار کا نام لیا ہے اور اس کے بعد لکھا ہے کہ (۳)

---

۱ - علی بن حسین واعظ کاشفی نے رشحات میں لکھا ہے کہ خواجہ بزرگ کے گھر چار بیٹیاں اور دو بیٹے پیدا ہوئے لیکن حضرت فاطمہ ثانی کے سوا ساری اولاد کم عمری میں مر گئی (ص د ـ)

۲ - رشحات (در ذکر خواجہ علا الدین عطار)

۳ - کنز الانساب از عبدالرزاق بہاری ص ۱۰۸/۱۰۵

ازآن بعد معلوم نیست کیفیت بالتصریح ـــ باید دانست هنوز اولاد حضرت خواجه در بخارا شریف اند،، (۱)

ان خواجگان بخارا میں سے ایک بزرگ جن کا نام خواجہ محمد طاہر نقشبند تھا شہنشاہ اورنگ‌زیب کے زمانے میں اپنے چند بھائیوں بیٹوں اور برادر زادوں سمیت دلی میں آئے جو ہندوستان میں خواجہ میر درد کے خاندان کے مورث اعلیٰ تھے اس کی تصدیق رسالہ ہوش افزا کی اس عبارت سے ہوتی ہے (۲)

"اجداد شہ سہ نفور بودند مع چند پسران از بخارا دریں جا رسیدہ اند و ارشد ازانہا خواجہ محمد طاہر نقشبند است،،

تاریخ کملا کے مولف نے بھی لکھا ہے کہ (۳)

ایں خواجہ میر درد عارف کامل بود ابن بن خواجہ محمد طاہر

دلی پہنچ کر خواجہ محمد طاہر نقشبند نے شہنشاہ عالمگیر سے ملاقات کی ۔ بادشاہ نے انہیں تسبیح خانہ میں اپنے برابر بٹھایا اور ان کے شایان شان منصب بھی عطا کرنا چاہا لیکن انہوں نے قبول نہ کیا ۔ آخر کچھ عرصہ بعد وہ اپنے بیٹوں خواجہ محمد صالح، خواجہ محمد یعقوب، خواجہ فتح اللہ خان اور بھائیوں اور برادر زادوں کو بادشاہ کے پاس چھوڑ کر (۴) خواجہ ناصر عندلیب کی روایت کے مطابق حج کے لئے (۴) اور ساقی خان مصنف مآثر عالمگیری کے بیان کے مطابق اپنے وطن واپس چلے گئے (۵)

---

۱ - سید ناصر نذیر فراق نے میخانہ درد میں خواجہ میر درد کا جو نسب نامہ دیا ہے اس میں خواجہ بہاالدین نقشبند تک کی نسبی کڑیوں کا ذکر اس طرح موجود ہے -

خواجہ میر درد بن خواجہ محمد ناصر عندلیب بن نواب روشن الدولہ ظفر اللہ خان بن نواب سید خواجہ فتح اللہ خان بن خواجہ محمد طاہر بخاری بن خواجہ عوض بخاری بن خواجہ سلطان احمد بن خواجہ میرک بن سلطان احمد ثانی بن خواجہ قاسم بن خواجہ شعبان بن خواجہ عبد اللہ بن خواجہ زین العابدین بن خواجہ سید بہاؤالدین نقشبند (ص ۱۸ میخانہ درد)

۲ - رسالہ ہوش افزا ـ ص ۹۴ ب -

۳ - تاریخ کملا ص ۱۰۷ -

۴ - رسالہ ہوش افزا ـ ص ۹۴ ب -

۵ - مآثر عالمگیری جلد دوم از ساقی خان ص ۱۳۱ -

عالم گیر کی خواجہ محمد طاہر اور ان کی اولاد کی طرف اس توجہ خصوصی کی وجہ مغل پادشاہوں کی خواجگان نقشبند سے روحانی ارادت اور عقیدت مندی تھی جس نے بڑھتے بڑھتے رشتوں ناتوں کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ھندی مغلوں کے جد اعلی صاحبقران امیر تیمور گورگان خواجہ بہاالدین نقشبند کے مرشد حضرت امیر کلال کے مرید تھے جس کا ذکر انہوں نے خود ھی تورک تیموری میں کیا ھے۔ اس نسبت کی وجہ سے وہ حضرت خواجہ بہاالدین نقشبند کے بھی بہت زیادہ معتقد اور نیاز مند تھے اور ان کی خاک پا کو اپنے جسم کے لئے عبیر و صندل سمجھتے تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی سرھندی نے اس عقیدت کی مثال دیتے ہوئے اپنے ایک مکتوب میں لکھا ھے کہ (۱)

"شنیدہ ام کہ روزے صاحبقران امیر تیمور گورگان علیه الرحمته به کوچه بخارا می گذشت اتفاقاً درویشان خانقاہ حضرت خواجه بہاالدین نقشبند قدس سرہ درآں کوچه گلیم ھائے خانقاہ خواجه را می افشاندند و از گرد پاک می کردند۔ امیر از حسن ادب مسلمانی که داشت درآں کوچه توقف فرمود تا گردھائے خانقاہ را عبیر و صندل خود ساخته ببرکت توجھات درویشان مشرف گردد۔ مگر باین تواضع و فروتنی که بہ بل الله نمودہ بود بحسن خاتمه مشرف گشت منقول است که حضرت خواجه نقشبند قدس سرہ بعد از وفات امیر می فرمودند تیمور مرد و ایمان برد"

امیر تیمور گورگان کی وفات کے بعد بعض دوسرے مغل پادشاھوں اور امرأ نے خواجگان نقشبند سے عقیدت کیشی اور نیازمندی کو اپنے لئے سعادت عظمے سمجھا اور اس سرمائے میں اضافے کے لئے مختلف وقتوں میں شہزادیوں کی شادیاں بھی ان سے کر دیں۔ مثال کے طور پر جہانگیر نے توزک جہانگیری میں لکھا ھے کہ ان کے چچا میرزا محمد حکیم نے اپنی بہن کی شادی خواجگان نقشبند میں سے حسن خالدار نامی ایک بزرگ سے کر دی تھی (۲) توزک کی عبارت یہ ھے۔

۱۔ مکتوبات مجدد الف ثانی دفتر سوم حصہ ھشتم مکتوب ۹۰۔ ص ۹۳۔
۲۔ توزک جہانگیری۔ ص ۲۷۔

" خواجه حسن خالدار از خواجه زادهائے نقشبند اسب عم من میرزا محمد حکیم همشیره خود را بخواجه نسبت کرده بودند،،

سہنشاہ عالم گیر کے زمانے میں خواجگان نقشبند اور شاہی خاندان کے روابط پہلے سے بھی مضبوط ہوگئے تھے۔ جس کی وجہ بعض مزید ازدواجی رشتوں کے علاوہ خود شہنشاہ کی نقشبندیہ بزرگ حضرت خواجہ مجدد الف ثانی سرھندی کے فرزند ارجمند اور حلقہ عروہ الوثقی حضرت خواجہ محمد معصوم کے ھاتھوں پر بیعت تھی۔ خواجہ معصوم کی ان پر خاص نظر تھی۔ انہوں نے اپنے بیٹے خواجہ سیف الدین کو بادشاہ کی روحانی تربیت کے لئے ان کے محل ھی میں تعین کر رکھا تھا جو خط و کتابت کے ذریعے اپنے والد بزرگوار سے بادشاہ کے روحانی مسائل کی بابت صلاح مشورہ کرتے رھتے تھے۔ اس قسم کے متعدد مکاتیب خواجہ محمد معصوم کے مجموعہ مکاتیب میں ملتے ھیں۔ اور بعض مکاتیب سے بادشاہ کے بلند روحانی مقام پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ایسے ھی ایک مکتوب میں جو خواجہ سیف الدین کے کسی خط کے جواب میں ہے خواجہ محمد معصوم نے لکھا ہے کہ (۲)

" آنچه از احوال بادشاه دین پناه مرقوم نموده بودند همه بوضوح انجامید در طبقه سلاطین ظهور این نوع امور از غرائب روزگار است... .... نوشته بودند که مبدأ تعین خود را صفت علم دریافته اند و می فرمانید که تاس صفت مبارک بسیر مناسبت یافته می شود و از مطالعه آن حظها نمود نزدیک بود که رقص کنند،،

اس مکتوب سے شہنشاہ کے بلند روحانی مقام پر بھی روشنی پڑتی ہے جو خواجہ محمد معصوم کے الفاظ میں صفت علم کا مقام ہے جسے انہوں نے ایک دوسری جگہ لطیفہ اخفی بھی کہا ہے اور لکھا ہے کہ یہ لطیفہ خاص نبی کریم ﷺ خصوصیت رکھتا ہے (۳)

---

۲ - مکتوبات حضرت خواجہ محمد معصوم دفتر سوم - مکتوب ۲۳۲ - ص ۲۸۷ -

۳ - ایضاً

" لطیفه اخفی اعلائے لطائف است و ولایت آن فوق سائر ولایت است و این لطیفه را خصوصیتے است خاص به سرور کائنات مفخر موجودات علیه و علی آله الصلوة .... فقیر نیز ایشان را (یعنی پادشاه را) مناسبتے به لطیفه اخفی در یافت "

حضرت مجدد الف ثانی سرهندی نے اپنے مکتوبات میں اس لطیفه اخفی یا صفت علم کے لئے شان کی اصطلاح استعمال کی ھے اور یہ بھی کہا ھے کہ اگرچہ اس لطیفے اور صفت کا تعلق خاص نبی کریم کی ذات مبارک سے ھے لیکن وہ ان کی امت میں سے اخص لوگوں کو بھی نصیب ہوتا ھے۔ پادشاہ کے روحانی مقام کی اسی بلندی کے انکشاف پر حضرت خواجہ محمد معصوم نے اپنے مکتوب میں لکھا تھا کہ طبعت چاھتی ھے کہ رقص کرے۔

عالم گیر نے نقشبندیہ بزرگوں کے اس احسان عظیم کو عمر بھر فراموش نہ کیا اور جہاں تک ہو سکا حضرت خواجہ بہاالدین نقشبند کی اولاد میں سے ہر بزرگ کی خدمت کی کوشش کی۔ خواجہ میر درد کے جد امجد خواجہ محمد طاھر اور ان کے خویش و اقارب کی قدر افزائی کا بھی یہی سبب تھا ۔ خواجہ محمد طاھر خود تو دلی سے چلے گئے لیکن اورنگ زیب نے ان کے بھائیوں اور اولاد کو جس عزت اور احترام کی مسند پر بٹھایا اس پر تاریخ کے صفحات شاھد ھیں ۔ انہوں نے خواجہ محمد طاھر کے بڑے بیٹے کو جن کا نام خواجہ محمد صالح تھا منصب اعلی عطا کر کے ان کی شادی اپنے بھائی مراد بخش کی لڑکی آسائش بانو سے کر دی ۔ خواجہ محمد ناصر عندلیب رسالہ ہوش افزا میں لکھے ھیں کہ (۱)

" آن شاہ عاقبت اندیش خواجہ محمد صالح را منصب نمایاں عطا کرد و با دختر برادر خویش شاھزادہ محمد مراد بخش کتخدا گردانید "

ساقی خاں مآثر عالم گیری میں اس شادی کی تفصیل دیتے ہوئے لکھتے ھیں کہ

" دوم جمادی الاخری به محمد صالح ولد خواجه محمد طاهر نقشبندی که وصلت او به آسائش بانو بیگم دختر مراد بخش مقرر شد خلعت و اسپ

---

۱ - رسالہ ہوش افزا ۔ صفحہ ۹۶ ب
۲ - مآثر عالمگیری - ص ۱۲۰

با ساز و طلا و جمدھر و کلگی مرصع و مادہ فیل عطا شد بحضور سر بلند خان و قاضی عبدالوھاب و ملا محمد یعقوب مجلس عقد منعقد گردید،،

خواجہ محمد طاھر کے دوسرے بیٹے کا نام خواجہ محمد یعقوب تھا۔ اورنگ زیب نے انھیں بھی منصب عمدہ بخشا اور ان کی شادی مراد بخش کی دوسری لڑکی سے کر دی۔ اس کا ذکر بھی رسالہ ھوش افزا میں ملتا ھے (۳)

''برادر دیگرش را کہ خواجہ محمد یعقوب نام داشت ھم منصب عمدہ بخشیدہ دوئم دختر شہزادہ مذ کور بہ حبالہ نکاحش در آورد،،

ساقی خاں نے اس مقام پر قدرے اختلاف کیا ھے اور خواجہ محمد یعقوب کو خواجہ محمد صالح کے بھائی کی بجائے برادر زادہ لکھا ھے جو شاید کتابت کی غلطی ھو۔

'' صبیہ مراد بخش بہ ازدواج خواجہ یعقوب برادر زادہ خواجہ صالح نقشبندی درآمد و خلعت و اسپ با ساز طلا و جیغہ سنگ یشم و چہار ہزار روپیہ نقد و مادہ فیل مرحمت شد۔ سر بلند خاں اول بر ڈیوڑھی نواب قدسیہ کریمۃ الخصائل بیگم صاحب جہت ادائے آداب برد۔ بعد ازاں در مسجد اکبر آبادی عقد نکاح شد بہ عوض مہر دو لک روپیہ،،

تاریخوں میں خواجہ محمد یعقوب کے ایک بیٹے کا ذکر بھی ملتا ھے جن کا نام خواجہ موسی تھا۔ ان کی شادی شہزادہ معز الدین کی بیٹی سے ھوئی تھی جو اورنگ زیب کی نبیرہ تھیں۔ رسالہ ھوش افزا سے معلوم ھوتا ھے کہ بادشاہ نے انھیں بھی منصب عالی پر سر افراز کیا تھا (۴)۔ اس کی شہادت تذکرہ چغتائیہ اور مآثر عالمگیری سے بھی ملتی ھے۔ تذکرۂ چغتائیہ میں خواجہ ذکریا اور خواجہ یحیی نام کے دو شہزادوں کے ضمن میں لکھا ھے کہ وہ خواجہ موسی کے بیٹے اور

---

۳ ۔ رسالہ ھوش افزا ۔ ص ۹۶ ب
۴ ۔ رسالہ ھوش افزا ۔ ص ۹۶ ب

شہزادہ معز الدین کے نبیسے تھے (۱) ساقی خاں نے مآثر عالم گیری میں خواجہ موسی کے لئے ''نبوہ سہزادہ معز الدین،، کے الفاظ استعمال کئے ھیں(۲)۔

خواجہ محمد طاہر کے سرشتہ بیٹے خواجہ فتح اللہ خان تھے جو خواجہ میر درد کے حقیقی جد امجد تھے تاہم گو کہ امیری میں منصب عمدہ عطا کیا اور شاہی نسل میں سادی کی پیش کش بھی کی لیکن انہوں نے اپنی صحیح النسبی میں فرق آجانے کے خیال سے اسے قبول نہ کیا۔ خواجہ میر اثر نے اپنی فارسی مثنوی بیان واقعہ میں خواجہ فتح اللہ خان کے انکار کی یہی وجہ بتائی ہے

او بداب خود نہ کرد این را قبول   تا نہ گردد مختلط آل رسول
(مثنوی بیان واقعہ)

آخرکار انہوں نے بادشاہ کے میر بخشی نواب سر بلند خان کی حقیقی بہن سے شادی کرلی جو ان کی طرح صحیح النسب حسینی سید از حضرت خواجہ بہاالدین نقشبند کی اولاد میں سے تھی (۳) خواجہ ناصر عندلیب لکھتے ھیں کہ (۴)

" برادر سیومئی خواجہ محمد صالح خواجہ فتح اللہ نام داشت کہ جد شما باشد پادشاہ او را بر منصبے سر افراز ساختہ بہر تکلیف کتخدائی بمیان اقربائے خود فرمود و لیکن او ہرگز قبول این معنی نہ نمود و در آخر کار ہمشیرہ حقیقی نواب سر بلند خان کہ میر بخشی سلطان قدردان بود منسوب گرداند "

جادو ناتھ سرکار نے تاریخ اورنگ زیب (History of Aurangzeb) میں لکھا ہے کہ بخشی الممالک کا عہدہ آج کل کے پے ماسٹر جنرل (Pay Master General) کے مترادف تھا (۵) رام پرشاد کھوسلہ نے اپنی تصنیف (Mughal Kingship & Nobility) میں عالم گیری عہد کے میر بخشیوں کی جو فہرست دی ہے اس میں سر بلند خاں کا

---

۱ - تذکرہ چغتائیہ (ذکر خواجہ یحیلی)
۲ - مآثر عالمگیری - ص ۵۱۳
۳ - میخانہ درد از سید ناصر نذیر فراق - ص ۱۱
۴ - رسالہ ہوش افزا - ص ۹۶ ب
۵ - History of Auranzeb by J. N. Sarkar page—62.

زمانہ ملازمت ۱۶۷۶ء سے ۱۶۷۹ء تک کا ہے(۱) - اور ان سے پہلے اور بعد ۱۶۵۹ء سے ۱۷۰۷ء تک کے عرصے میں محمد امین خاں، دانشمند خاں، لشکر خاں، اسد خاں، بخت خاں، اشرف خاں، روح اللہ خاں، بہرامند خاں اور نصرت جنگ اس عہدے پر فائز رہے ھیں(۲) -

انھی سر بلند خاں کی حقیقی بہن کے بطن سے خواجہ فتح اللہ خاں کے گھر خواجہ میر درد کے دادا نواب ظفر اللہ خاں پیدا ھوئے - جو خواجہ میر اثر کے بیان کے مطابق نہ صرف صاحب فوج و حشم تھے بلکہ صاحب نسب، ولی کامل، اور عالم با عمل بھی تھے - وہ مثنوی بیان واقعہ میں لکھتے ھیں کہ

حضرت نواب ظفراللہ خاں صاحب فوج و حشم والا شاں
صاحب نسب ولی کاملے عالم و اھل عزیمت عاملے
قبلہ گاہ حضرت ایشاں ما اوست یعنی جد عالی شان ما
یک ہزار و یک صد و ثامن عشر در محرم کرد از دنیا سفر
والدش نواب فتح اللہ خاں آں کہ ایشاں را شہید آمد نشاں
دفتر شاھاں ایں ھندوستاں چند تا در قبضہ اخوان شاں

سید ناصر نذیر فراق نے جو خواجہ میر درد کی اولاد میں سے تھے اپنی تصنیف میخانہ درد میں نواب ظفراللہ خاں کے متعلق یہ انکشاف کیا ھے کہ وہ محمد شاھی عہد کے وھی مشہور نواب روشن الدولہ تھے جو ظفر خاں، رستم جنگ، یار وفادار اور طرہ باز خاں کے خطابات و القابات سے مشہور تھے (۳) اور جن کے نام سے دلی میں دو سنہری مسجدیں ایک کوتوالی کے نزدیک اور دوسری قاضی دروازے کے اندر اب تک موجود ھے (۴) - لیکن تاریخی شہادت ان کے اس

---

۱ - Mughal Kingship and Nobility by R. P. Khosla page.

۲ - History of Aurangzeb by J. N. Sarkar page—62.

۳ - میخانہ درد - ص ۱۱

۴ - دھلی میں ایک تیسری سنہری مسجد بھی ھے جو زوجہ احمد شاہ بن محمد شاہ کی تعمیر کردہ ھے دیکھئے سیرالمتاخرین ص ۵۱۳ -

دعوی کے برعکس جاتی ہے۔ شاہنواز خاں نے مآثر الامرا میں نواب روشن‌الدولہ کے حالات میں لکھا ہے کہ (۱)

"خواجہ مظفر نام، خواجہ زادہ نقشبندی ست۔ پدر کلانش خواجہ محمد ناصر در عہد فردوس آشیانی بہ ہندوستان آمدہ در رفاقت سلطان شجاع می گذرانید۔ رتبہ رفیعہ منصب ہزار و پانصدی و پانصد سوار و خطاب محمد فخرالدین خان ممتاز گردید۔ و پس از جنگے کہ مابین شاہزادہ مذکور و عالم گیر پادشاہ در نواح کھجوہ روداد سلطان شجاع رو بہ بنگالہ گردانید مشارالیہ (کہ بعساب مخل بود) با جمعے از اقربائے خود بر ڈیوڑھی بکار آمد۔ پسرے ازو ماند خواجہ عبدالقادر نام کہ لباس درویشی بسر می برد در عہد فرخ سیر بدارالبقا پیوست۔ خواجہ مظفر پسر اوست ابتدأ بہ نوکری رفیع الشان امتیاز اندوختہ بمنصب ہزار و پانصد سوار و خطاب ظفر خان چہرہ رسائی برافروخت و پس از کشتہ شدن شاہزادہ مذکور ترک روزگار نمودہ التزام صحبت شاہ بھیک (کہ بخوارق و کرامات مشہور و معتقد فیہ باد شاہزادہ بود) اختیار کرد۔ بس ازان (کہ زمانہ ورق بر گرداند و عزیمت فرخ سیر از پٹنہ بہ ارادہ جنگ با جہاندار شاہ زبان زد گردید) مشارالیہ از درویش مذکور میسر شدہ بداں سمت شتافت و بہ استصواب حسین علی خان دولت دار یافتہ بمنصب پنج ہزاری و پنج ہزار سوار و عطائے علم و نقارہ و پالکی جھالر دار و خطاب ظفر خان بہادر رستم جنگ و بعرض بعلقہ بخشی گری سوم پایہ اعتبار برابر افراخت و پس از جنگ با جہاندار شاہ (کہ سلطنت نصیب فرخ سیر شد) مومی الیہ از اصل و اضافہ بمنصب ہفت ہزار و ہفت ہزار سوار و خطاب روشن‌الدولہ و عطائے ماہی و مراتب نکہ بر چہار بالش عمدگی رد۔"

اس طویل اقتباس سے نواب روشن‌الدولہ ظفر خاں بہادر رستم جنگ کے جس حسب نسب پر روشنی پڑتی ہے وہ خواجہ میر درد کے دادا نواب ظفراللہ خاں کے

---

۱ - مآثرالامرا از شاہنواز خان جلد دوم - ص ۳۳۴

ب سے بالکل الگ ہے ۔ غالبا بعد کے مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے شاھنواز خان مذکورہ بالا عبارت سے ظفرخان اور خواجہ محمد ناصر کے ناموں سے دھوکا ھا کر ان کو خواجہ میر درد کے خاندان سے خلط ملط کر دیا ہے ۔ حس کا ت سید احمد کی تصنیف واقعات دارالحکومت کے اس بیان سے ملتا ہے۔

" خواجہ میر درد کے جد امجد خواجہ محمد ناصر شاھجہان کے زمانے میں ھندوستان تشریف لائے تھے ۔ کھجوے کی لڑائی میں جو اورنگ زیب اور سلطان شجاع کے درمیان ہوئی تھی ۔ شاھزادہ شاہ شجاع کے محل کی حفاظت کرنے میں کام آئے ... ... خواجہ میر درد کے عبدالقادر کا واقعات تاریخی سے کچھ تعلق نہیں وہ درویشانہ گذر کرتے تھے اور فرخ سیر کے عہد میں مرگئے . . .. خواجہ میر درد کے نواب روشن‌الدولہ ظفر خاں کا اصلی نام خواجہ مظفر تھا انہوں نے پہلے شاہ عالم بہادر شاہ اول کے فرزند رفیع‌الشان کی ملازمت اختیار کی اور بڑھتے بڑھتے منصب پانزدہ صدی و پانصد سوار کو پہنچے اور ظفر خان کا خطاب پایا ۔ رفیع الشان کے بعد ملازمت چھوڑ چھاڑ شاہ بھیک کی طرف رجوع ہوگئے تو فرخ سیر کا ساتھ اپنے مرشد کے حکم سے دیا۔"

د احمد کا یہ بیان، جیسا کہ صاف ظاہر ہے، شاھنواز خان کی فارسی عبارت کا .و چربہ ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ یہاں خواجہ مظفر (نواب شن‌الدولہ ظفر خان) کو بلا وجہ خواجہ میر درد کے خاندان سے متعلق کر دیا ا ہے ۔ بعض دوسرے تذکرہ نگاروں نے تو مذکورہ صدر عبارت کے اس فقرے ں کہ "خواجہ مظفر نام، خواجہ زادہ نقشبندی هست پدر کلانش خواجہ محمد ناصر عہد فردوس آشیانی بہ هندوستان آمده" ۔ لفظ "کلانش" کو اضافت کے ساتھ پڑھ ہے اور اسے "پدر کلانش خواجہ محمد ناصر" بنا کر خواجہ مظفر نواب شن‌الدولہ کو خواجہ محمد ناصر (والد خواجہ میر درد) کا باپ یا دادا سمجھ لیا ، ۔ سر سید احمد خان آثارالصنادید میں کہتے ہیں کہ (۲)

---

۱ ۔ واقعات دارالحکومت دھلی از سید احمد حصہ دوم ص ۱۳۷ ۔

۲ ۔ آثار الصنادید از سر سید احمد باب سوم ۔ ص ۲۲ ۔

" نسب خواجه میر درد کا نواب ظفر خان جہانگیری تک پہنچتا ہے۔
ان کے پوتے خواجه محمد ناصر صاحب منصب داران پادشاه هی میں
سے تھے"

سید نورالحسن تذکرہ طور کلیم میں لکھتے ہیں کہ (۱)

" سلسله نسبش (یعنی سلسله خواجه میر درد) در امرأ با نواب ظفر خان
که بعهد سعادت مهر جهانگیر از نامورات بوده است می رسد"

لاله سری رام نے تذکرہ ہزار داستان (یا خمخانه جاوید) میں لکھا ہے کہ (۲)

" آپ یعنی خواجه میر درد نواب ظفر خان بہادر امیر عہد جہانگیر پادشاہ
کی اولاد امجاد تھے"

مؤلف مجموعه سخن کا بیان ہے کہ (۳)

" ان کا (یعنی خواجه میر درد کا) سلسله امرأ میں نواب ظفر خان سے
جو عہد سلطنت جہانگیر بادشاہ میں نامی سردار تھے ملتا ہے"

سید ناصر نذیر فراق نے بھی غالباً ان کتب کی سند پر نواب روشن الدوله ظفر خان
بہادر رستم جنگ کو خواجه میر درد کے دادا نواب ظفراللہ خان سے ملا دیا ہے
جن میں خواجه میر درد کے والد خواجه ناصر عندلیب کی تصنیف رساله هوش افزا
کے بیان کردہ سلسله نسب کے مطابق کوئی اشتراک نظر نہیں آتا۔ خواجه میر درد
کے خاندان میں زمانه قدیم سے بادشاہوں کی مہروں کے ساتھ جو مستند شجرہ
چلا آتا تھا اس سے بھی رساله هوش افزا کے بیانات کی تصدیق ہوتی ہے۔ خواجه میر
اثر اس شجرہ کو مثنوی بیان واقعه کے نام سے نظم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

آن نسب نامه که از عهد بعد تا بوقت ما معنعن می رسید
ثبت بروئے بود هر اعصار دستخط و مهر شهان نامدار
....

۱ - تذکرہ طور کلیم از نورالحسن ص ۳۵ -
۲ - خمخانه جاوید جلد سوم ص ۱۶۹ -
۳ - مجموعه سخن - ص ۱۳۳ -

از بخارا هسره جد کلاں | آمده پیش شه هندوستان
شاه ایں جا هم چوں تحقیقش نمود | مهر خود را نیز بر وے کرده بود
بنده نقل از روئے آں مرقوم کرد | آں نسب نامه چنیں منظوم کرد
حضرت نواب ظفرالله خاں | صاحب موج و حشم والائے شاں
صاحب نسبت ولی کاملے | عالم و اهل عزیمت عاملے
قبله گاهے حضرت ایشاں ما | اوست یعنی جد عالی شاں ما
یک هزار و یک صد و ثامن عشر | در محرم کرد ار دنیا سفر
والدش نواب فتح الله خاں | آں که ایشاں را شهید آمد نشاں
دفتر شاهاں ایں هندوستاں | چند تا در قبضه احوال شاں
اوبداں خود نه کرد ایں را قبول | تا نگردد مختلط آل رسول

....

سلسلہ نسب کے اختلاف کے علاوہ ان میں بعض اور پہلوؤں سے بھی بُعد اور تضاد نظر آتا ہے۔ مذکور بالا شجرہ منظوم میں خواجہ میر اثر نے خواجہ میر درد کے دادا کا نام نواب ظفراللہ خاں لکھا ہے اور یہ نام، خطاب یا لقب کسی بھی تذکرہ نگار اور مورخ نے نواب روشن الدولہ کے لئے استعمال نہیں کیا ان کا نام شاهنواز خاں نے مآثرالامراء میں خواجہ مظفر، ظفر خاں، روشن الدولہ، رستم جنگ، یار وفادار، طرہ باز خاں وغیرہ (۱) فرح بخش نے تاریخ فرح بخش میں (Memoirs of Delh) شیخ محمد روشن (۲) اروں نے Later Mughals میں (۳) بدایونی نے قاموس المشاهیر میں (۴) ساقی خان نے مآثر عالم گیری میں (۵) گراهم بیلی نے اپنی ڈکشنری میں (۶) محمد علی نے تاریخ مظفری میں (۷) نواب

---

۱ - مآثرالامراء جلد دوم ص ۳۳۴
۲ - تاریخ فرح بخش (Memoirs of Delhi) - ص ۱۸۷
۳ - ۱۲۵ —P— (Later Mughals by Irvin)
۴ - قاموس‌المشاهیر جلد اول ص ۲۶۹
۵ - مآثرعالم گیری جلد دوم ص ۳۳۳
۶ - ڈکشنری آف گراهم بیلی - ص ۳۳۴
۷ - تاریخ مظفری - ص ۵۵

غلام حسین نے سیرالمتاخرین میں (۱) عبدالکریم نے عبرت مقال میں (۲) ہرچرنداس نے چہار گلزار شجاعی میں (۳) اور خوش حال چند نے تاریخ محمد شاہی میں، ظفر خان اور کھوسلے نے Mughal Kingship and Nobility میں مظفر خان لکھا ہے ۔ (۴) نواب روشن الدولہ نواب کی تعمیر کردہ دھلی کی سنہری مسجدوں کے کتبات میں بھی ان کا نام ظفر خان ھی دیکھنے میں آتا ہے

کتبہ مسجد سنہری نزد کوتوالی (۵)

بعہد بادشاہے ہفت کشور	سلیمان فر محمد شاہ داور
بہ بدر شاہ بھیک آں قطب آفاق	شد ایں مسجد بزینت درجہاں طاق
خدا بانی سب لیک از روئے احسان	بنام روشن الدولہ ظفر خان
بسال سن ز ھجرت تا شمار است	ہزار و یک صد و سی و چہاراست

کتبہ مسجد سنہری اندرون قاضی دروازہ (۶)

شکر حق کہ یمن فیض سید عرفاں پناہ	شاہ بھیک آں مرشد کامل ولایت دستگاہ
در زماں شاہ اسکندر نشاں جمشید قدر	معدلت گستر محمد شاہ غازی پادشاہ
روشن الدولہ ظفرخاں صاحب جود و کرم	کرد تعمیر طلائی مسجد عرش اشتباہ
مسجدے کہ از فضائے صحن قدرش آسماں	کرد جاروب از شعاع مہر ہر شام و پگاہ
حوض صاف او نشاں از چشمہ کوثر دھد	ھر کہ از آبش وضوے سازد شود پاک از گناہ
سال تعمیرش رسائی یافت از الہام غیب	مسجدے چوں بیت اقصی مہبط نور اللہ

---

۱ - سیرالمتاخرین جلد دوم - ص ۱۷۲ - ۱۸۱ - ۳۶۷ - ۳۶۹

۲ - عبرت مقال (مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی) - ص ۹۵ ب

۳ - چہار گلزار شجاعی (مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی) - ص ۴۲۵

۴ - تاریخ محمد شاہی (مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی) ص ۱۰ ب

۵ - یہ وھی تاریخی سنہری مسجد ہے جس کے صحن میں بیٹھ کر نادر شاہ نے قتل عام کا حکم دیا تھا ۔

۶ - قاضی دروازہ کے اندر داخل ہونے کی وجہ سے یہ قاضیوں کی مسجد بھی کہلاتی ہے - تفصیل کے لئے دیکھئے کتب سیر المحتشم اور آثار الصنادید ۔

مؤرخوں نے نواب روشن الدولہ کے عزیز و اقارب اور اولاد کی جو تفصیل دی ہے اس سے بھی خواجہ میر درد کے نواب ظفراللہ خاں اور ان میں اختلاف نظر آتا ہے ۔ نواب غلام حسین نے سیرالمتأخرین میں (۱) عبدالکریم نے عبرت مقال (۲) میں اور شاد عظیم آبادی نے حیات فریاد میں (۳) نواب روشن الدولہ کے ایک بھائی مفتخرالدولہ کا ذکر کیا ہے جو محمد شاہی عہد میں پہلے عظیم آباد اور پھر گجرات احمد آباد کے صوبہ دار تھے روشن الدولہ کے ایک دوسرے بھائی کا ذکر شاہنواز خان نے مآثرالامرا میں کیا ہے جو مفتخرالدولہ کے خطاب سے مشہور تھے اور محمد شاہی عہد میں احدیوں کی بخشی گری پر مامور تھے (۴) اگر سید ناصر نذیر فراق کے بیان کو درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ نواب فخرالدولہ اور نواب مفتخرالدولہ بھی نواب روشن الدولہ کے ساتھ خواجہ میر درد کے اجداد امجاد اور خواجہ فتح اللہ خان کے بیٹے ہوئے ۔

نواب روشن الدولہ کے بھائیوں کی طرح تذکروں اور تاریخوں میں ان کی اولاد اور دوسرے خویش و اقارب کے بھی کئی نام دیکھنے میں آتے ہیں لیکن تعجب ہے کہ اس فہرست میں خواجہ محمد ناصر عندلیب والد خواجہ میر درد کا نام کہیں نظر نہیں آتا جو سید ناصر نذیر فراق کے بیان کی موجودگی میں نواب روشن الدولہ کے فرزند ارجمند ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ نواب مذکور کثیر الاولاد تھے اور کتب میں ان سب کے نام موجود نہیں لیکن پھر بھی خواجہ ناصر عندلیب جیسی شخصیت کا نام نہ ملنا ان کی نواب روشن الدولہ سے بے تعلقی کی غمازی ضرور کرتا ہے ۔ شاہنواز خان نے نواب کے تین بیٹوں کا ذکر کیا ہے (۵) جن میں ایک کا نام محمد کبیر خاں تھا جو صلابت جنگ کے زمانے میں صوبجات دکن کی بخشی گری کے عہدے پر فائز تھا ۔ دوسرے کا

---

۱ - سیرالمتاخرین جلد دوم - ص ۱۷۱ - ۱۷۸

۲ - عبرت مقال (مخطوطہ) - ص ۹۶ ب

۳ - حیات زیاد - ص ۳۰

۴ - مآثر الامرا - جلد دوم - ص ۳۳۳/۳۳۶

۵ - مآثر الامرا - جلد دوم - ص ۳۳۳/۳۳۶

خطاب مظفرالدولہ تھا اور وہ بھی کوئی مناسب منصب رکھتا تھا اور تیسرا قائم خا
کے نام سے تھا جس کے عہدے کے متعلق ماثرالامرا خاموش ہے (۱) تاریخ سلطا
کے مصنف نے ان کے ایک اور بیٹے کا ذکر بھی کیا ہے جس کا نام بھکاری خاں تھ
(۲) محمد علی نے تاریخ مظفری میں ان کی دو بیٹیوں کے نام بھی لئے ہیں
ان میں سے ایک نواب ناصر جنگ پسر نظام الملک آصف جاہ سے بیاہی گئی تھ
(۳) اور دوسری کی شادی بندہ علی خاں باسطی سے ہوئی تھی جو میر حبیب اللہ کے
بیٹے اور عزت اللہ خاں شیر افگن جد امجد محمد علی مؤلف تاریخ مظفری کے
دختر زادہ تھے۔

سید علی حسن نے تذکرہ صبح گلشن میں بندہ علی خاں کی شاعری کا ذ
بھی کیا ہے اور لکھا ہے (۴) کہ وہ باسطی تخلص کرتے تھے (۵) یہ تخلص انہوں
اپنے پیر و مرشد شاہ عبدالباسط لکھنوی سے بیعت کے بعد رکھا تھا (۶)

---

۱ - ماثرالامرا جلد دوم - ص ۳۳۳/۳۳۶

۲ - تاریخ سلطانی ص ۱۳۱ (مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی)

۳ - ناصر جنگ کے حالات کے لئے دیکھئے - ماثرالامرا جلد سوم ص ۸۲۸

۴ - صبح گلشن از نواب سید علی حسن ص ۵۰

۵ - اس سے پہلے آپ ستمہ تخلص کرتے تھے

۶ - نواب صدیق حسن خاں نے اپنی تصنیف تقصار جنود الاحرار من تذکا
جنود الابرار میں شاہ عبدالباسط کو رستم علی بن ملا علی اصغر قنوجی
کا بیٹا کہا ہے اور لکھا ہے کہ " در عہد خود یادگار اسلاف نامدا
و مرجع علمائے دیار و امصار بود " (ص ۱۹۰) - وحید نے مختصر
سیر ہندوستان میں انہیں " از اجلہ علما و صلحائے زمان " کے الفا
سے یاد کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ " بہ عہد شجاع الدولہ مرجع
خلائق بود " (ص ۵۳/۵۴) بندہ علی خاں باسطی دہلی سے سیاسی ابتری ک
بنا پر لکھنو چلے گئے تھے اور وہیں جا کر انہوں نے شاہ عبدالباسط سے
بیعت کی تھی (صبح گلشن - ص ۵۰) شیر افگن خاں ، بندہ علی کے ج
مادری کا خطاب تھا جو بعد میں ان کی طرف منتقل ہو گیا اور وہ بھی شیر افگ
کے نام سے موسوم ہو گئے - خود شاعر ہونے کے علاوہ وہ شاعروں کے قدردا
بھی تھے اور بعض سخنوروں کو ان سے توسل بھی حاصل تھا - نشتر سخ
کے مؤلف نے لکھا ہے کہ میرزا امام وردی یکے از موزونان ہندوستا
است در لکھنؤ با نواب شیر افگن خان باسطی می گذراند (نشتر سخن جا
دوم ص ۶۲۷) شیخ گلشن علی گلشن ولد شیخ عطا جونپوری انصاری کے
ذکر میں کہا ہے کہ " بست و چہار سال در رفاقت شیر افگن خان باسط
اوقات ساخت " (نشتر سخن جلد دوم ص ۴۸۶ الف مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی

تذکرہ نگاروں نے نواب روشن‌الدولہ کے بعض اور عزیزوں کا ذکر بھی شاعروں کے زمرے میں کیا ہے ۔ ان میں سے ایک نواب جان عالم جان تھے جو نواب روشن‌الدولہ کے بھائی مفتخرالدولہ کے بیٹے اور میر سوز کے شاگرد تھے میر حسن نے تذکرہ شعرائے اردو (۱) نواب علی ابراھیم خان نے گلزار ابراھیم (۲) مولوی کریم‌الدین نے تذکرہ الشعرا (۳) . قدرت‌اللہ قاسم نے مجموعہ نغز (۴) ، مرزا علی لطف نے گلشن ھند (۵) اور صفیر بلگرامی نے جلوہ خضر میں (۶) ان کا ذکر کیا ہے مصحفی نے ریاض‌الفصحا میں نواب بھکری خاں ولد نواب روشن‌الدولہ کے ایک بیٹے خواجہ مظفر علی مظفر کو شاعروں کی صف میں شمار کیا ہے (۷) لالہ سری رام نے تذکرہ ھزار داستان (خمخانہ جاوید) میں نواب سید محمد رضا دھلوی کے بیان میں لکھا ہے (۸) کہ ان کے جد امجد نواب روشن الدولہ مظفر مرحوم محمد شاہ کے دوران سلطنت میں بخشی گری کے عہدے پر ممتاز تھے ۔ میر تقی میر نے نکات الشعرا میں (۹) فتح علی گردیزی نے تذکرہ گردیزی میں (۱۰) اور خوب چند ذکا نے تذکرہ ذکا میں (۱۱) میاں جگن نامی ایک شاعر کو نواب روشن‌الدولہ کے داماد شیر افگن خاں کا خالہ زاد بھائی لکھا ہے جو میر کے بیان کے مطابق ان کی شاگردی کا دعوی کرتا تھا (۱۲) میاں جگن کے ایک عزیز کا حال جو غلام حسن نام اور خیال تخلص کرتے تھے نواب اعظم الدولہ سرور نے تذکرہ سرور میں (۱۳) اور نواب مصطفے

---

۱ - تذکرہ شعرائے اردو میر حسن - ص ۷۷
۲ - گلزار ابراھیم - ص ۵۹
۳ - تذکرہ الشعرا - ص ۱۰۳
۴ - مجموعہ نغز جلد اول - ص ۱۵۳
۵ - گلشن ھند ص - ۱۰۱
۶ - جلوہ خضر - جلد اول - ص ۱۲۳
۷ - ریاض الفصحا - ص ۲۹۹
۸ - خمخانہ جاوید جلد چہارم - ص ۱۰۹
۹ - نکات الشعرا - ص ۱۴۷
۱۰ - تذکرہ گردیزی - ص - ۳۴
۱۱ - تذکرہ ذکا (بیان میاں جگن)
۱۲ - نکات الشعرا - ص ۱۴۷
۱۳ - تذکرہ سرور (بیان میاں جگن)

خان شیفتہ نے گلشن بے خار میں لکھا ہے (۱) اور کہا ہے کہ انہوں نے دو لاکھ اشعار کے دو دیوان یادگار چھوڑے ہیں - خوب چند ذکا نے بھی اس کی تصدیق کی ہے (۲)

سید ناصر نذیر فراق کے بیان کے مطابق اگر ہم نواب روشن الدولہ کو خواجہ میر درد کے دادا اور خواجہ فتح اللہ خان کے بیٹے تسلیم کر لیں تو پھر یہ تمام لوگ جن کا ذکر کیا گیا ہے ان کے خاندان سے متعلق ہوئے اگرچہ مآثرالامرأ اور بعض دوسری تاریخوں کے بیانات اس امر کے قبول کرنے میں حائل ضرور ہیں- لیکن سید ناصر نذیر لکھتے ہیں کہ (۳)

"شاہنواز خاں محض ایک مورخ اور تذکرہ نگار تھے - انہیں ہمارے خاندان کا کچھ علم نہیں"

ان کے نزدیک حقیقت یہی ہے کہ (۴) :—

"خواجہ سید محمد ظفر اللہ خاں درانی مخاطب بہ نواب ظفر اللہ خان روشن الدولہ رستم جنگ یار وفادار نواب فتح اللہ خان کے دولت خانے میں نواب سر بلند خان کی بہن کی کوکھ سے پیدا ہوئے"

اور پھر لکھا ہے کہ (۵)

"انہی نواب روشن‌الدولہ رستم جنگ یار وفادار کے فرزند دلبند خواجہ محمد ناصر صاحب (والد خواجہ میر درد) ہیں"

نواب روشن الدولہ کو بعض مؤرخوں نے اچھے الفاظ میں یاد نہیں کیا اور ان پر رشوت، غبن، بےایمانی، حرص اور سازش وغیرہ کے الزام لگائے ہیں -

---

۱ - تذکرہ گلشن بے خار (بیان میاں جگن)
۲ - تذکرہ ذکا (بیان میاں جگن)
۳ - میخانہ درد - ص ۱۱
۴ - میخانہ درد - ص ۱۱
۵ - میخانہ درد - ص ۱۷

کہا جاتا ہے کہ انھوں نے رحیم النسا کوکی سے، جو محمد شاہ کی چہیتی تھی ۔ گٹھ جوڑ کر کے امرا اور رعایا سے بے شمار دولت، رشوت اور نذر کے طور پر لی تھی ۔ اور ایک دوسرے درباری سے مل کر بھی جس کا نام عبدالغفور شاہ جی تھا بہت سی دولت اکٹھی کی تھی ایک دفعہ انھوں نے کابل سے آنے والے سرکاری خزانے سے بھی لاکھوں روپے کی رقم خرد برد کی تھی (۱) سید غلام حسین طباطبائی سیرالمتاخرین میں اس واقعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ

''روشن الدولہ ہر چند صفات حمیدہ بسیار داشت لیکن چوں بنائے کار او بر رسوب بود و نقدی ۱۲ لاکھ روپیہ بابت صوبہ کابل کہ سال سال از خزانہ عامرہ حوالہ روشن الدولہ می شد نصف فرسادہ نصف را خود متصرف می شد همیں رسم در امور دیگر هم بہ عمل می آورد و امرا را باهم منازعات بود ۔ پردہ از روئے کارش برخاستہ بہ فضیحت انجامید و پادشاہ او را معاتب ساختہ حکم بہ محاسبہ گرفتن فرمود ۔ متصدیان حضور مبلغ دو کروڑ روپیہ بر ذمہ او بر آوردہ بہ عرض رسانیدند ۔ حسب الحکم پادشاہ مبلغ مذکور از روشن الدولہ طلبی شد و او مبلغ مذکور لاعلاج و مجبور داخل سرکار والا نمودہ از نظر افتادہ زمام اختیار ایں اخراجات بہ صمصام الدولہ مفوض گشت(۲)''۔

اس واقعہ کو محمد علی مصنف تاریخ مظفری نے بھی لکھا ہے اگرچہ اس نے اسے روشن الدولہ کی غلطی کہا ہے بددیانتی نہیں ۔

''هم دریں ولا روشن الدولہ رستم جنگ کہ بخشی سیوم بود و بہ انصرام چند خدمت دیگر سوائے ازیں می پرداخت بہ علت باز یافت تنخواہ منصب داران متعینہ صوبہ کابل کہ بہ عہدہ خود داشت بپائے محاسبہ در آمد و بہ همان سبب دو کروڑ روپیہ از مال او داخل خزانہ عامرہ

---

۱ - Later Mughals by Irvin p. 266.

۲ - سیرالمتاخرین جلد دوم ۔ ص ۴۶۲

شد و تنخواہ منصب داران از عہدہ رستم جنگ موقوف گردیدہ بہ اہتمام صمصام‌الدولہ خان دوران در آمد، (۱)

عبدالکریم نے عبرت مقال میں بھی ان حالات پر روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ

''روشن‌الدولہ ظفر خان بہادر بخدمت بخشی گری سیوم مامور و اعتماد و اقتدار کلی در جناب قدسی داشت و شاہ عبدالغفور کہ مرشد زادہ تورانی‌ها و کوکی ہمشیرہ علی حامد خان کوکہ در حضور معلی اقتدار کلی بہم رسانیدہ صاحب دستخط مقدس شدند از اختیار و اقتدار ایشان تمامی ارکان خلافت را جائے دم زدن نماند و لکھہا روپیہ پیشکش در رشوت از صوبیداران و جاگیر داران می گرفتند،، (۲)

اس راز کے فاش ہو جانے پر جہاں نواب روشن الدولہ کو خفت اٹھانا پڑی، عبدالعزیز شاہ جی اور رحیم‌النسا کوکی پر بھی بادشاہ کی نظر عتاب پڑی اور اس نے شاہ جی کو گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا سرکاری اہل کاروں نے اس کے گھر سے ... رقم برآمد کی اس کی تفصیل عبدالکریم نے ان الفاظ میں دی ہے

''پنج کروڑ روپیہ نقد . . . دو کروڑ روپیہ نقرہ آلات و دیگر اسباب نقارہ ... در سرکار والا رسیدہ (۹۴ الف) و ہیچ کس از امرائے تورانی طاقت دم زدن نماند کوکی نیز مصدر عتاب پادشاہی گردید،، (۳)

نواب روشن‌الدولہ کی وفات پر بھی بے شمار دولت سرکاری خزانے میں جمع ہوئی تھی - اسی مصنف نے لکھا ہے کہ

''در سن ہفدہ جلوس معلّٰی ظفر خان روشن‌الدولہ بہ قضائے الٰہی ودیعت

---

۱ - تاریخ مظفری - ص ۵۷
۲ - عبرت مقال از عبدالکریم (مخطوطہ پنجاب) - ص ۹۵ ب
۳ - ایضاً ص ۹۴ ب -

حیات سپرد (۱) . . . و اسباب و خزائن او هم که زیاده از چهار کروڑ بود در سرکار والا ضبط گردید،، (۲)

تاریخوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک دفعہ دھلی کے جوتے فروشوں نے نواب روشن الدولہ کی بہت بے عزتی کی تھی - خوشحال چند نے تاریخ محمد شاھی میں لکھا ہے کہ (۳) ۱۱۴۱ھ میں شعبان کی گیارہ تاریخ کو جمعہ کے روز جامع مسجد دہلی میں بہت بڑا ہنگامہ ہوا - اس کے لئے اس نے ''بلوہ عظیم،، کے لفظ استعمال کئے ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ لوگوں نے خطبہ سلطانی سننے سے انکار کر دیا تھا - قاضی شہر نے بھی اس ہنگامے پر قابو پانا چاہا مگر ناکام رہا اور خوشحال چند کے الفاظ ہیں :

''بجوتے قاضی را مسند آمور اموراب سریعت ساختند که از یک پستاره رسن تغیر از حد موئے متعدد باقی نه ماند . . . نیز قطعه قطعه بہر ک پدر کردند،، (۴)

اس کے بعد روشن الدولہ شیر افگن کے ساتھ (جسے خوشحال چند نے روباہ شکوہ اور خرگوش صولت کے الفاظ سے یاد کیا ہے) مسجد میں آئے اور باوجود اس کے کہ ان کے جلو میں تقریباً پچاس (۵۰) ملازم تھے وہ اس ہنگمہ کو فرو کرنے میں ناکام رہے -

اس ہنگامے کی وجہ یہ تھی کہ سکرن نامی ایک جوھری نے ایک جوتے فروش کو مار ڈالا تھا (۵) - نواب روشن الدولہ نے اس جوھری کو اپنے ھاں پناہ دے

---

۱ - محمد علی نے تاریخ مظفری میں لکھا ہے کہ ان کی موت عارضہ سرطان سے ہوئی اور وہ قدم شریف کی درگاہ کے متصل دفن کئے گئے (ص ۵۷ تاریخ مظفری)

۲ - عبرت مقال ص ۹۳ ب -

۳ - تاریخ محمد شاھی جلد دوم (مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی) از خوشحال چند ص ۱۰ ب -

۴ - ایضاً ص ۱۱ الف -

۵ - ھر چرنداس نے چہار گلزار شجاعی میں جوھری کا نام سبھ کرن لکھا ہے - (ص ۳۲۵)

دی ۔ یہ بات جوتے فروشوں کو نواب کے خلاف مشتعل کرنے کا سبب بنی ۔ میر تقی میر کے بیان کے مطابق(۱) ''جنگ عظیم درمیان امرائے عظام افتاد بسیار از طرفین بہ قتل رسیدند ۔ ظفر خان تاب نیاورد گریخت،،۔۔۔۔اس زمانے کے ایک شاعر نے جس کا تخلص بے نوا تھا اس واقعہ کو ایک مخمس کی صورت میں بھی لکھا تھا (۲) جس کے چند شعر یہ ہیں (۳)

یہ کیا ستم ہے اے فلک ہرزہ نابکار　　مرغ پر جو سر کی خنجر کی اپنے دھار
جوتے فروش مرد مسلمان دیندار　　مردود جوہری نے لیا ہے ستم سے مار
سگ جفائے جور کیا لعل آبدار

کتنوں کو مارجی نے قضا سے گرا دیا　　کتنوں کو جی بچا کے سہب ھڑ بڑا دیا
کاغذ پہ بے نوا نے یہ سن کر چڑھا دیا　　کسی ھی مار جوتیاں طرہ(۴) گرا دیا

تا حشر ہر زبان پہ رہے گا یہ یادگار(۵)

سید ناصر نذیر فراق نے میخانہ درد میں نواب روشن‌الدولہ کی منسوبہ برائیوں اور بد عنوانیوں کی ساری ذمہ داری نواب غلام حسین طباطبائی مولف سیرالمتاخرین کی دماغی اختراع پر ڈال دی ہے اور لکھا ہے کہ چونکہ نواب مذکور کو نواب روشن‌الدولہ کے ساتھ عہدے اور بعض دوسرے پہلوؤں سے اختلاف بلکہ دشمنی تھی ۔ اسلئے انہوں نے اپنی تصنیف میں ان کے خلاف زہر چکانی کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانے کے مورخ عام طور پر اپنے مخالفین کو برے

---

۱ - نکات الشعرا از میر تقی میر ص ۳۰

۲ - خمخانہ جاوید از لالہ سری رام جلد اول ص ۳۸۸ - (انہوں نے لکھا ہے کہ یہ فساد ہولی کے موقع پر ہوا تھا)

۳ - طرہ کا اشارہ یہاں طرہ باز خان کی طرف ہے جو نواب روشن الدولہ کا خطاب یا عرف تھا

۴ - دیکھیئے مخمس در مذمت طرہ باز خان از بے نوا (مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی نمبر ۲۱۶۴)

۵ - اس موقع پر کسی شاعر نے یہ شعر کہا تھا ۔۔۔۔

آنچہ بر فرق ظفر خان از خدا افتادہ است
من چہ گویم معنی آن پیش پا افتادہ است

اور ذلت آمیز الفاظ میں یاد کرتے ھیں مثلا عبدالکریم نے عبرت مقال میں شیر افگن خان کو جگہ جگہ روبہ مزاج لکھا ھے(۱) - خوشحال چند نے تاریخ محمد شاھی میں اسے روباہ شکوہ اور خرگوش صوات کہا ھے (۲) - انند رام مخلص نے وقائع بدائع میں احمد شاہ ابدالی کو بر خود غلط اور علی محمد روھیلے کو آشفتہ روزگار کے الفاظ سے یاد کیا ھے (۳) - لیکن جو الزامات نواب روشن‌الدولہ پر عائد کئے گئے ھیں وہ محض ''مخاصمتی اسالیب،، نہیں بلکہ تاریخی ھیں جن پر مذکورہ بالا مورخوں کے علاوہ بہت سے دوسرے مورخوں نے بھی شہادت دی ھے - شاھنواز خان نے مآثرالامرا میں ان کے متعلق کہا ھے کہ ''از کمالات ظاھری عاری بود،، (۴) اروِن نے وارد کے حوالے سے لکھا ھے کہ ''وہ گندم نما جو فروش انسان تھا،،(۵) تاریخ کشمیر کے مصنف نے بھی نواب روشن‌الدولہ کی ''رعایا دشمنی،، کا ایک واقعہ لکھا ھے جس کی وجہ سے کشمیری عوام اسے ناپسند کرتے تھے اور خدا سے اس کی ذلت اور تنزل کی دعائیں کرتے تھے - نواب مذکور کی ایک دفعہ وزیر کے آدمیوں نے جو بے عزتی کی تھی کشمیریوں نے اسے اپنی دعا کا اثر ھی سمجھا تھا اور وہ ان پر ''پاپوش کاری،، کو مظلوم کشمیریوں کے دل دکھانے کا بدلہ سمجھتے تھے - اس واقعہ کی تفصیل تاریخ کشمیر میں ان الفاظ میں موجود ھے (۶)

''میر صدیق خان بخشی کو جب کشمیر کا نائب مقرر کیا گیا ۱۱۴۱ھ میں - اس سے کشمیری نالاں تھے - لوگ حضور بادشاہ میں بہ سبب حمایت روشن‌الدولہ ظفر خان تسری بخشی کے کوئی نالش پذیر نہ ھوا - کیونکہ یہ بخشی اس کا مربی تھا - اور بلکہ اس نے

---

۱ - عبرت مقال از عبدالکریم (مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی) ص ۹۵ ب

۲ - تاریخ محمد شاھی از خوشحال چند (مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی) ص ۱۰ ب

۳ - وقائع بدائع از انند رام مخلص (مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی) ص ۲۶۰ الف -

۴ - مآثرالامرا جلد دوم از شاھنواز خان - ص ۳۳۱ -

۵ - وارد ص ۵۸ الف (بحوالہ اروِن ص ۲۶۶ Later Mughals)

۶ - تاریخ کشمیر ص ۲۹۳

خدمت صوبہ داری کی رسوائی کی تھی ۔ آخر الامر کشمیر کی رعایا کا ناک میں دم آ گیا ۔ اس درمیان میں نواب روشن الدولہ پر عجیب مار ہوئی از آنجا کہ مردمان کشمیر واسطے اندفاع شر ظالم کے دعائیں مانگتے تھے اور وظائف حاجات میں بیٹھ کر پڑھتے تھے چنانچہ ۔۔۔ روز ۔۔۔ روشن الدولہ نے جامع مسجد میں ورد کے آدمیوں کے ہاتھ سے بڑی ۔۔۔ کی ٹوپی گرگئی ہوگئی ۔ اس پاپوش کاری کو سزائے آہ و زاری مظلومان کشمیر سمجھ کر مدعی معزولی اعز خان کا ہوا ۔

نواب روشن الدولہ کے پاس جتنی دولت تھی اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دولت انہوں نے ناجائز ذرائع سے فراہم کی ہوگی ۔ مورخوں نے نواب کے بعض اخراجات کی تفصیل دی ہے ۔ جس سے ان کی امارت اور سکھڑ کا اندازہ ہوتا ہے ۔ تاریخ مظفری میں لکھا ہے کہ انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی پر ساٹھ لاکھ روپے خرچ کئے تھے اور لکھا ہے کہ (۱)

"نفس الامر در امرائے توران تا این زمان چنین شادی نشده شد"

اسی طرح بارہ ربیع الاول کے موقع پر جس انداز کا چراغاں وہ دہلی میں کرتے تھے اس پر بھی زر کثیر صرف ہوتا تھا ۔ اس چراغاں پر روشنی ڈالتے ہوئے محمد علی لکھتے ہیں کہ (۲)

"درین ولا تاریخ ۱۲ ربیع الاول کہ بر اعتقاد جم غفیر امم خیرالبشر روز وفات آن سرور است علیہ السلام روشن الدولہ رسم جنگ نیازی هر قسم طعام لطیف و نفیس نذر فاتحہ جناب ختم الانبیا بہ سرحد افراط رسانید و همان شب اسباب روشنی از سہ دروازہ شہر شاہ تا بدرگاہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہ کہ مسافت چہار کروہ جریبی است بہ آئین شائستہ آمادہ مہیا گردانید . . . گویند دو صد هزار روپیہ

---

۱ - تاریخ مظفری از محمد علی ص ۵۶
۲ - تاریخ مظفری از محمد علی ص ۵۶

دریں روشنی و طعام فاتحہ خانم النسن خرج رسد - این روشنی برائے او یادگار روزگار گردید چہ کمتر کسے در ایام سلف چنیں روشنی نمودہ باشد،،

بعض مؤرخوں نے روشن الدولہ کی فراہمی زر اور صرف زر کے روشن پہلو بھی دئے ہیں - مثلاً اروں نے خوشحال، آشوب، اور غلام علی کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب شاہ کی شادی فرخ سیر کی بیٹی ملک الزمانی سے ہوئی تو اس موقع پر فخرالدین خاں صمصام الدولہ، عبدالصمد خاں دلیر جنگ، خان خانان میر جملہ حیدر قلی خاں، راجہ گردھاری بہادر، راجہ جے سنگھ اور نواب ظفر خاں روشن الدولہ کو ایک ایک لاکھ روپیہ ملا (۱) ہرچرنداس نے چہار گلزار شجاعی میں نواب روشن الدولہ کی امارت کا سبب ان کے پیر و مرشد شاہ بھیک کی توجہ کو بتایا ہے اور لکھا ہے کہ (۲)

''گویند پیر و مرشد او شاہ بھیک بود بہ سبب توجہ او بدولت و حشمت رسید،، (۳)

---

۱ - Later Mughals by Irvan—p. 125.

۲ - چہار گلزار شجاعی از ہرچرنداس (مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی) ص ۳۲۵ الف

۳ - نواب روشن الدولہ شاہ بھیک کے مرید تھے جن کا اصل نام سید محمد سعید تھا -

سید میراں بھیک ان کا عرف تھا (واقعات دارالحکومت دہلی جلد دوم ص ۱۳۷) - شاہ بھیک کا سلسلہ عالیہ چند واسطوں سے شیخ احمد عبدالحق رودلی تک پہنچتا ہے (معین الاولیا ص ۲۵۶) جو شیخ محمد عرف جلال الدین پانی پتی کے خلیفہ تھے (معین الاولیا ص ۲۳۵) مذہب حنفیہ اور مشرب قادریہ رکھتے تھے اور بعض تذکرہ نگاروں کے بقول دوسرے سلسلوں مثلاً چشتیہ اور سہروردیہ کا بھی تتبع کرتے تھے (تاریخ مظفری از محمد علی) - آپ سید ابوالمعالی کے مرید تھے (کتاب الاعراس بزرگاں ص ۲۰) جو شیخ داؤد حسنی کے خلفائے کرام اور شیخ محمد صادق گنگوھی کے مریدوں میں تھے (تذکرہ خزینۃ الاصفیا ص ۴۸۰) ہشت محفل کے نام سے شاہ ابوالمعالی کے ملفوظات کا ایک مجموعہ بھی

بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۱۳۶

نواب غلام حسن خان طباطباعی نے (جسے سید ناصر نذیر فراق اپنے آبا و اجداد کا دسمن کہتے ھیں) جہاں نواب روشن‌الدولہ کی شخصیت اور کردار کے بعض برے اور ناریک پہلو ہمارے سامنے رکھے ھیں ان کے متعلق نہ بھی

باقی حاسیہ ازصفحہ ۱۳۵
ملتا ھے جسے ان کے عقیدت مندوں میں سے محمد باقر نامی ایک بزرگ نے جمع کیا ھے (دیکھئے ھست محفل مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی) ابوالمعالی کا مزار شہر لاهور میں ھے (سفینۃ الاولیا ص ۱۹۶) لطف اللہ اسالوی نے ثمرہ الفواد میں شاہ بھیک کا سن وفات ۱۱۲۶ ھ لکھا ھے (ثمرہ الفواد مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی ص ۲۲۹)۔ یہ لطف اللہ بھی شاہ بھیک کے مرید تھے ۔ ان کا اکثر تذکرہ نویسوں نے ذکر کیا ھے (دیکھئے حزینۃ الاصفیا ص ۲۸۸) حالات و مقامات مرزا مظہر جان جاں کے مصنف نے شاہ بھیک کے نام سے ایک اور بزرگ کا بھی ذکر کیا ھے جسے انہوں نے مرزا مظہر جان جاں کے خلیفہ ، حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد اور شیخ عبدالاحد کے نواسے میں لکھا ھے (حالات و مقامات مرزا مظہر جان جاں ص ۷۳ حاشیہ) شاهنواز خان نے مآثرالامراء میں بیان کیا ھے کہ نواب روشن الدولہ شہزادہ رفیع الشان کے قتل کے بعد (جن کی ملازمت میں وہ تھے) ، گوشہ نشین ھوکر شاہ بھیک کے مرید ھو گئے تھے اور پھر انہیں کی ھدایت کے مطابق فرخ سیر اور معزالدین کی جنگ کے وقت دنیائے عمل میں آکر حسین علی خان کی وساطت سے منصب پنج هزاری پر فائز ھوئے (مآثر الامرا جلد دوم ص ۳۳۳) یہ واقعہ بھی شاہ بھیک کی کرامات میں شمار ھوتا ھے کیونکہ انہوں نے بشارت دی تھی کہ فرخ سیر کامیاب ھوگا اور اسی لئے نواب روشن الدولہ کو اس کی حمایت کے لئے کہا تھا ۔ شاد عظیم آبادی نے حیات فریاد میں بھی اس موقع پر ایک اور بزرگ سید شاہ سلام اللہ کی کرامت کا ذکر کیا ھے جو نواب سید حسین علی خاں کے عم زادہ تھے ۔ نواب مذکور نے جب سید شاہ سلام اللہ سے فرخ سیر کی کامیابی کے لئے دعا کرنے کو کہا تو شاہ صاحب نے مراقبہ کیا جس میں انہیں مشاهدہ ھوا کہ معزالدین اور ان کے سپہ سالار کے جنازے رکھے ھیں اور حسین علی خان امیرالامرائی کا خلعت زیب تن کئے ھوئے ھے اور ان کے بھائی سید عبداللہ خان وزیر اعظم بنے ھوئے ایک ھاتھی پر آ رھے ھیں (حیات فریاد از شاد عظیم آبادی ۔ ص ۲۵)

۲ - چہار گلزار شجاعی از هرچرنداس (مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی) ص ۳۲۵

۳ - تاریخ مظفری از محمد علی - ص ۵۶

کہا ہے کہ وہ صفات حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ کے مالک بھی تھے(۱) - اس بات کی تصدیق ان کی مختلف مذہبی تعمیرات، رفاہ عام اور جود و سخا کے کاموں سے ہوتی ہے - دھلی میں انہوں نے ایک مسجد، شاہی محل کے پاس اور ایک مسجد مع مکتب چاندنی چوک کے قریب بنوائی تھی(۲) - پانی پت میں انہوں نے اسی نمونے پر ایک اور مکتب اور ایک مقبرہ تعمیر کروایا تھا - اسی شہر میں انہوں نے حضرت بوعلی شاہ قلندر پانی پتی کے مزار پر طلائی گنبد بھی بنوائے تھے(۳) - اور بھیکہ (نواح تھانیسر) میں جہاں ان کے مرشد شاہ بھیک مدفون ہیں مہمان خانے، محرابیں اور منبر بھی تعمیر کروائے (۴) - جن کے ساتھ کچھ گاؤں وقف کئے(۵) - دھلی میں وہ ہر سال قدم شریف کی درگاہ کی صفائی اور مرمت بھی کروائے تھے - شاید اسی بنا پر انہیں دون بھی پیش کیا گیا (۶) -

مذہبی تعمیرات اور رفاہ عام کے کاموں کے علاوہ مورخوں نے نواب روشن‌الدولہ کے روحانی فیوض اور کرامات کا بھی ذکر کیا ہے کہتے ہیں کہ محمد شاہ کے عہد میں جب ایک دفعہ امساک باراں ہوا تو نواب روشن الدولہ کی منعقد کی ہوئی ایک مجلس سماع کی تاثیر سے جس میں ان کے پیر و مرشد حضرت شاہ بھیک بھی موجود تھے باران رحمت کا نزول ہو گیا تھا (۷) - ہر چرنداس نے چہار گلزار شجاعی میں لکھا ہے کہ (۸) -

''گویند کہ روشن‌الدولہ بہ سبب توجہ پیر خود صفائی باطن تر داشت کہ در یک سال امساک باران پدید آمد پادشاہ محمد شاہ را ازاں سبب ملال خاطر شدہ فرمود کہ در زمان سلف درویشان و واصلان

---

۱ - سیرالمتاخرین جلد

۲ - Later Mughals by Irvin p. 267.

۳ - Do.

۴ - Do.

۵ - تاریخ مظفری میں شاہ بھیک کا مدفن کہرام لکھا ہے - ص ۵٦

٦ - میخانہ درد - ص ۱۷

۷ - Later Mughals by Irvin p. 267.

۸ - چہار گلزار شجاعی از ہرچرنداس (مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی) - ص ۴۲۵ -

حق به مسمے بود که در حد در حاب وحدت معروض داشتد پذیر امر شد و این وقت عجب وقت است که درین وقت کسے ازین قسم شخص نظر نمی آید. روشن الدوله که به حضور بادشاه ایستاده بود عرض نمود که خدا تعالی حق ساده در این وقت از هر قسم خلق آفریده درین وقت سر این جمع شده هائے او خواهند بود این کف و از بادشاه رخصت شده ، خانه خود آمد و در صحن دیوان خانه خرد فرش کرد و سرمها وغیره ترالان که او ترس زده و همه نمس او سرود می کرده انها را . نموده مجلس ساحت و قوالان را فرمود که سرود بکنند . خوان قوالان سرود آمدند روشن الدوله را حالے پیدا آمد و رقت خودن گرفت تا چهار پهر حالت درویشان صاحب حال، حال می نموده رقت نمود که ناگاه ابر ظاهر شد و باران باریدن گرفت ـ آن قسم باران با یک پاس بارید که تمام شهر از شورش و بارش آن عاجز آمد و تا آن یک پاس روشن الدوله در همان حالت در صحن دیوان خانه بوده از خود خبر نداشت ـ چون هنگامه باران بسر شد روشن الدوله به هوش آمد و احوال باران دریافت نمود سر سجده به درگاه آن کریم کارساز نهاد و گریه نمود،، (۱)

اس واقعه کو محمد علی نے تاریخ مظفری میں بھی اس طرح بیان کیا ہے لیکن ان کے بیان کے مطابق یہ کرامت نواب روشن الدوله کی نہیں بلکه ان کے پیر و مرشد شاہ بھیک کی تھی کیونکہ بادشاہ نے قحط سالی سے پریشان ہو کر نواب روشن الدوله کو لکھا تھا (۲)

،،که تنها اظهار کشف و کرامت در حق شاه بهیک مبالغه می کنند اکنون که آثار قحط عظیم ظاهر است به خدمت ایشان رجوع آورند تا به جناب مجیب الدعوات مناجات نمایند باشد که به برکت و دعائے ایشان ابواب رحمت بر روئے خلائق مفتوح گردد،،

---

۱ - تاریخ مظفری از محمد علی - ص ۵۶

اس پر نواب روشن الدولہ نے جواب دیا کہ

''اگر دریں ہفتہ بدعائے مرشد علام باران بر وقت بہ بارد امید آں دارد کہ صد ہزار روپیہ نذر مرشد خود از خزانہ عامرہ برائے تقسیم فقرا بدست آرد''

جسے پادشاہ نے قبول کر لیا ۔ اور پھر مجلس سماع منعقد کی جس سے باران رحمت کا نزول ہو (۱) ۔

فقرا اور مساکین سے اس ہمدردی کی بنا پر وہ سخی اور مخیر بھی مشہور تھے ۔ چہار گلزار شجاعی کے مصنف نے ان کی سخاوت اور سخاوت کی کئی جگہ تعریف کی ہے ۔ مثال کے طور پر وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ (۲)

''مردے بود بسیار فیاض و بہ خدمت درویشاں رجوع داشت و خیرات بہ درجہ می نمود کہ روز رحلت او شہدہ و فقرائے شاہجہان آباد بہ نسبے می گریستند و سر خود را بر زمین می زدند کہ شاید بہ وقت پدر خودہا بہ گرسنہ باشند''

ایک دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ (۳)

---

۱ ۔ یہ واقعہ بہ ظاہر عجیب اور خلاف عقل معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی ثقاہت پر شک نہیں ہوسکتا کیونکہ سماع اور اس کی تاثیر کی مثالیں بعض دوسرے بزرگوں سے بھی منسوب ہیں جہانگیر نے تزک جہانگیری میں ایک واقع لکھا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ملا علی احمد مُہرکن نے ایک مجلس سماع میں قوالوں سے امیر خسرو کے اس شعر کو سنکر جان دے دی تھی ۔ ہر قوم راست راہے دینے و دین پناہے من قبلہ راست کردم بر سمت کجکلاہے (توزک جہانگیری ۔ ص ۲۸۲)

۲ ۔ سبع سنابل میں خواجہ ابواسحاق شامی کے ذکر میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ امساک باراں کے موقعہ پر ان کے کسی خلیفہ نے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ نزول باراں کے لئے دعا کریں تو انہوں نے قوالوں کو سماع کا حکم دیا تھا جس سے بارش برس پڑی تھی ۔ چنانچہ مصنف سبع سنابل نے کہا ہے کہ ''خواجہ را سماع در گرفت و در گریہ شد و رقص می کرد ہم دران زماں باراں رسید'' ۔۔۔ (سبع سنابل ۔ ص ۲۱۴ سنبلہ ہفتم)

۳ ۔ مولانا الطاف حسین حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں نواب روشن الدولہ کے گھر ایک مجلس میں ان کے پیر و مرشد حضرت شاہ بھیک کے نور بائی گائن سے ایک فارسی رباعی سن کر رقت میں آجانے کا ذکر کیا ہے

"فیض او تا بجائے بود کہ پالکی و فیل کہ برو سوار می شد از مقیش طلا ساری آں می نمود کہ ہر روز در سواری او کہاران اش و فقرا بولہ‌ها مقیش از زمین می چیدند"

چہار گلزار شجاعی کے مصنف نے نواب روشن‌الدولہ اور سنکرن جوہری کے قصے کو بھی، نواب کی خدا ترسی پر محمول کیا ہے اور لکھا ہے کہ (۱)

"نواب روشن‌الدولہ خدا ترس و غریب پرور بدرجہ بود کہ بر سبھ کرن (سنکرن) جوہری موچی‌ها پاپوش فروش کہ ہنگامہ و بلوہ ساختند و سبھ کرن کہ وابستہ او بود در پناہ او آمدہ پنہاں شد و آں تمام بلوہ عام و ہنگامہ آں بلاد کہ ہزاراں کس ملک سکھ ها جمع شدہ بودند بر خود گرفت و سبھ کرن جوہری را بے حرمت شدن نہ داد"

نواب روشن‌الدولہ کے متعلق مورخوں اور تذکرہ نگاروں کے مذکورہ بالا جملہ خیالات اور بیانات سے ان کے سلسلۂ نسب کے اختلافی پہلو اور ان کی شخصیت کے روشن اور تاریک دونوں رخ سامنے آ جاتے ہیں ۔ جن سے قاری کے دل پر ان کی عظمت اور پستی کا ملا جلا اثر باقی رہتا ہے۔ البتہ ان حالات و واقعات سے ایک بات بالکل صاف اور واضح ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ نواب روشن‌الدولہ اپنے وقت کے مشہور اور موثر شخص تھے ۔ وہ نہ صرف بہت بڑے امرا میں سے تھے بلکہ محمد شاہ کے دربار اور شاہی محلات میں بھی ان کا بہت بڑا عمل دخل تھا ۔ مورخوں نے اس کا سبب ان کا عبدالغفور شاہ جی اور کوکی سے گٹھ جوڑ بتایا ہے ۔ لیکن سید ناصر نذیر فراق اس کی وجہ ان کے والد بزرگوار خواجہ فتح‌اللہ خان کے بھائیوں خواجہ محمد صالح اور خواجہ محمد یعقوب کی مغل شہزادیوں سے شادی قرار دیتے ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں کہ (۲)

"صاحب مآثرالامرا نے لکھا ہے کہ جو کچھ نواب روشن‌الدولہ کو عروج حاصل ہوا وہ حضرت محمد شاہ کی رضاعی بہن کے سبب

---

۱ - چہار گلزار شجاعی ص ۴۲۵
۲ - میخانہ درد ـ ص ۱۴

سے ہوا کیونکہ روشن‌الدولہ کو محمد شاہ کی رضائی بہن کے مزاج میں بڑا دخل ہو گیا تھا وہ ان کی بادشاہ سے سفارش کرتی تھیں اور بادشاہ اسے قبول کرتے تھے مگر چونکہ صاحب مآثرالامرا صرف مورخ ہیں اور انہیں ہمارے خاندانی حالات معلوم نہیں تھے اس لئے وہ سوائے اس کے اور کیا لکھ سکتے تھے یہ راز ان پر کیونکر کھل سکتا تھا کہ نواب روشن‌الدولہ کی تین چچیاں خواجہ محمد صالح، خواجہ محمد یعقوب اور خواجہ موسی کی بیویاں اورنگ زیب شہنشاہ کی نسل سے تھیں - جس بہن کی سفارش کی طرف وہ اشارہ کرتے ہیں وہ نواب روشن‌الدولہ کی حقیقی چچا زاد بہن یا بھتیجی تھی ،،

نواب روشن‌الدولہ کی شادی، سید ناصر نذیر فراق کے بیان کے مطابق، سید لطف اللہ بن سید شیر محمد قادری نبیرہ حضرت سید تاج‌الدین ابوبکر کی لڑکی سے ہوئی تھی جو حضرت محبوب سبحانی غوث الاعظم کی اولاد میں سے تھے - اس عفیفہ کے بطن سے ۱۱۰۵ھ میں خواجہ میر درد کے والد خواجہ محمد ناصر عندلیب پیدا ہوئے -

در وجود آمد چوں ذات آں ولی شد کمالات امام از او جلی
سال تاریخش مرا الہام شد وارث علم و امامت و علی

(خواجہ میر درد) (۱)

خواجہ محمد ناصر عندلیب کا نام محمد ناصر اور عندلیب تخلص تھا - رسالہ ہوش افزا اور نالہ عندلیب میں جو خواجہ ناصر کی تصانیف ہیں انہوں نے خود ہی اس امر کا کئی جگہ اظہار کیا ہے - مثال کے طور پر ایک مقام پر کہتے ہیں (۲)

’’می گوید بندہ قاصر محمد ناصر کہ عندلیب تخلص دارد،،

خواجہ میر درد بھی علم‌الکتاب میں ایک جگہ کہتے ہیں کہ (۳)

’’عندلیب تخلص قبلہ کونین است،،

---

۱ - بحوالہ علم الکتاب ص ۱۳۷ و تقصار از نواب صدیق حسن خان ص ۱۹۳

۲ - رسالہ ہوش افزا (مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی) ص ۱ (الف)

۳ - علم الکتاب وارد ۶۹ صفحہ ۳۱۷

اس نام اور تخلص کے علاوہ وہ بہت سے صفاتی ناموں سے بھی موسوم تھے - خواجہ میر درد نے ان اسماء کو اپنی تصانیف میں مختلف جگہ استعمال کیا ہے - جس کو جمع کرنے سے ایک طویل فہرست مرتب کی جا سکتی ہے - ان میں سے چند یہ ہیں - امام العارفین، زبدۃالواصلین، ناصر دین محمدی، ناصر الملت والدین، وارث علم مرتضوی، صاحب کتاب، مظہر رحم الٰہی، جز لاینفک، متصل واحد، جز اعظم وغیرہ یہ اسماء محض رسمی نہیں ہیں بلکہ خواجہ محمد ناصر عندلیب کی شخصیت، کردار، روحانی عظمت اور احوال و مقامات کے مظہر ہیں - خواجہ میر درد نے علم الکتاب میں ان میں سے بعض ناموں کی وجہ تسمیہ بتائی ہے اور تشریح بھی کی ہے - مثال کے طور پر امام العارفین، زبدۃالواصلین، معی اللہ و قرب، ناصر دین محمدی وغیرہ اسما پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ (۱)

''لفظ امام العارفین از راہ ظہور انوار و برکت امامت است در آنحضرت ــــ و کلمہ زبدۃالواصلین از سبب قرب نسبت آنحضرت ــــ معی اللہ و قرب نام است کہ مقام اقربیت باشد و ناصر دین محمدی گفتن بہ اعتبار ظاہر شدن حقائق و دقائق طریقہ محمدیہ از آنحضرت و این طریقہ وثیقہ متعلق است،،

خواجہ محمد ناصر کے عندلیب تخلص کرنے کی بھی ایک خاص وجہ ہے جس کا کئی تذکرہ نگاروں نے ذکر کیا ہے مثلاً سراج الدین علی خاں آرزو نے مجمع النفائس میں لکھا ہے کہ (۲)

'' وجہ تخلص عندلیب آن است کہ جناب کرامت مآب حضرت شیخ سعد اللہ گلشن پیر صحبت ایشان بودہ اند،،

اپنے پیر صحبت شیخ سعد اللہ کے گلشن تخلص کرنے کی مناسبت سے انہوں نے اپنا تخلص عندلیب رکھ لیا - خواجہ میر درد نے اپنے رسالہ آہ سرد میں بھی ایک جگہ اس قسم کی توجیہ بیں کی ہے - وہ لکھتے ہیں کہ (۳)

---

۱ - علم الکتاب ص ۱۳۷

۲ - تذکرہ مجمع النفائس (مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی) از سراج الدین علی خان آرزو - ص ۲۶۱ الف

۳ - رسالہ آہ سرد از خواجہ میر درد آہ ۱۵۶

''حضرت قبلہ کونین من امد اللہ بنصرہ سرہ عندلیب تخلص داشتند لہذا کتاب خود را مسمی بہ نالہ عندلیب فرمودند و پیر صحبت حضرت شاہ سعد اللہ، گلشن تخلص می کردند و مرشد ایشان حضرت عبدالاحد کہ ملقب بہ گل بودند وحدت تخلص می نمودند فقیر بہ رعایت مرتب این تخلص درد درس مقطع غزل خویش بہ لطف موزوں کردہ،،

درد از بس عندلیب گلشن وحدت شدہ است
جلوہ روئے گلے او را غزل خواں می کند (درد)

حیرت نے مقالات الشعرا میں خواجہ محمد ناصر عندلیب کو اکبر آبادی لکھا ہے(۱) جو درست نہیں ہے ۔ تذکرہ نشتر عشق میں بھی ان کے نام کے آگے اکبر آبادی کی نسبت دیکھی گئی ہے (۲)۔ غالباً ان تذکرہ نگاروں کو نام سے دھوکا ہوا ہے ناصر اکبر آبادی، اکبر آباد (آگرہ) کے رہنے والے ایک اور درویش تھے جن کا ذکر مختلف دوسرے تذکرہ نگاروں نے کیا ہے مثلاً بدایونی نے قاموس المشاہیر میں لکھا ہے کہ (۳)

''ناصر اکبر آبادی آگرہ کے رہنے والے ایک درویش تھے۔ شاہ جہان کے زمانے میں گذرے ہیں ۔ بادشاہ ان کا معتقد تھا ۔ وہ ۷ جنوری ۱۶۴۷ء مطابق ۱۳ جمادی الاول ۱۰۵۷ھ کو فوت ہوئے،،

اس بزرگ کا نام بھی غالبا ناصرالدین تھا محمد ناصر نہیں ۔ اسپرنگر نے فہرست کتب خانہ اودھ میں اسی نام سے اکبر آباد کے ایک درویش کا ذکر کیا ہے جس سے ان کی مراد یہی ناصر اکبر آبادی ہیں (۴) ۔ تذکرۃالصلحا میں اس زمانے

---

۱ - مقالات الشعرا از حیرت (ذکر ناصر و درد) بحوالہ فہرست کتب خانہ اودھ جلد اول ص ۱۵۸

۲ - نشتر عشق از عشقی عظیم آبادی - (ذکر درد و ناصر)

۳ - قاموس المشاہیر (جلد دوم) از بدایونی ص ۲۵۲

۴ - فہرست کتب خانہ اودھ از اسپرنگر جلد اول - ص ۲۰۷

ایک اور درویش شاعر شاہ محمد ناصر کا حال ملتا ہے - جو درویشوں کے فرقہ سے تعلق رکھتے تھے - وہ الہ آباد کے رہنے والے تھے اور یہیں ان کا فردوسی مزار بھی ہے (۱) خواجہ محمد ناصر عندلیب کو ان دونوں سے خلط ملط نہیں کرنا چاہئے -

خواجہ محمد ناصر عندلیب کی زندگی اپنے باپ دادا کے بر عکس درویشی اور درویشی منشی میں گذری ہے - دنیاوی شان و شکوہ اور مراتب و مدارج کی جو باتیں ان کے والد میں تھیں انہوں نے ان میں سے عسر عسیر بھی ورثے میں نہ پایا مغلوں کے نظام منصب، و امارت میں وراثت کا وجود نہیں تھا - باپ کے مرنے کے بعد بیٹا اپنی قابلیت کے جوہر دکھا کر ہی اپنے آپ کو کسی منصب اور عہدے کا حق دار بنا سکتا تھا (۲) قیاس یہ کہتا ہے کہ خواجہ محمد ناصر عندلیب کی درویشانہ طبعیت اور فقیرانہ افتاد طبع کو یہ بات راس نہ آئی ہوگی اور انہوں نے شاہی چاکری کے مقابلے میں کلاہ استغنا کو پہننا پسند کیا ہوگا جس ارادے کو پختہ کرنے میں اس زمانے کے عبرت انگیز حالات کو بہت زیادہ دخل ہوگا -

بارھویں صدی ھجری کی دھلی کے عبرت انگیز واقعات نے حساس اور درویش طبع لوگوں کو دنیا کی بے ثباتی اور حیات انسانی کی بے اعتباری کا اتنا گہرا احساس دلا رکھا تھا کہ وہ دنیا سے منہ موڑ کر گوشہ نشینی، عزلت گزینی اور خانقاہ مشربی کی طرف مائل ہو گئے تھے - متداول تاریخوں اور تذکروں میں خانقاھوں، تکیوں، دائروں، رمنوں، عرسوں، درویشوں اور درویش منش لوگوں کا جو کثرت سے ذکر آتا ہے اس کا سبب بھی یہی ہے -

---

۱ - تذکرہ الصلحا - ص ۳۷

۲ - Mansabdari System of the Mughals by Aziz Ahmad p. 23. بعض موقعوں پر اس اصول سے انحراف بھی نظر آتا ہے لیکن عام اور مسلمہ اصول یہی تھا ھاں اگر بیٹا اپنے باپ کی زندگی میں ھی ایسے جوہر دکھا چکا ہو کہ اس کے امتحان وفا کی مزید ضرورت نہ رہے تو اسے باپ کے مرنے کے فوراً بعد خلعت عطا کر دیا جاتا - دیکھئے

(*i*) The Army of the Indian Mughals by Irvin p. 59 and

(*ii*) Mughal Kingship and Nobility by R. Khosla.

اس زمانے کی دلی میں درد دل رکھنے والوں کے لئے عبرت کے جو پہلو ہو سکتے تھے ان کا اندازہ اورنگ زیب، اس کے بھائیوں اور اس کی اولاد کی خونریزی سے ھی کیا جا سکتا ھے عاقل خان نے وقائع عالم گیری میں لکھا ھے کہ (۱)

''از بدائع آثار اقبال این مورد الطاف دو الجلال آنکه از جانب داراشکوه آن قدر سپه سالاران و سرداران به قتل رسیدند که در هیچ معرکه هیجا مثل آن کم نشان داده اند،،

اورنگ زیب کی وفات کے بعد شاھی تخت نے جس سرعت اور تیزی کے ساتھ وفاداری بدلی، بھائی نے بھائی کا گلا جس بیدردی سے کاٹا، انسانی فضیلت و شرافت کی تذلیل جس طرح ہوئی، مرھٹوں اور سکھوں نے جو انتشار پھیلایا اور نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی نے جس وسیع پیمانے پر تباھی مچائی ان واقعات میں عبرت حاصل کرنے والے دلوں کے لئے ھزاروں سبق چھپے ہوئے تھے - یہ زمانہ آشوب، ابتری اور خونریزی کے لحاظ سے چنگیز خان کے زمانے سے کم نہیں تھا - جن اسباب کی بنا پر چنگیز خاں کے ظلم و استبداد کے بعد اسلامی دنیا میں تصوف اور درویشی کی تحریک نے زور پکڑا تھا اسی قسم کے اسباب ھندی خصوصاً دھلی کے مسلمانوں کو بھی پیش آئے تھے - مھدی خان نے تاریخ جہانکشائے نادری میں نادر شاہ کے قتل عام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ھے کہ (۲)

''شور محشر و آشوب فزع اکبر درمیان شھر پدید آمد .... نر و ماده زنجیر شیون درگرفتند سرھائے که طعنه بر قصور جنت می زد به صدمه گنج کاوی بلان قصون یافت حوضھائیکه از چشمه سار لطافت

---

۱ - وقائع عالم گیری - ص ۳ - عاقل خان مصنف واقعات عالم گیری نے خود زمانے کے حالات سے تنگ آ کر گوشہ نشینی اختیار کرنا چاھی تھی جس کی عالم گیر نے اجازت نہیں دی تھی -
دیکھئے (i) منتخب اللباب از خوافی خان جلد دوم ص ۳۲
(ii) مقدمہ واقعات عالم گیری از عبداللہ حسن - ص ۱

۲ - تاریخ جہانکشائے نادری - ص ۱۶۰-۱۶۱

کوثر آب سموزد دواره جوشنده خون شد و بازار جوهریان و صرافان و راسته سازار و دکاکین تجار و ارباب مکتب و تمامی اسواق شهر به حیطهٔ نعما در آمد . . الحاصل از دروازه اجمیری الی در مسجد جامع و حند محله دیگر صغیراً و کبیراً عرصه شمشیر شدند،،

اور بقول مولف تاریخ ایران اگر محمد شاہ خود سفاعت کے لئے نہ نکلتا تو نہ جانے اور کیا حسر برپا ہوتا وہ لکھتا ہے کہ(۱)

''بالاخر محمد شاہ با دو نفر از وزرا نفس زمعہ شفاعت مردم را درخواست نمود،،

ایسے زہرہ گداز واقعات میں حساس دلوں کے لئے عبرت کے ہزاروں پہلو تھے - جس کا اندازہ خواجہ میر درد کی ایک عبارت سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے رسالہ نالہٴ درد میں ایک جگہ دلی کی تباہی پر اسی تاثر کا اظہار کرتے ہوئے لکھی ہے(۲)

''شہر مبارک دلی کہ روضہ مقدسہ حضرت قبلہ کونین قدسنا اللہ بسصره سره در آں است و خدایش تا قیامت آباد دارد و عجب گلستانے بود و حالا پامال خزان حوادث زمانہ گستہ و طرفہ انہار و اشجار آبادیہا مردماں ہر جنس داشت و اکنوں تاراج صدمات دہر شدہ بہر وجہ در تمام روئے زمین چوں روئے محبوبان ماہ وش و مانند سبزہ خط ایشاں دلکش بود،،

دھلی کہ خراب کردہ اکنوں دھرس جاری شدہ اشک ھا بجائے نہرس
بود است این شہر مثل روئے خوباں چوں خط بتاں بود سواد شہرس
(درد)

محمد علی شاد عظیم آبادی نے اپنے مرشد و استاد حضرت شاہ فرہاد کے حالات زندگی میں حیات فرہاد کے نام سے جو کتاب لکھی ہے اس میں مذکور ایک

---

۱ - تاریخ ایران - جلد دوم - ص ۳۰
۲ - نالہ درد ص ٦٩ - نالہ ۳۳۸

واقعہ سے بھی خواجہ میر درد کے دھلی کی نباھی سے اثر پذیر ھونے کا ذکر ملتا ہے ۔

واقعہ یوں ہے کہ اشکی اور جالی، جو شاہ فریاد کے ماموں تھے خواجہ میر درد کی شہرت سن کر عظیم آباد سے دھلی گئے تھے ۔ وھاں پہنچ کر جب وہ خواجہ میر درد کے شاگرد ھوئے تو اس تقریب کے خاتمہ کے ساتھ ھی شاھی قلعے سے توپ کی آواز آئی اور ساتھ ھی نقارہ بجا ۔ یہ آواز سن کر خواجہ میر درد نے فرمایا (۱)

"کہ دوپہر کی توپ اس ویران قلعہ میں چلتی ہے اور نقارہ بھی وھیں بجتا ہے"

قیاس غالب یہی ہے کہ حالات کی عبرت انگیزی اور شاھی تعلقات سے طبعیت کی عدم مناسبت نے خواجہ ناصر عندلیب اور ان کے بیٹے خواجہ میر درد دونوں کو ابتدائی امیرانہ زندگی سے متنفر کر کے خواجہ فتح اللہ کی شہادت اور نواب ظفراللہ خان کے مرنے کے بعد ترک دنیا پر مجبور کر دیا ھوگا ۔ یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب درد کی عمر تقریباً ۲۹ سال کی ہوی(۲) ۔ اس کا ذکر انھوں نے اپنی تصنیف نالۂ درد میں خود ایک جگہ کیا ہے (۳)

"فقیر یک چندر در عنفوان جوانی بہ صورت دنیا داری گرفتار ماند و مرکب غفلت در میدان ھوا و ھوس دواند و ھنوز عالم جوانی باقی بود

---

۱ ۔ حیات فریاد از شاد عظیم آبادی ۔ ص ۱۶۳

۲ ۔ نیاز فتح پوری نے خواجہ میر درد کے دنیا ترک کرنے کی عمر ۲۲ سال لکھی ہے (مقالہ اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ از نیاز فتح پوری ۔ انتقادیات جلد دوم ص ۱۰۳/۴ ۱) ۔ سید ناصر نذیر فراق نے میخانہ درد میں اس تبدیلی کے وقت ان کی عمر انیس سال بتائی ہے (میخانہ درد ص ۱۱۹) نواب حبیب الرحمان خان شروانی نے مقدمہ دیوان درد میں اس وقت ان کی عمر ۲۸ سال کی بتائی ہے (مقدمہ دیوان درد ۔ ص ۳) ۔ ظاھر ہے کہ خواجہ میر درد کے اپنے بیان کے پیش نظر یہ آرا درست نہیں ھیں

۳ ۔ نالہ درد از خواجہ میر درد ص ۵۸ ۔ نالہ ۲۸۹

کہ دست ازیں عالم فانی و بے ثبات کشید و در سن بست و نہ (۲۹) سالگی لباس درویشانہ پوشید حق تعالی خانمہ بخیر گرداند و چنانچہ بہ استقامت داشتہ ہم چنیں بمیراند،،۔

سید ناصر نذیر فراق نے میخانہ درد میں اس واقعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ(۱)

''خواجہ فتح اللہ کی وفات کے بعد خواجہ ناصر کے سات گھر چھوٹے بڑے الا اللہ کہ کر مصر ہونے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے،،

غلام ہمدانی مصحفی نے تذکرہ عقد ثریا میں خواجہ میر درد کے حال میں اسی لئے لکھا ہے کہ (۲)

''خواجہ میر درد، در ایام جوانی سپاہی پیشہ بود ازاں بعد کہ پا بر بوریائے درویشی نہادہ ہمیشہ در کسب سلوک و صبر و فنا و تصوف و توحید کوشیدہ و چشم از غیر حق پوشیدہ،،

صاحب تکملہ الشعراً نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ (۳)

'' خواجہ میر درد بسیار بہ کرّ و فر و تمکنت ظاہری بسر می برد لیکن آخر بقول مصحفی (۴)

''ترک روزگار کردہ بر سجادہ درویشی نشست،،

خواجہ میر درد کی طرح، خواجہ محمد ناصر عندلیب نے بھی دنیا پر دین کو ترجیح دی اور اپنے زمانے کے مشہور نقشبند بزرگ حضرت خواجہ محمد زبیر کے حلقہ مریدی میں شامل ہو گئے ۔ رسالہ ہوش افزا میں ان سے مکالمے کے دوران ایک بزرگ نے اسی لئے کہا تھا کہ (۵)

---

۱ - میخانہ درد ص ۴۳
۲ - عقد ثریا - ص ۲۷
۳ - تکملۃ الشعرا ۔ ص ۱۱۳ (الف)
۴ ۔ تذکرہ ہندی گویان از مصحفی ۔ ص ۹۲
۵ ۔ رسالہ ہوش افزا ۔ ص ۹۳ ب

"بارہا بجناب پیر بزرگوار شما حضرت شیخ محمد زبیر نقشبندی مشرف گردیدہ بمیان حلقہ ہائے مراقبہ ایشان نشستہ ام "

اس بیان میں "پیر بزرگوار شما" کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ خواجہ محمد زبیر حضرت خواجہ محمد ناصر عندلیب کے پیر تھے ۔ اس نسبت کی تصدیق مؤلف حالات و مقامات مرزا مظہر جان جاں نے بھی کی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ (۱)

"حضرت محمد زبیر غوث وقت بودند ۔ و خواجہ ناصر و شاہ عبدالعدل و مردمان بسیار در طریقہ ایشان ہستند"

خواجہ محمد زبیر حضرت حجۃ اللہ نقشبند کے نبیرہ اور خلیفہ تھے ۔ صاحب خزینۃ الاصفیا نے لکھا ہے کہ پادشاہ وقت اور بہت سے امرائے نامدار ان کے مرید اور معتقد تھے مجاہدہ و ریاضت ان کا روز کا معمول تھا اور ان کے شب و روز عبادت و ریاضت اور رشد و ہدایت میں گذرتے تھے (۲)

"وظیفہ وے آن بود کہ در تمام روز بست و چہار ہزار بار نفی و اثبات می خواند و پانزدہ ہزار بار اسم ذات بہ حبس نفس ذکر کرد و بعد از نماز مغرب صلوۃ اوابین خواندہ دہ ہزار بار نفی و اثبات می خواند پس ازاں حلقہ رجال می کرد و بہ مریداں متوجہ می شد ۔ بعد ازاں نماز عشا خواندہ در محل سرائے شاہی می رفت و درس در حلقہ نسا می فرمود و قریب نصف شب باز در خانقاہ آمدہ چند ساعت استراحت می کرد بعد ازاں برخاستہ نماز تہجد می خواند و دراں نماز چہل بار و گاہے شصت بار سورہ یسین خواند"

خواجہ محمد زبیر نقشبند کا مرتبہ روحانی اتنا بلند تھا کہ انہیں قطب ارشاد اور قیوم زمانہ کا درجہ حاصل تھا ۔ مولف رسالہ مظہریہ لکھتے ہیں کہ (۳)

"حضرت محمد زبیر قطب ارشاد بودند"

---

۱ ۔ حالات و مقامات مرزا مظہر ۔ ص ۲۵ (حاشیہ)
۲ ۔ خزینۃ الاصفیا ۔ ص ۶۷۰/۳۳۹
۱ ۔ رسالہ مظہریہ ۔ ص ۲۵

دوسرے تذکرہ نگاروں نے انہیں اپنے زمانے کے چار قیوموں میں سے ایک شمار کیا ہے - قطب ارشاد اور قیوم کے روحانی مرتبہ پر مکاتیب معصومیہ میں کئی جگہ وضاحت اور تشریح ملتی ہے - چند اقتباسات درج ذیل ہیں -

''باید دانست کہ منصب نبوت ختم بر خاتم الرسل شدہ است علیہ و علی الہ الصلوۃ و التسلیمات - اما از کمالات آن منصب بطریق تبعیت متابعان او را نصیب کامل است - این کمالات در طبقہ صحابہ بیشتر است و در تابعین نیز این دولت بر سبیل قلت سرایت کردہ است بعد ازان او باستتار آوردہ است و غلبہ کمالات ولایت ظلی جلوہ گر گشتہ است کہ بعد از مضی الف این دولت از سر تازہ گردد غلبہ و شیوع پیدا کند و کمالات اصلی رو بہ ظہور آرند و ظلی استتار پیدا کنند و حضرت مجدد علیہ الرضوان مظہر و باطن مروج این نسبت علیہ باشند - اے فرزند تابع کامل نبی شدہ و علی آلہ الصلواۃ و السلام چون بہ تبعیت کمالات نبوت را تمام کند اگر از اہل مناسب است بمنصب امامتش سر فراز سازند و چون کمالات ولایت کبری را تمام کند و از اہل منصب باشد بمنصب خلافتش مشرف می سازند یعنی وارث انبیا و از مقامات کمالات ظلی مناسب منصب امامت منصب قطب ارشاد است و مناسب منصب خلافت منصب قطب مدار - گویا این دو مقام (یعنی کمالات ظلی کہ مراد ازان ولایت صغری است کہ اہل آنرا قطب ارشاد و قطب مدار می نامند) کہ در تحت اند ظل آن دو مقام اند کہ مراد ازان مقام نبوت انبیا و مقام ولایت انبیا است کہ صاحب کمالات آن اگر از اہل مناصب است او را امام و خلیفہ نامند باید دانست کہ مقام ولایت این را ولایت کبری می گویند کہ در فوق اند'' (۱)

''قطب ارشاد کہ جامع کمالات فردیت نیز باشد بسیار عزیز الوجود است و بعد از قرون بسیار و ازمنہ بے شمار این قسم گوہرے بظہور می آید

---

۱ - ص ۹۱ - جلد چہارم - دفتر اول

و عالم ظلمانی از نور ظہور او نورانی می گردد ۔ و نور ارشاد ہدایت او سالک تمام عالم است از محیط عرش تا مرکز فرش ۔ ہر کسے را کہ رشد و ہدایت و ایمان و معرفت حاصل می شود از راہ او می آید و ازو مستعار می گردد ۔ و بے توسط او ہیچ کس باین دولت نمی رسد،، (ص ۹۵)

"باید دانست کہ ان اللہ خلق آدم علی صورتہ او تعالی از صورت منزہ متعالی است پس خلق آدم بر صورت او سبحانہ باین معنی تواند بود کہ اگر مرتبہ تنزیہ را در عالم مثال صورت فرض کردہ شد و ہر آئینہ این صورت جامع خواہد بود کہ انسان جامع بران صورت موجود گستہ است صورت دیگر را قابلیت آن نیست کہ تمثال آن مرتبہ مقدسہ تواند بود و مرآت آن تواند گشت ازین جا است کہ انسان شایان خلافت او تعالی گستہ است .... کمل امانت بزعم این فقیر قیومیت جمیع اشیاء است بر سبیل نیابت کہ مخصوص بہ تکمل افراد انسان است یعنی معاملہ انسان تا بجائے می رسد کہ او را قیوم جمیع اسما بحکم خلافت می سازند و ہمہ را افاضہ وجود و بقا و سائر کمالات ظاہری و باطنی بتوسط او می رسانند اگر ملک است باو متوسل است و گوہر انس و جن است باو متشبث و فی الحقیقت توجہ جمیع اشیا بجانب اوست و ہمہ نگران اویند،،(ص ۹۴ ۔ مکتوب ۴۷ ۔ جلد دوم ۔ حصہ ہفتم)

خواجہ محمد زبیر کی صحبت اور فیوض نے جو اپنے زمانے کے قطب ارشاد، قطب مدار اور قیوم تھے، خواجہ ناصر عندلیب کو وہ بلند ترین روحانی مقام عطا کیا جو بہت کم طالبوں کو نصیب ہوتا ہے ۔ اور انہوں نے تصوف میں محمدیہ کے نام سے ایک نئے مشرب کی بنیاد رکھی اور اس نسبت سے اپنے لئے امیرالمحمدین اور اپنے بیٹے اور خلیفہ خواجہ میر درد کے لئے اول المحمدین کے لقب استعمال کئے ۔

خواجہ میر درد اپنی خاندانی نجابت، شرافت اور سیادت کے جس سرمایہ پر اتنا فخر کرتے ہیں وہ علاوہ نسبی فضیلت کے اس مشرب طریقت کی بنا پر بھی ہے

جس کا آغاز ان کے والد ماجد سے ہوتا ہے - ان سے پہلے ان کے جتنے بزرگ گزرے ہیں سب اپنے طریقے کو نقشبندیہ کہتے رہے ہیں لیکن خواجہ ناصر عندلیب نے اپنے مشرب روحانیت کو طریقہ محمدی یا فقر محمدی کہا ہے - جس کی ایک خاص وجہ ہے -

تصوف کا طریقہ نقشبندیہ، جیسے خواجہ بہاءالدین نقشبند کے نام نامی سے منسوب کیا جاتا ہے - دوسرے صوفیانہ طریقوں کے مقابلے میں "متشرع طریقہ" رہا ہے جس کے اکثر مشائخ مذہب حنفیہ کے پیرو تھے چنانچہ دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیا میں ایک جگہ لکھا ہے کہ (۱)

"طریقہ ایشان تمام بہ مطابق شرع شریف بود و مذہب امام اعظم رضی اللہ عنہ داشتند و اکثر مشائخ این سلسلہ حنفی بودہ اند از خواجہ بزرگ پرسیدند کہ در طریقہ شما جہر و خلوت و سماع می باشد - فرمودند کہ نمی باشد پس گفتند کہ بنائے طریقہ شما بر چیست فرمودند کہ بہ ظاہر با خلق و بہ باطن با حق سبحانہ"

خواجہ ناصر عندلیب اور خواجہ میر درد دونوں بزرگوں نے اپنی تصانیف میں کئی جگہ اس سلسلہ نقشبندیہ سے اپنے روحانی تعلق کا اظہار کیا ہے - اور یہ بات ثابت کرنی چاہی ہے کہ طریقہ محمدیہ، نقشبندیہ بزرگوں کے طریقہ سے الگ نہیں ہے - خواجہ میر درد علم الکتاب میں ایک جگہ حضرت خواجہ بہا الدین نقشبند، حضرت خواجہ عبیداللہ احرار (۲) اور حضرت خواجہ باقی باللہ (۳) جیسے بزرگوں کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ (۴)

"ما فقیر بالذات سخت معتقد جناب ایشان است"

اور پھر کہتے ہیں کہ (۵)

---

۱ - سفینۃ الاولیا از دارا شکوہ - ص ۷۹

۲ - ان بزرگوں کے حالات کے لئے دیکھئے کتاب رشحات از سید علی حسن بن ملا حسین واعظ کاشفی - اور شجرہ الیقین وغیرہ -

۳ - خواجہ باقی با اللہ کے حالات کے لئے دیکھئے کتاب زبدۃ المقامات

۴ - علم الکتاب از خواجہ میر درد - ص ۳۶۶ وارد ۷۵

۵ - ایضاً

"نسبت محمدیان خالص مربائے همیں نسبتہائے بزرگاں خود است کہ ایں همہ صاحبان محمدی مشرب علی تفاوت استعداد الهم بودند و طریقہ محمدی زبدہ و خلاصہ و محصول و منتہائے همیں طرق مذکورہ بل جمیع طرق اسلامیہ اسب ۔ چنانچہ طریقہ مجددیہ از شعب طریقہ نقشبندیہ است و محسوب در همیں طریقہ"

یہاں خواجہ میر درد نے یہ دلیل دی ہے کہ جس طرح حضرت مجدد ـ ثانی نے طریقہ نقشبندیہ کے اندر رہ کر ہی اپنے طریقے کو ایک جداگانہ ـ یعنی طریقہ مجددیہ سے منسوب کیا ہے اس طرح حضرت خواجہ ناصر عندلیب ـ طریقہ محمدیہ اسی طریقے میں شامل ہے بلکہ نام کی مناسبت سے اصل اسلام ـ ۔ اس کے بعد مزید تشریح کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ طریقہ محمدیہ ـ بھی اپنے بزرگوں کی طرح شروع شروع میں نقشبندیہ قادریہ طریقے کے اذکار اشغال کی پابندی ہی کی جاتی ہے اور مجددیہ شیوخ کی طرز پر توجہ اور مراقبہ ـ نسبت باطن کا القا کیا جاتا ہے لیکن آخر میں صرف کلام اللہ کے توسط سے ـی کی جاتی ہے اور صرف اسے ہی امام اور پیشوا بنایا جاتا ہے ۔ وہ فرماتے ـں کہ (۱)

"اگرچہ محمدیان خالص نیز مثل دیگراں بموجب بیعت مرشدان خود در اوائل حال اشغال و اذکار معمولیہ طریقہ نقشبندیہ و قادریہ کہ از پیراں رسیدہ آمدہ است تلقین می فرمائید و القا نسبت باطن بہ توجہ و مراقبہ بہ وضع شیوخ مجددیہ می کند اما در اواخر کار محض بہ توسط کلام اللہ ترقیات حاصل می نمایند و همیں امام مبین را کہ قرآن مجید باشد پیشوائے خود سازند"

یہ طریقہ محمدیہ کی ایک بہت بڑی فضیلت ہے جس کی بنا پر نقشبندیہ ـیقہ کی یہ شاخ امتیازی اور منفرد درجہ حاصل کر لیتی ہے خصوصاً حضرت ـاجہ میر درد کی اس وضاحت کے بعد اس کی تقدیس، فضیلت اور اسلامیت سے ـب انکار ہوسکتا ہے کہ (۲)

---

۱ - علم الکتاب از خواجہ میر درد - ص ۵۹۵ - وارد ۹۳

۲ - ایضاً ص ۵۹۶ وارد ۹۳ -

''گوش الہام نیوش محمدیان خالص در ہر مقام از ہر پردہ کہ باشد غیر از صدائے کلام اللہ نمی شنوند،،

محمدیہ طریقہ کے نقشبندیہ طریقہ میں ہی شمولت کی تصدیق خواجہ میر درد کے ایک اور بیان سے بڑی وضاحت کے ساتھ ہوتی ہے وہ رسالہ درد دل میں فرماتے ہیں کہ (۱)

''حضرت امیرالمحمدین (یعنی حضرت خواجہ ناصر عندلیب) طریقہ محمدی پیمودہ و باوجود صاحب طریقہ و الوالعزمی تبیعت طریقہ نقشبندیہ و قادریہ نمودہ و باب سلوک بہ طور بزرگان مجددیہ کشودہ و عمل موافق علمائے مذہب حنفیہ فرمودہ و اول المحمدین (یعنی خود خواجہ میر درد) عفراللہ لہ ہماں مسلک را بہ چشم می پیماید و پیروی پیشوائے خود می نماید و اقتدائے امام خویش می کند و نظریہ راہ و رسم دیگران نمی فگند کہ حالا دیگر در ہمہ راہ ہا خبر سر گردانی نیست سوائے طریقہ محمدیہ،،

خواجہ ناصر عندلیب نے اپنے مسرب روحانی کا نام محمدیہ کیوں رکھا اس پر بھی خواجہ میر درد نے اپنی تصنیف علم الکتاب میں روشنی ڈالی ہے (۲) وہ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت خواجہ ناصر عندلیب ایک ہفتہ دن اور رات ایک حجرے میں بند رہے اور اس عالم ناسوت کی طرف ہرگز توجہ نہ کی حتی کہ کھانا اور پینا بھی چھوڑ دیا ۔ میں بھی حجرے کی دہلیز پر پڑا رہا اور ان کے غم میں زار و قطار روتا رہا ۔ یہاں تک کہ اس غم میں میں نے بھی کھانا پینا ترک کر دیا ۔ ایک دفعہ والدہ ماجدہ نے مجھے حویلی میں تاکیداً بلایا اور کھانے کا حکم دیا تو میں نے امتثال امر کی بنا پر چند لقمے کھائے اور پھر حجرے کی طرف دوڑا ۔ دوسرے اعزہ اور خدام مختلف نمازوں کے اوقات کے وقت آتے لیکن والد بزرگوار کو حجرہ خاص میں بند پا کر واپس چلے جاتے لیکن میں وہیں

---

۱ - رسالہ درد دل از خواجہ میردرد - ص ۵۹

۲ - دیکھئے علم الکتاب - ص ۸۵ - ۸۶

زمین پر پڑا رهتا ۔ اگرچه یه بات میری والده کو پسند نه تهی اور انهیں میری حالت کا بڑا دکھ تھا لیکن میں مجبور تھا ۔ میری والده نے بعض خدام اور دوسرے اقربا کو حکم دے رکھا تھا که وه میرے پاس رهیں اور میری حالت پر توجه رکھیں لیکن میں کسی کو نزدیک نہیں آنے دیتا تھا اور فرش خواب اور تکیه وغیره جو کچھ گھر سے آتا تھا ان میں سے کسی چیز کو استعمال نه کرتا تھا هاں کبھی کبھی بے اختیاری کے عالم میں سو ضرور جاتا تھا ۔ آٹھ روز بعد حجرے کا دروازه کھلا ۔ اور جب میرے والد بزرگوار نے مجھے زمین پر پڑا دیکھا تو مجھے اٹھا کر نہایت عنایت اور شفقت کا اظہار کیا ۔ میری پیشانی پر بوسه دیا اور میرے حق میں بہت سے کلمات بشارت کہے اور کہا که (۱)

''اے محمدی قلق و اضطراب مکن بلکه شادی و خوش باش که او سبحانه ما محمدیاں را به عجب عنایت خاص نواختته و به عجب شرف مشرف ساختته،،

اس کے بعد فرمانے لگے که میرے حجرے میں حضرت امام حسن کی روح نے نزول فرمایا هوا تھا ۔ میں پورا ایک هفته ان کی صحبت میں رها هوں اس دوران ان کی روح نے مجھ پر نسبت کا خاص القا کیا اور مجھے حکم دیا که اسے بندگان خدا تک پہنچاؤ اور یه بھی کہا که جس نسبت کا آغاز اب هوا هے اس کا حضرت صاحب الزماں مہدی موعود (صل الله علی محمد و اله) کے وقت میں مکمل ظہور هوگا ۔ میں نے عرض کیا اس نسبت اور طریقے کو طریقه حسن کے نام سے رائج کیا جائے انہوں نے اپنی انگلی کو منه میں رکھتے هوئے کہا که (۲)

''اے فرزند ایں کار دیگرانست کار ما نیست،،

اگر میرا اراده اپنے نام کی شہرت هی هوتی تو میں اپنے زمانه زندگی میں هی اپنے طریقے کا نام حسن رکھ لیتا لیکن یاد رکھنا چاهئے که هم سب امتی بحر

---

۱ ۔ علم الکتاب از خواجه میردرد ۔ ص ۸۵
۲ ۔ علم الکتاب از خواجه میردرد ۔ ص ۸۵

عینیت میں گم ھیں - ''نام ما نام محمد است و نشان ما نشان محمد محبت ما محبت خدا است و دعوت ما دعوت محمد''(۱) پس اس طریقے کو طریقہ محمدیہ کہنا چاھئے کیونکہ میں نے جو نسبت القا کی ھے وہ محمد کا طریق ھے میں نے اپنی طرف سے اس پر کچھ اضافہ نہیں کیا ''سلوک ما سلوک نبوی است و طریق ما طریق محمدی''(۲)

اس وجہ سے خواجہ ناصر عندلیب اور خواجہ میر درد اپنی تصانیف میں اس طریقہ محمدی کو خالص طریقہ اسلامی کہتے ھیں اور دوسرے تمام طریقوں پر فوقیت دیتے ھیں - اس کا اظہار یوں تو انہوں نے مختلف مقامات پر کیا ھے لیکن یہاں صرف چند اقتباسات پیش کئے جاتے ھیں -

''پس محمدیان خالص کہ از همه امتیاز یافته اند به سبب توسل تام به حقیقت جامعه محمدیه است علی صاحبه الصلوه والتحیه و از حیثیت شمول خود ممتاز از ما عدای خود شده اند نه چون دیگران از راه انانیت خویش ممیز گشته اند فنائے اتم و اکمل در جناب صاحب خود علیه السلام دارند''(۳)

'' هر چند اطلاق محمدیه مندرجه بر جمیع فرق اسلامیه ثابت است و داخل است مرحومه آن سرور اند علیه السلام که مستفتری امتی فرموده است اما خالص محمدیه نسبت این فرقه واحد است که کثرت متبدعه در واحدیت این خلل نیفکنده''(۴)

''تخصیص کلمه محمدی و انضمام آن بنامهائے ما محمدیان از راه نسبت به طریقه محمدیه است که او سبحانه از راه کمال اجتبا و فنا اتم در جناب رسول الله حضرت قبله کونین را ادام الله برکاته و افاض علی

---

۱ - علم الکتاب از خواجه میردرد - ص ۸۵
۲ - ایضاً
۳ - ایضاً - ص ۸۶
۴ - ایضاً

العالمین فیوضاته بآں مختص فرموده و بتوسط آں ذات خاتم الکمالات ما محمدیاں را به مشرف محمدیه خالص نموده،، (۱)

،، اگرچه محمدیه ممتزجه همه فرقه هائے اهل اسلام را حاصل است و ایں دولت همه مومنین را شامل اما زر ایشاں خالص و بے غش نیست که مس امانت و کدورت اسماء خود را بز به آں ممزوج ساخته اند و الا خود را همیں محمدیاں می گویانیدند و طرق و سبل خویش بنامهائے خود موسوم نمی گردانندند و اعتزال از هماں یک شارع عام نمی گزیدند و خروج ازیں سواد اعظم نمی پسندیدند و متفرق به هفتاد و سه فرقه نمی گردیدند تا هرگز عذاب نار نمی رسیدند،، (۲)

،،ما محمدیاں که سر ارادت خویش بر آستان پاک صاحب لولاک نهاده ایم از افتخار ایں شرف اگر آستان ما از افلاک هم بالا رود بجا است و ما مهتدیاں که باب هدایت طریقه محمدیه کشاده ایم به اعتبار ایں طریقه اشرف اگر پائے عرفان ما از همه پیش رود سزا است با حضرت خیرالمرسلین و با خاتم النبیین ،، (۳)

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ طریقہ محمدی کو خالص اسلام سمجھتے ہیں بلکہ بعض مقامات پر تنبہ کرتے ہیں کہ اسے اسلام کے دوسرے فرقوں کی طرح ایک نیا فرقہ نہ سمجھا جائے بلکہ حقیقی اسلام یہی ہے -

،،باید دانست که محمدیه خالصه را هم در اوهام باطله و افهام ناقصه خود امر جد او چیزے نو پیدا از قسم دیگر طرق و فرق خویش خیال کرده فرقه متفرقه از سواد اعظم محمدیه ندانند و اطلاق محمدیه بر آں و استحقاق خلوص محمدیاں مجازاً و اصلاً از قبیل دیگر اسماء خود ها نخوانند و باز خطا بعد خطا نه کنند،، (۴)

---

۱ - علم الکتاب از خواجه میر درد - ص ۸۴ - ۸۵
۲ - علم الکتاب از خواجه میر درد - ص ۸۵
۳ - رساله آه سرد از خواجه میر درد آه - ۵ ص ۳
۴ - علم الکتاب از خواجه میر درد - ص ۸۶

وہ امت کے مختلف فرقوں میں تقسیم ہو جانے پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تمام فرقے اور طریقے مٹ کر صرف اصل مذہب اسلام یعنی طریقہ محمدیہ باقی رہ جائے -

"پس تفرق در آنہا چگونہ بہم رسیدہ ہفتاد و دو فرقہ چرا گردیدہ . . . . . سادگی این ہمہ قوم را نظر باید نمود و اعمال و احوال اینہا سیر و تماشا باید فرمود کہ خود چہا می شوند و کجا می روند و خود را چہ می خوانند و باز بہ زعم خود چہ می دانند" (۱)

وہ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور فرقہ انگیزی کو شرک قرار دیتے ہیں - اور قوم کی اس سادگی پر افسوس کرتے ہیں کہ اس نے اپنے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا -

"مراد ما از اطلاق شرک خفی بر صاحبان محمدیہ متزجہ معنی اصطلاحی است کہ کفر طریقت باشد یعنی سرا کت نفسانیت و مداخلہ انانیت خویش در دین و ایمان شریک ساختہ اند و ازین راہ در ملت واحدہ خلل فساد و تفریق انداختہ اند نہ آن کہ شرک جلی کہ کفر حقیقی است و شرک در ذات وحدانیت او تعالی است . . . . پس منظور ما از لفظ اہل شرک خفی و محمدیہ متزجہ جماعت ۷۲ گروہ فرقہ اسلامیہ اند کہ بہ موجب حدیث ستفترق امتی از صراط مستقیم محمدیہ خالصہ جدا شدہ اند" (۲)

اس کے بعد وہ اس غلط فہمی کو پھر دور کرتے ہیں کہ ہمارا طریقہ محمدیہ اصل میں ملت کے متفرق فرقوں کو ختم کر کے "محمدی اسلام" رائج کرنے کے لئے ہے اور لوگ اسے اگر اسلام کے مختلف فرقوں میں کسی نئے فرقے کا اضافہ سمجھتے ہیں تو غلطی پر ہیں -

---

۱ - علم الکتاب از خواجہ میر درد ص ۸۷
۲ - ایضاً ص ۸۸

''محمدیان خالص را تبعیت ملت بزرگان صاحب حق خود که اکابر دین اند چون تبعیت ملت ابراهیمی است مومنین را ـ و سر مو انحراف از جاده مستقیم آن برزگواران به حال خویش روا نمی دارند و تصور عدم اتباع این اکابر اگر مظنون و متوهم کسے از راه غلط فهمی شود آنرا در حق خود محض افترا می شمارند و ناشی از عدم فهمیدگی پندارند و هرگز احتمال اس اتهام نیست ..... مگر از کسانیکه حقیقت کلام مارا نه در یافته صرف براه خباثت شتافته به چنیں توهمات باطله گرفتار شوند و محض از جهالت سوئے انکار روند،، (۱)

یہ طریقہ ان کے قول بموجب وهی طریقہ ہے جو ان کے بزرگوں، آئمہ، خلفا اور نبی کریم کا طریقہ تھا ـ وہ محض اس زمانے میں جب کہ قوم منتشر ہو گئی ہے اسے زندہ کرنا چاہتے تھے تاکہ تمام امتی خدا کی ایک رسی کو مضبوطی سے پکڑ کر متحد ہو جائیں ـ یہ ایک بہت بڑی قابل قدر کوشش تھی جس پر میر درد کا خاندان جس قدر فخر کرے بجا ہے ـ

''و ما همه اهل حق را محمدیان خالص می دانیم و طن کننده تخلف را سفیه و باطل می خوانیم،، (۲)

''همه پیران و مرشدان ما محمدیان خالص بوده اند،، (۳)

''حق تعالی امیرالمحمدین را (یعنی خواجه ناصر عندلیب را) بر شما فرستاد تا باز دعوت بر طرف همان طریقه محمدیه فرمایند و از کثرت به وحدت جذب نمایند و شما را بفهمانند که پیران ما همه محمدیه خالصه داشتند و این کثرت امتیازات که شما بهم رسانیده اند بالکل دریں طریقه منتفی بود،، (۴)

---

۱ ـ علم الکتاب از خواجه میر درد ص ۸۸
۲ ـ ایضاً ص ۸۹
۳ ـ ایضاً ص ۸۹
۴ ـ ایضاً ص ۸۹

اس حیثیت سے خواجہ ناصر عندلیب امیرالمحمدین کہلاتے ھیں کیونکہ ان میں نور محمدی کا ظہور ہوا تھا جس کی تصدیق خواجہ میر درد نے ان الفاظ میں کی ہے :-

''نسبت خاص محمدیہ خالص کہ در زمان آں سرور صلی اللہ علیہ وسلم بود و با حضرت امام عسکری علی جدہ و علیہ اسلام بطناً بعد بطن رسیدہ می آمد و بعد ازیں رو بہ اختفا آوردہ بود تار از سر نو بعد یک ہزار و یک صد و چند سال ہجری ایں فیض خاص از منبع باطن سید نبی و مقتدائے بر حق ... حضرت خواجہ محمد ناصر محمدی ظہور فرمود و بہ تفصیل تمام اسرار ایں مقام بر فرزندی از فرزنداں ایں جناب منکشف گشت،،(۱)

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو نسبت خاص محمدیہ بطناً بعد بطن نبی کریم سے حضرت امام عسکری جد اعلی خواجہ میر درد تک پہنچ کر پردہ اختفا میں چلی گئی تھی، تقریباً گیارہ سو سال بعد پھر حضرت خواجہ ناصر عندلیب کے قالب میں ظہور پذیر ہوئی جہاں سے خواجہ میر درد میں منتقل ہو گئی - اسی لئے اگر خواجہ ناصر عندلیب امیرالمحمدین کہلاتے ہیں تو خواجہ میر درد کو اول المحمدین کہا جاتا ہے - جس کا ذکر انہوں نے خود اپنی تصنیف درد دل میں کیا ہے(۲)

''اگرچہ ایں بندہ کم از خس در نظر خویش بیش از گیاہ ضعیف گلشن طریقہ محمدی نیست اما عنایت و قبول جناب حضرت عندلیب من قدر ایں ناچیز را از ہمہ افزودہ و اول المحمدین ساختہ گل سر سبد نمودہ و باب چہا چہا عنایت کشودہ ــــہ

قدر ایں نا چیز را داند جناب عندلیب   گرچہ جز کاہے نہ ام اما گیاہ گلشنم

---

۱ - علم‌الکتاب از خواجہ میر درد - ص ۹۳

۲ - رسالہ درد دل از خواجہ میر درد - ص ۱۹۸ درد ۲۵۴

خواجہ ناصر عندلیب کی شخصیت، کردار اور روحانی مسلک پر ایک اور نقشبندیہ بزرگ مسمی حضرت شاہ گلشن دھلوی کا سب بڑا اثر معلوم ہوتا ہے (۱) جن کے تخلص کی مناسبت سے خواجہ محمد ناصر نے بھی اپنا تخلص عندلیب رکھا ہے ۔ اس بات کی تصدیق خواجہ میر درد کے اس بیان سے ہوتی ہے (۲)

"این بندہ درد تخلص دارد و حضرت قبلہ کونین من ایدہ اللہ بنصرہ (یعنی خواجہ محمد ناصر) عندلیب تخلص داشتند و پیر صحبت آنحضرت شاہ سعداللہ گلشن تخلص می کردند و مرشد ایشان حضرت عبدالاحد کہ ملقب بہ گل بودند وحدت تخلص می نمودند فقیر برعایت ترتیب این تخلص را دریں مقطع غزل خویش بہ لطف موزوں کردہ"

درد از بس عندلیب گلشن وحدت شد است
جلوہ روئے گلے او را غزل خواں می کند

خواجہ ناصر عندلیب کو اکثر تذکرہ نگاروں نے حضرت گلشن دھلوی کا مرید لکھا ہے ۔ شوق رام پوری تذکرہ جام جہان نما میں لکھتے ہیں کہ (۳)

"خواجہ ناصر عندلیب نسبت مریدی از قدوہ السالکین شاہ گلشن کہ در عہد اورنگ زیب عالم گیر از مقتدائے زمانہ بود داشت"

مزارات اولیائے دھلی (۴) ، یادگار دھلی (۵) (یادگار سلف (۶) تذکرہ روز روشن (۷)، اور

---

۱ - آپ کا نام سعداللہ اور تخلص گلشن تھا - شیخ احمد سر ھندی کے نبیرہ حضرت عبدالاحد شاہ گل متخلص بہ وحدت و گل کے مرید تھے دیکھئے تذکرہ بے نظیر ص۱۰۱)

۲ - رسالہ آہ سرد از خواجہ میر درد - آہ ۱۵۶

۳ - تذکرہ جام جہاں نما - ص ۳۵۶

۴ - مزارات اولیائے دھلی - ص ۱۱

۵ - یادگار دھلی - ص ۹۴

۶ - یادگار سلف - ۹۴

۷ - تذکرہ روز روشن - ص ۵۸۶

کوثر (۱)، آب حیات (۲)، دلی کا دبستان شاعری (۳) اور واقعات دارالحکومت دہلی (۴) کے مولفوں اور مصنفوں نے بھی خواجہ ناصر عندلیب کو حضرت شاہ گلشن دہلوی کے خلفا، اور مریدوں میں شمار کیا ہے لیکن حقیقت میں وہ نسبت ارادت صرف خواجہ محمد زبیر سے رکھتے تھے البتہ شاہ گلشن دہلوی ان کے پیر صحبت ضرور تھے ۔ جیسا کہ خواجہ میر درد کی کتاب آہ سرد کی مذکورہ صدر عبارت سے صاف عیاں ہے ۔ خواجہ میر درد نے جہاں حضرت شاہ گلشن دہلوی کا ذکر کرتے ہوئے یہی کہا ہے کہ (۵)

''خواجہ محمد ناصر عندلیب گلشن تخلص داشتند و پیر صحبت، آنحضرت شاہ سعداللہ، گلشن تخلص می کردند ،،

ان کے معاصر تذکرہ نگاروں نے بھی یہی شہادت دی ہے کہ حضرت شاہ گلشن ان کے صرف پیر صحبت تھے پیر ارادت نہیں ۔ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے گل رعنا میں لکھا ہے کہ (۶)

''شیخ سعداللہ گلشن پیر صحبت او بود،،

خان آرزو نے مجمع النفائس میں کہا ہے کہ (۷)

''حضرت شیخ سعداللہ گلشن پیر صحبت ایشان بودند،،

خواجہ ناصر عندلیب کی اپنی تصنیف رسالہ ہوش افزا میں پیر صحبت کی بجائے ''استاد،، کا لفظ دیکھنے میں آتا ہے ۔ ان سے مکالمے کے دوران ایک بزرگ کہتے ہیں کہ (۸)

---

۱ - رود کوثر - ص ۳۹۴
۲ - آب حیات - ص ۱۸۴
۳ - دلی کا دبستان شاعری - ص ۱۷۵
۴ - واقعات دارالحکومت دہلی جلد دوم - ص ۵۷۵
۵ - آہ سرد - آہ ۱۵۶
۶ - گل رعنا - ص ۲۱۶ - (مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی)
۷ - مجمع النفائس (مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی) - ص ۲۶۱ الف
۸ - رسالہ ہوش افزا - ص ۹۷ ب (مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی)

"بارہا بجناب پیر بزرگوار شما حضرت شیخ محمد زبیر نقشبندی مشرف گردیدہ بہ میان حلقہ ہائے مراقبہ ایشان نشستہ ام و بہ خدمت استاد شما حضرت شاہ گلشن بسیار ارتباط و خصوصیت داشتم"

اصل میں خواجہ ناصر عندلیب نے شروع شروع میں حضرت شاہ گلشن دہلوی کی صحبت اختیار کی تھی لیکن ان کے باقاعدہ مرید نہیں ہوئے تھے بعد میں حضرت خواجہ محمد زبیر سے تعلق ہو جانے پر ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ خواجہ میر درد رسالہ آہ سرد میں اس تفریق کی واضح نشان دہی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ (۱)

"پیر بیعت حضرت قبلہ گوہی حضرت محمد زبیر بودند و پیر صحبت در اوائل احوال حضرت شاہ سعداللہ گلشن تخلص قدس سرہ بودند"

بعض شواہد سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خواجہ ناصر عندلیب نے حضرت شاہ گلشن دہلوی کے کہنے پر ہی حضرت خواجہ محمد زبیر کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ مولف معمولات مظہریہ کے ایک بیان سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ حضرت گلشن دہلوی عموماً اپنے ملنے والوں کو حضرت خواجہ محمد زبیر کی مریدی اختیار کرنے کے لئے بھیج دیا کرتے تھے۔ مرزا مظہر جان جاں کے ذکر میں انہوں نے لکھا ہے کہ (۲)

"بعد ازاں بخدمت حضرت شاہ گلشن کہ خلیفہ حضرت شیخ عبدالاحد سرہندی و نبیرہ حضرت مجدد بودہ اند رفتند چوں معلوم شد کہ ایشان یاران خود را بخدمت حضرت خواجہ محمد زبیر قدس سرہ کہ نبیرہ حضرت مجدد الف ثانی بودند سپردند رجوع بخدمت حضرت محمد زبیر آوردند" (۳)

خزینۃ الاصفیا کے مولف نے بھی ان دونوں بزرگوں کے گہرے مراسم اور شب و روز کی صحبت کا ذکر کیا ہے۔ اس لئے یہ بات غلط معلوم نہیں ہوتی کہ خواجہ ناصر

---

۱ - آہ سرد - ص ۱۱۷ (آہ ۲۶۷) و ص ۹۸ (آہ ۱۵۵)
۲ - معمولات مظہریہ - ص ۱۳
۳ - خزینۃ الاصفیا - ص ۶۴۰

عندلیب کی رسائی بھی خواجہ محمد زبیر تک حضرت شاہ گلشن دہلوی کی ہدایت اور ذریعے سے ہوئی ہو گی۔ سر سید نے آثار الصنادید میں صاف لکھا ہے کہ (۱)

"خواجہ محمد ناصر عندلیب نے بموجب ہدایت شاہ گلشن صاحب کے حضرت خواجہ محمد زبیر صاحب سے بیعت کی تھی"

اس انتقال تعلق کے باوجود حضرت خواجہ ناصر عندلیب کو حضرت شاہ گلشن دہلوی سے گہری عقیدت اور شدت کا لگاؤ تھا۔ جس کا اظہار خواجہ میر درد کی اس رباعی سے ہوتا ہے جس میں کہ انہوں نے خواجہ ناصر عندلیب کو شاہ گلشن کا عاشق کہا ہے (۲)۔

ہرچند نہ ام بہ ذات خود لائق تو	لیکن دارم محبتے صادق تو
اے حضرت عندلیب والا درگاہ	تو عاشق گلشنی و من عاشق تو

خواجہ میر درد کے فارسی دیوان اور نثری تصانیف علم الکتاب، نالہ درد، آہ سرد، شمع محفل، درد دل وغیرہ میں حضرت شاہ گلشن دہلوی سے عقیدت، اور محبت کے جو اشعار دیکھنے میں آئے ہیں اس کی وجہ بھی ان کے والد خواجہ محمد ناصر عندلیب کی ان سے گہری محبت، اور نسبت تھی۔ وہ خود اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے رسالہ آہ سرد میں لکھتے ہیں کہ (۳)

"من شوریدہ حال حضرت محمد زبیر و حضرت شاہ گلشن را برائے حضرت قبلہ کونین خود می پرستم و الا با وجود دریافت صحبت‌ہائے ایشان و تفضل و مہربانیہائے بے پایاں بالذات بندہ درگاہ حضرت خویش ہستم۔ اے باغبان گلستان ایجاد من ازاں سبب خیر خواہ گلشنم کہ دلدادہ نالہ عندلیب خویشتنم و در ہر مقام ہمیں آہنگ می سرائم و برنام عندلیب و گلشن فدائم۔

---

۱ - آثار الصنادید - باب تیسرا ص ۲۲
۲ - نالہ درد از خواجہ میر درد - ص ۲۰ - نالہ ۱۰۳
۳ - آہ سرد - ص ۱۱۶ - آہ ۲۵۶

باغبان هر جا که باشم خیرخواه گلشنم
من فدائے عندلیب و خاک راہ گلشنم

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں (۱)

" حق تعالی ایں فقیر خاکسار را نیز من کاسات الکرام بہرہ نصیب گرداند،،

چوں مرقع صد بہار از خرمن گل می کند
در فقیری بہرہ مند از فیض شاہ گلشنم

حضرت شاہ گلشن دھلوی کا خواجہ ناصر عندلیب پر سہ گونہ اثر تھا۔ ایک روحانیات میں، دوسرا شاعری میں اور تیسرا موسیقی میں ۔ روح کا ذکر تو اجمالاً ہو چکا شعر و شاعری میں بھی خواجہ ناصر عندلیب اچھا مذاق رکھتے تھے اور انہوں نے اپنا تخلص عندلیب، حضرت شاہ گلشن کے تخلص کی مناسبت سے ھی رکھا تھا۔ اس سے اس میدان میں بھی ان پر شاہ گلشن کے اثرات کا اندازہ ہو سکتا ھے ۔ بزم تیموریہ کے مولف نے انہیں ریختہ گو شاعروں میں شمار کیا ھے۔ جو درست معلوم نہیں ہوتا (۲) وہ صرف فارسی شعر کہتے تھے۔ کبھی کبھار امیر خان انجام کے گھر شاعرانہ مجلسوں میں ضرور جایا کرتے تھے لیکن ان کی ریختہ گوئی کی شہادت نہیں ملتی۔ نواب امیر خان انجام سے بھی ریختہ کا صرف ایک آدھ شعر منسوب ھے زیادہ نہیں یہ اس زمانے کی بات ھے جب بعض فارسی گو شاعر تفنن طبع کے طور پر کوئی شعر یا مصرع ریختہ میں موزوں کر لیتے تھے ممکن ھے ایسی ہی کسی صحبت میں خواجہ ناصر عندلیب سے بھی کوئی شعر ریختہ کا ہو گیا ہو لیکن تذکروں سے اس کی تصدیق بھی نہیں ہوتی۔ البتہ ان کی فارسی شاعری کا ذکر معاصر تذکرہ نویسوں نے ضرور کیا ھے۔ مثال کے طور پر سراج الدین علی خاں آرزو مجمع النفائس میں کہتے ہیں کہ (۳)

---

۱ - آہ سرد - ص ۱۱ ب آہ ۲۵ ب
۲ - بزم تیموریہ - ۳۰ ب
۳ - مجمع النفائس - ص ۲۶۱ الف

" هر چند شاعری دون مرتبہ ایشان است اما گاہے گاہے بہ موزونی طبع شعر می گویند"

لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے گل رعنا میں کہا ہے کہ (۱)

" بنا بر موزونی طبع گاہے زبان را شعر آشنا می ساخت"

رہی موسیقی تو خواجہ ناصر عندلیب پر عموماً اور ان کے بیٹے خواجہ میر درد پر خصوصاً شاہ گلشن دہلوی کا اثر اس لحاظ سے مسلم ہے - شاہ گلشن اگرچہ تصوف کے نقشبندیہ خاندان سے متعلق تھے لیکن نہ جانے کیوں موسیقی کی طرف بہت زیادہ مائل تھے (۲) - تذکرہ نگاروں نے انہیں خسرو ثانی کے لقب سے یاد کیا ہے مؤلف نشتر سخن کہتے ہیں کہ (۳)

" شاہ گلشن در علم موسیقی کمال تحقیقات پیدا کردہ وے را خسرو ثانی می گفتند"

نواب صدیق حسن خان نے تذکرہ روز روشن میں کہا ہے کہ (۴)

" در فن موسیقی بہ غایتے رسید کہ بہ خسرو ثانی مشتہر گردید"

لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے گل رعنا میں لکھا ہے کہ (۵)

" درموسیقی ہندی بہ حدے ماہر بود کہ او را خسرو زمان دانستند"

خواجہ میر درد رسالہ آہ سرد میں لکھتے ہیں کہ (۶)

" شاہ گلشن درعلم موسیقی دخل تام داشتند"

---

۱ - گل رعنا - ص ۲۶۱

۲ - تصوف کے نقشبندیہ مشرب میں اگرچہ سماع کو جائز نہیں سمجھا جاتا لیکن اس کے سربراہ خواجہ بہاالدین نقشبند کے متعلق مشہور ہے کہ وہ سماع کے متعلق کہا کرتے تھے کہ " انکار نمی کنم و این کار نمی کنم"۔۔۔ دارا شکوہ نے سفینہ الاولیا میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ خواجہ بزرگ نے وصیت کی تھی کہ میرے جنازے کے آگے اس شعر کو پڑھتے جائیں

۳ - نشتر سخن ; مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی) ۳۸۵ الف (جلد دوم)

۴ - روز روشن ص ۵۸۶

۵ - گل رعنا (مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی) - ص ۲۵۲ ب

۶ - رسالہ آہ سرد - ص ۱۱۷

شاہ گلشن دھلوی کے متعلق تو یقین سے نہیں کہا جا سکتا البتہ خواجہ میر درد یہ کہتے ہوئے سنے گئے ہیں کہ ان کے خاندان یا کم از کم ان میں سماع کا ذوق اللہ کی جانب سے ہے اور وہ اس ''ابتلا،، میں مرضی الٰہی کے مطابق گرفتار ہیں لیکن وہ اسے اپنے مشرب کی بنیاد پھر بھی قرار نہیں دیتے۔ نالہ درد میں لکھتے ہیں کہ (۱)

''سماع من منجانب اللہ است۔ و حق بر این امر ہمہ وقت گواہ کہ خود بخود گویندگان می آیند و ما دام کہ می خواھند.........................
می سرایند نہ آن کہ فقیر این ھا را می طلبد و شنیدن سرود را چون دیگران عبادت می فہمد بلکہ ہمان معاملہ نہ انکار می کنم و نہ این کار می کنم در پیش اسب و عقیدہ من ھمان است کہ عقیدہ بزرگان من است اما چون دریں ابتلا حسب مرضی الٰہی گرفتارم ناچار خدا عم بیامرزد و فتوی اباحت این کار بیاران خود نہ دادہ ام و بنیاد سلوک بر سماع نہ نہادہ ام تا دیگر صاحبان ہم طریق ما کہ اصلا وقف از کیفیت نغمہ نیستند در خارج آھنگی آمدہ اس ہمہ نغمات سرودنی در حق من عاصی مقر سرایند و بے اصول غائبانہ لب طعن کشایند اے کرم فرمایان این ہمہ غصہ عبث نہ باید خورد و سر بگریبان خود ہم باید برد خدا قادر است،،

خواجہ ناصر عندلیب، خواجہ محمد زبیر کی مریدی، حضرت شاہ گلشن دھلوی کے فیض صحبت، اور ذاتی مجاھدہ و ریاضت کے بل بوتے پر تصوف کے اس بلند مقام پر فائز ہو گئے تھے جو صرف اخص بزرگوں کا ہی حصہ ہے۔ میر تقی میر نے نکات الشعرا میں اسی لئے انہیں مقتدائے عالم (۲) خان آرزو نے مجمع النفائس میں قطب فلک ھدایت اور مرکز دائرہ ولایت (۳) اور قیام الدین قائم نے مخزن نکات میں (۴) یکے از اولیائے روزگار و مشائخ کبار کہا ہے۔ خواجہ

۱ - نالہ درد - ص ۷ - نالہ ۳۷
۲ - نکات الشعرا - ص ۵۴
۳ - مجمع النفائس - ص ۲۲۱ الف
۴ - مخزن نکات - ص ۱۱

میر درد رسالہ آہ سرد میں کہتے ہیں کہ (۱)

" از جمال باکمال حضرت قبلہ کونین خود چہ بیان نمایم و قطع نظر از توصیف کمال باطنی در توصیف جمال ظاہری آنحضرت ہم چہ لب کشائم کہ یک بار در شرف ملازمت رسیدہ شیفتہ شیدائے آن جمال باکمال گردیدہ و در سواری مبارک ہم از ہر جانب شناسا و غیر شناسا ہر کہ می دید بے اختیار سلام کردہ برائے قدم بوسی می دوید "

خواجہ میر درد نے اپنی دوسری تصانیف میں خواجہ ناصر عندلیب کے ساتھ جو روحانی قوتیں اور بزرگانہ مراتب منسوب کئے ہیں وہ چند چوٹی کے اولیا میں ہی ہو سکتے ہیں ۔ وہ جگہ جگہ ناصر کے نام کو اس طرح استعمال کرتے ہیں جیسے جملہ خدائی طاقتیں اور صفات ان میں مجتمع ہو گئی ہوں ۔ انہوں نے اپنی مشہور تصنیف علم الکتاب کی ہر وارد کو "ھوالناصر" کے عنوان سے شروع کیا ہے ۔ یہاں ھوالناصر کا اشارہ اگرچہ خدا کی ذات کی طرف ہے اور ہونا بھی چاہیے لیکن خواجہ میر درد اس میں خواجہ ناصر عندلیب کو بھی شریک سمجھتے ہیں بلکہ ایک رباعی میں تو ان کے بیان سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ ان کی مراد خواجہ ناصر ہی سے ہے ۔ وہ رباعی یہ ہے (۲)

آن ذات مقدس است ہر دم حاضر در حال جہانیان ہر جا ناصر
دست من و دامان رسول و آلش در ہر دو جہان است محمد ناصر

اس رباعی کے دومعنی قافیوں سے اگرچہ ہم کوئی صحیح نتیجہ نہیں نکال سکتے لیکن اس قدر ضرور ہے کہ لفظ ناصر کے استعمال سے خواجہ میر درد نے خواجہ محمد ناصر عندلیب کی بلند روحانی طاقتوں کی طرف اشارہ ضرور کیا ہے ۔

خواجہ ناصر عندلیب کی ولایت کا ایک یہ امتیاز بھی تھا کہ انہوں نے کسی سے کسب علم نہیں کیا تھا بلکہ ان پر علم و عرفان کے دارورے خداوند کریم کے خاص فضل سے از خود کھل گئے تھے ۔ وہ امی محض تھے لیکن اس کے باوجود

---

۱ ۔ رسالہ آہ سرد ۔ ص ۸۳ ۔ آہ ۳۷

۲ ۔ علم الکتاب ۔ ص ٦۳۸

عالم اجل اور صوفی کامل تھے ۔ خواجہ ناصر عندلیب نے رسالہ ہوش افزا میں خود ھی اپنے علم لدنی اور الہام الہی کا ذکر کیا ھے (۱)

" پس این همه علوم معارف شنیده او و این قدر معاملات و کارهائے دیده او که هر کدام را نادر و جدید می یابم محض از تائید علم لدنی و از الهامات الهی می نگارم"

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں کہ (۲)

" وآنچه هادی برحق این امی مطلق را از کمال کرم خویش حقائق و دقائق امور اعتقادات و عبادات مشهود و معاش گردانیده و برائے علم و عرفان آیات قرآنی و احادیث مصطفوی را باستشهاد رسانده نیز به کنایت در آوردم"

خواجہ ناصر عندلیب کے صحبت یافتہ اور معاصر تذکرہ نویسوں نے بھی ان کے علم لدنی کی تعریف کی ھے ۔ خان آرزو نے مجمع النفائس میں لکھا ھے کہ (۳)

" هرچند تحصیل ظاهر نه کرده اند اما درے از غیب بر روئے قلب ایشان وا شده که تحقیقات صوفی و متکلم و حکیم بے تکلف بر زبان حقائق ترجمانش جاری است چنانکه از ناله عندلیب که از تالیفات شریفه ایشان است روشن است"

تصوف و عرفان کے موضوع پر ان کی دو کتابیں نالہ عندلیب اور رسالہ ہوش افزا کے نام سے ھیں ۔ نالہ عندلیب تو صوفیا کی ثقہ کتابوں میں شمار ہوتی ھے ۔ یہ تقریباً اٹھارہ سو صفحے کی ایک ضخیم نثری کتاب ھے جسے محمد حسین آزاد نے آب حیات میں محض رسالہ (۴) اور رام بابو سکسینہ نے تاریخ ادب اردو میں دیوان کہا

---

۱ - رسالہ ہوش افزا - ص ۴۹ ب
۲ - رسالہ ہوش افزا - ص ۲ الف
۳ - مجمع النفائس - (مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی) - ص ۲۶۱ الف
۴ - آب حیات - (بیان میردرد)

ہے (۱) آزاد کی نظر سے نالہ عندلیب کا غالباً وہ نسخہ گزرا ہوگا جسے عبدالحق شہید فتح پوری نے خلاصہ" العندلیب کے نام سے اصل کتاب کی تلخیص کر کے کتابچے کی صورت میں لکھا تھا۔ اس کتابچے کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں بھی موجود ہے جس پر نام نالہ عندلیب ہی لکھا ہے۔ اصل کتاب اس سے بہت ضخیم ہے۔ اس کی وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے نواب حبیب الرحمن خان شروانی نے لکھا ہے کہ خواجہ ناصر عندلیب فرماتے تھے (۲) کہ " اکثر آدمی مجھ سے مختلف مطالب اور مسائل دریافت کرتے تھے صوفی طریقت کے جویا تھے مثلاً احکام شرعیہ پوچھتے تھے۔ مثلاً بعض جوان مذہب شیعہ و سنی کی تحقیق چاہتے تھے بعض اخلاق ستودہ کے متلاشی تھے۔ کسی کو عشق مجازی کی حکایوں کا شوق تھا اہل عقل کو عقلی پیرایہ کی جستجو تھی۔ اسی عرصہ میں حضرت قبلہ عالم نے رحلت فرمائی ادائے تعزیت کے لئے اعزہ اور احباب کا مجمع میرے مکان پر ہوا اسی موقع پر افسانے کے پیرائے میں برہان ہندی مطالب بالا کے جواب میں نے بیان کئے دن شب و روز صحبت رہی اپنے اپنے مطالب کے جواب پاکر سامعین پر عجب عالم طاری ہوا سامعین مصر ہوئے کہ اس افسانہ کو قلمبند کروں عرصہ تک ٹالا آخر اشارہ غیبی پاکر فارسی زبان میں لکھ دیا،، اس کتاب کی تالیف میں خواجہ میر درد نے اپنے والد بزرگوار کی ان معنوں میں بہت مدد کی ہے کہ جو کچھ خواجہ بزرگوار بولتے جاتے یہ اسے قلمبند کرتے جاتے۔ کتاب کا طریقہ تالیف بیان کرتے ہوئے خواجہ ناصر عندلیب کہتے ہیں کہ میں عشا کے بعد مخصوص احباب کے روبرو اپنے بیانات زبانی کہتا چلا جاتا جنہیں خواجہ میر درد لکھتے رہتے اگر اتفاق سے وہ نہ ہوتے تو میرے ایک اور مرید جن کا نام بیدار تھا قلمبند کرتے جاتے اور اگر دونوں میں سے کوئی نہ ہوتا تو میں خود ہی لکھتا جاتا۔ یہ کتاب ۱۱۵۳ھ میں مکمل ہوئی جس کی خواجہ میر درد نے ''نالہ عندلیب گلشن ماست،، تاریخ کہی

---

۱ - تاریخ ادب اردو (بیان میر درد) صاف ظاہر ہے کہ اس کتاب کو دیوان کہنا غلطی ہے۔

۲ - بحوالہ مقدمہ دیوان درد از نواب حبیب الرحمن خان شروانی ص ۲۳۔

جو کتاب کے دیباچے میں موجود ہے اور جس* کا ذکر خواجہ میر درد نے اپنے رسالے نالہ درد میں بھی کیا ہے - وہ لکھتے ہیں کہ(۱)

'' بندہ درحضور اقدس وقت تسوید نالہ عندلیب قطعہ تاریخ گفتہ کہ مصرع آخرش بلا کم و کاست مادہ تاریخ است و بہ سمع قبول آں حضرت رسیدہ داخل خطبہ کتاب گردیدہ و آں این است ''

سال تاریخ این کلام شریف — کہ سوئے حق انجذاب ما ست
کرد الہام حق بگوش دلم — نالہ عندلیب گلشن ماست
۱۱۵۳ھ

اس کتاب کو خواجہ میر درد نے اس قطعہ میں سوئے حق انجذاب ما اور ایک دوسری جگہ موصل الی الحبیب کہا ہے اور یہی اس کے مضامین کا نچوڑ ہے - یہ کتاب نواب شاہجہاں بیگم نور اللہ مرقدھا رئیسہ بھوپال کی کوششوں سے چھپ چکی ہے -

خواجہ ناصر عندلیب کی دوسری تصنیف رسالہ ہوش افزا ہے جو اپنی طرز کی انوکھی کتاب ہے - اس میں انھوں نے تمثیلیہ اور عارفانہ انداز میں ایک قسم کے کھیل کی تفصیل دی ہے جو انھوں نے شطرنج کے مقابلے میں ایجاد کی تھی چونکہ اس زمانے میں عوام شطرنج جیسی غیر شرعی بازی میں بہت مشغول رہتے تھے اور اپنا وقت عزیز بے فائدہ اور رائگاں گنواتے تھے اس لئے خواجہ ناصر عندلیب نے انہیں ایک متبادل اور مفید بازی میں مصروف رکھنے کے لئے یہ رسالہ لکھا ان کا خیال ہے کہ شطرنج شراب کہنہ کا حکم اور اثر رکھتی ہے اور شرع کی رو سے شراب اور دوسری نشہ آور چیزوں کی طرح اس کی حرمت بھی ثابت ہوئی ہے - اس لئے مسلمانوں کے لئے یہ کھیل حرام ہے - کتاب اسی نشہ کو چھڑانے کے لئے ہے -

خواجہ ناصر عندلیب نے روحانی دولت اپنے سسرال سے بھی ورثے میں پائی تھی انہوں نے یکے بعد دیگرے دو شادیاں کیں ان کی پہلی شادی حضرت شاہ میر بن سید لطف اللہ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی - جو ایک صاحب نسبت بزرگ

---

۱ - نالہ درد - ص ۶ - نالہ ۳۴

اور صحیح النسب حسینی سید تھے - سید ناصر نذیر فراق نے مولوی سید محبوب عالم مرحوم کی یاد داشت کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان کا مزار دهلی میں شاہ جیو نظام‌الدین کے باغ میں واقع ہے - یہ باغ خواجہ محمد ناصر عندلیب کے مزار کی شمالی جانب ہے - اس بیوی کے بطن سے ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جن کا نام میر محمد محفوظ محمدی تھا وہ تقریباً ۲۹ سال کی عمر میں ۱۱۵۴ھ میں اپنے باپ کی زندگی میں ہی فوت ہوگئے تھے - خواجہ میر درد نے علم‌الکتاب میں جہاں اپنے بھائیوں کا ذکر کیا ہے میر محمد محفوظ محمدی کو بہت عزت و احترام سے ان کے کمالات ظاہری و باطنی کا ذکر کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ (۱)

" چون بتقریب مذکور اسمائے برادراں به قلم آمد داد برادر کلاں فقیر بیر ازسینه جوش زده نام شریف ایشان میر محمد محفوظ محمدی بود تاریخ ولادت ایشان از لفظ محمد محفوظ مستفاد می شود عجب کمالات ظاهری و باطنی داشتند و داغ معارف بر دل هرکه یک بار هم دیده باشد گذاشتند کمال شفقت و عنایت بر این بنده می نمودند و سلوکے که درخور حال این بالائی بود نمی فرمودند بلکه از راه کمال کرم در حق این فقیر ارشاد می کردند که حق تعالی شما را از صغر سن نسبت خاص بجود عطا کرده است متوجه احوال من باشد آن در عین شباب و جوانی ازین جهان فانی در حین حیات حضرت قبله گونین رخصت نمودند و در سن بیست و نه سالگی بتاریخ سازدهم شهر رجب ۱۱۵۴ھ سفر به عالم باقی فرمودند"

خواجہ ناصر عندلیب کی دوسری شادی میر احمد خاں شہید اول کی پوتی اور میر سید محمد قادری کی بیٹی سے ہوئی تھی جن کی کوکھ سے خواجہ میر درد اور ان کے دوسرے بھائی بہن پیدا ہوئے - اس کا ذکر خواجہ میر درد نے خود اپنی تصنیف علم‌الکتاب میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ (۲)

" اسم این فقیر که خواجه میر است وقت تولد بنده والد بزرگوار والده ماجده ام سید العارفین حضرت میر سید محمد حسینی قادری بن نواب میر احمد خان شهید قدس سرهما العزیز گذاشته اند"

---

۱ - علم الکتاب - ص ۸۳

۲ - علم الکتاب - ص ۸۳

میر سید محمد قادری کے باپ میر احمد خان اول شہید خان بیوتات خواجہ عبدالرحیم کے داماد تھے (۱)۔ خواجہ عبدالرحیم ولایت فرغانہ کے شہر اندجان کے رہنے والے تھے (۲)۔ ان کے والد کا نام خواجہ ابوالقاسم تھا (۳)۔ جو اپنے وقت کے مسہور مشائخ میں شمار ہوتے تھے ۔ وہ شاہجہان کے عہد میں ہندوستان مس وارد ہوئے اور زمانہ شباب ھی میں انہوں نے سلطان دارا شکوہ کی رفاقت کا امتیاز حاصل کر لیا۔ عالم گیر تخت نشین ہوا تو اس کی ملازمت میں آ گئے اور خطاب خانی سے سر افراز ہوئے (۴) یہاں تک کہ سلطان عالم گیر نے خدمت بیوتانی ان کے سپرد کر دی۔ انہوں نے ۱۱۰۳ھ میں انتقال کیا۔ ان کی اولاد میں ایک وہ لڑ کی تھی جو میر احمد خان شہید سے بیاھی گئی تھی اور چند بیٹے اور تھے جن میں سے ایک کا نام میر نعمان خان تھا جن کے بیٹے میر عبدالمنان خان پہلے دکن میں نظام‌الملک آصف جاہ کی خدمت میں تھے اور پھر درویشانہ مزاج کی بنا پر خانہ نشین ہو گئے تھے۔ وہ شعر بھی کہتے تھے اور عترت تخلص کرتے تھے۔

شاھنواز خان نے ماثرالامرا میں لکھا ہے(۵) کہ میر احمد خان عالم گیر کے زمانے میں پہلے شاھزادہ محمد اعظم شاہ کی فوج میں واقعہ نویسی اور بخشی گری پر مامور تھے ۔ پھر شہزادہ بیدار بخت کی فوج کے دیوان مقرر ہوئے۔ ساقی خان نے مآثرعالم گیری میں بھی ان کے دیوان مقرر ہونے کا ذکر کیا ہے (۶) اور مزید لکھا ہے کہ وہ خاندیس کے صوبے کی نیابت پر بھی ممتاز رہے ہیں (۷)۔ جب شاہ عالم کام بخش کے ساتھ جنگ کے بعد واپس آیا اور اس کی فوج برھانپور میں خیمہ زن ہوئی تو اس نے برھانپور کے قریب ایک شکارگاہ میں شکار کھیلنے کا

---

۱ - مآثرالامرا - جلد سوم - ص ۶۶۲
۲ - ایضاً
۳ - ایضاً
۴ - ایضاً
۵ - ایضاً
۶ - مآثر عالم گیری - ص ۴۰۸
۷ - ایضاً

ارادہ کیا (۱)۔ لیکن اس زمانے میں شمالی ہند میں سکھوں اور راجپوتوں نے شورش بر پا کردی ۔ اس بنا پر شاہ عالم قصبہ مذکور کو میر احمد خاں کی حراست میں دے کر خود ان کی گوشمالی کے لئے چل کھڑا ہوا۔ یہ واقعہ شعبان ۱۱۲۱ھ کا ہے۔ اس کے اگلے سال ہی تلسی بائی نامی ایک مرہٹہ عورت نے بھی ریشہ دوانیاں شروع کر دیں وہ برہانپور پر حملہ آور ہوئی اور میر احمد خان اپنے بہت سے رشتہ داروں کے ساتھ اس آویزش میں شہید ہوگئے۔ مآثرالامرا میں میں لکھا ہے کہ (۲)۔

"اتفاقاً در سال چہارم ۱۱۲۲ھ تلسی‌بائی نام زنے یکے از سرداران مرہٹہ با فوج بسیار تاخت آورد ۔ میر احمد خاں شہید با بیشتر از اولاد و اقربا و دو ثلث لشکر در معرکہ جام شہادت چشیدند"

تذکرہ تیموریہ ، گلزار آصفیہ اور تذکرہ خواتین تیموریہ میں بھی میر احمد خان شہید کی شہادت کا حال اسی طرح لکھا ہے۔ لیکن نواب حبیب‌الرحمن خان شروانی نے دیوان درد پر مقدمہ لکھتے ہوئے کہا ہے کہ (۳)

"خواجہ ناصر عندلیب تخلص کے نانا میر سید محمد حسینی تھے جو بیٹے تھے نواب میر احمد خاں شہید کے۔ نواب صاحب پانی پت کے معرکے میں نادر شاہ کے مقابلے میں شہید ہوئے"

اور پھر اپنے دعوی کے ثبوت میں تاریخ جہاں‌کشائے نادری کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کا ذکر اس تاریخ میں بھی موجود ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ وہ مشہور اردو شاعر مرزا رفیع سودا کے ممدوح بھی تھے۔ مرزا نے ان کی شان میں ایک قصیدہ بھی لکھا ہے (۴)

---

۱ - یہ جگہ برہان پور سے تین کروہ کے فاصلے پر تھی - اس میں صاف پانی کی ایک خوبصورت نہر تھی جس پر بند باندھ کر تقریباً سو گز کے فاصلے سے ایک آبشار گرائی تھی - اس کا نام تاریخوں میں کرارہ لکھا ہے -

۲ - مآثرالامراء - جلد سوم ص ۶۶۳/۶۶۵

۳ - مقدمہ دیوان درد از نواب حبیب الرحمن خان شروانی - ص ۲

۴ - ایضاً

نواب حبیب‌الرحمن خان شروانی کے اس بیان میں قطع نظر اس غلطی کے کہ انہوں نے میر سید محمد قادری کو خواجہ میر درد کی بجائے خواجہ محمد ناصر عندلیب کا نانا کہا ہے میر احمد خان شہید کا پانی پت کے میدان میں شہید ہونا بھی تاریخی اعتبار سے درست نہیں اور پھر جہاں کشائے نادری میں بھی ان کا کہیں ذکر نہیں اور نہ ہی وہ سودا کے ممدوح تھے۔

جہاں کشائے نادری میں جو مہدی خان کی تصنیف ہے علی احمد خان کے نام سے ایک اور امیر کا ذکر ملتا ہے۔ جو سودا کے ممدوح بھی تھے (۱) اور پانی پت کے میدان میں شہید بھی ہوئے تھے۔ وہ سیف‌الدولہ سادات خان ذوالفقار جنگ کے بھانجے اور احدیوں کے بخشی تھے۔ نواب حبیب‌الرحمن نے شاید غلط فہمی سے انہیں ہی میر احمد خان شہید سمجھ لیا ہے۔ جہاں کشائے نادری کی عبارت یہ ہے (۲)

" خان دوران که سپه سالار و مدار سلطنت هندوستان بود زخم دار گشته یک پسر او با مظفر خان برادرش مقتول و عاشور خان به تقید درآمد خودش بروز دیگر به علت آن زخم که افتاده بود درگذشت و اصلی خان سردار قسون خاص پادشاهی با شهداد خان افغان و یادگارخان و میر حسن خان کوکه، و اشرف خان و اعتبار خان و عاقل بیگ خان و علی احمد خان که امرائے معتبر بودند تا قریب صد نفر از خوانین و عظمائے دیگر و سی هزار تن از لشکریان ایشان عرضه شمشیر زهر آبگون گشتند "

خواجہ میر درد کے میر احمد خان شہید جیسا کہ تفصیل سے بیان ہو چکا ہے تلسی بائی کے مقابلے میں برہانپور کے قریب شہید ہوئے تھے۔ اس جنگ میں ان کے دو بیٹوں کے سوا تقریباً سبھی خویش و اقارب مارے گئے۔ ان بیٹوں میں سے ایک کا نام میر محامد خان تھا اور دوسرے کا میر سید محمد۔ میر محامد خان،

---

۱ - سودا نے ان کی مدح میں تین قصیدے لکھے ہیں - تفصیل کے لئے دیکھئے سودا از شیخ چاند

۲ - تاریخ جہان کشائے نادری از مہدی خاں - ص ۱۸۷

جو امن آباد (پنجاب) کی فوجداری پر مامور تھے اپنے باپ کے مرنے کے بعد انھی کے خطاب سے مشہور ہوئے اور میر احمد خان ثانی کہلانے لگے۔ میر سید محمد قادری اپنے بھائی کے برعکس درویشانہ زیست کرتے تھے اور تصوف و عرفان کی دنیا میں بلند منصب پر فائز تھے۔ خواجہ میر درد نے ان کے اوصاف ظاہری و باطنی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ (۱)

''جناب ایشان عجب جاه و جلال مرتبہ فقر و استغنا داشته اند و مرتبه بزرگی و کمال داده اند سیادت و امارت و شرافت و شجاعت و غیرت و همت و جرأت و فتوت این خاندان و آبا و اجداد مادری و پدری ایشان ثابت بالاتفاق است و شهره آفاق''

خواجہ محمد ناصر عندلیب کی شادی انھی میر سید محمد قادری کی بیٹی سے ہوئی تھی جن کا نام سید ناصر نذیر فراق نے میخانہ درد میں بجی بیگم عرف منگا بیگم لکھا ہے۔ ان کے بطن سے اولاد نرینہ میں خواجہ میر درد اور ان کے دوسرے بھائی پیدا ہوئے جن میں سے ایک کا نام خواجہ میر اثر اور دوسرے کا نام سید میر محمدی تھا۔ اخرالذکر عین جوانی کے آغاز میں تقریبا ۱۹ سال کی عمر میں فوت ہوگئے تھے۔ علم الکتاب میں خواجہ میر درد نے اپنے بھائیوں کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ (۳)

'' نام برادر عزیز خواجہ محمد میر حق تعالی سلامت دارد و در هیچ جا و هیچ حال جدا از بنده نگذارد نیز به همین الفاظ است و برائے امتیاز هر دو اسم توسط اسم مبارک محمد به میان آورده شد و تعبیر از همین معنی است آنکه نام دیگر برادر خورد بنده که چند سال ازین برادر عزیزم سلمه الله کلاں بودند سید میر محمدی بود عجب کمالات و تقدس ذات از بدو خلقت و ابتدا طفولیت داشتند و در سن نوزده (۱۹) سالگی

---

۱ - علم الکتاب ص ۸۴

۲ - میخانہ درد - ص ۱۰۶

۳ - علم الکتاب ص ۸۴

در حضور اقدس بتارخ پنجم شهر ربیع‌الثانی ۱۱۶۳ھ جہان فانی را گداشند،،

حواجہ میر درد کا خاندان اپنی ان نام سلسلہ در سلسلہ روحانی اور دنیوی فضیلتوں کے اعتبار سے جن کی تفصیل اپھی گرری ہے قران السعدین اور مجمع‌البحرین نظر آتا ہے رسالہ ہوش افزا میں حواجہ ناصر عندلیب سے خطاب کرتے ہوئے اسی لئے ایک بزرگ نے کہا تھا کہ (۱)

”شما معزز ترین امیر زادہ و بے شبہ عمدہ زادہ اید،،

یہ امیر زادگی ایک مقام پر تو شہزادگی میں شامل ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ خواجہ میر درد کے اجداد میں سے حواجہ محمد صالح، حواجہ محمد یعقوب اور حواجہ محمد موسیٰ تینوں شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے بھائی شہزادہ مرادبخش اور شہزادہ معزالدین کی لڑکیوں سے بیاہے ہوئے تھے - خود بادشاہ عالم گیر کے اپنے بیٹوں کی شادیاں بھی اس کے بھائیوں کے گھر ہو جانے سے تو یہ رشتہ شہزادگی اور زیادہ گہرا اور مضبوط ہو جاتا ہے - مثال کے طور پر اورنگ زیب کے بیٹے شہزادہ محمد سلطان کی شادی ۱۶۵۹ھ میں شاہ شجاع برادر اورنگ زیب کی لڑکی گل رخ بانو سے ہوئی تھی (۲) - اس شہزادے کی دوسری شادی ۱۶۷۲ء میں اورنگ زیب کے دوسرے بھائی مرادبخش کی لڑکی دوست دار بانو سے ہوگئی تھی (۳) جو خواجہ میر درد کے اجداد حواجہ محمد صالح اور خواجہ محمد یعقوب کی سالی تھی - اورنگ زیب کی دو لڑکیوں میں سے ایک لڑکی جس کا نام مہرالنساً تھا مرادبخش کے بیٹے شہزادہ ایزد بخش کے گھر تھی اور دوسری لڑکی جس کا نام زیب‌النسأ اور تخلص مخفی تھا داراشکوہ کے بیٹے شہزادہ سپہر شکوہ سے بیاہی ہوئی تھی - دارا شکوہ کی ایک لڑکی جہان زیب بانو

---

۱ - رسالہ ہوش افزا ص ۹۶ ب

2. History of Aurangzeb by J. N. Sarkar Vol. IV p. 61

3. History of Aurangzeb by J. N. Sarkar Vol. IV p. 61

4. Studies in Mughal India by J. N. Sarkar.

عالم گیر کے تیسرے بیٹے محمد اعظم کی بیوی تھی - اور اس کے سب سے چھوٹے بیٹے شہزادہ محمد اکبر کی شادی دارا شکوہ کی پوتی اور سلیمان شکوہ کی بیٹی سلیمہ بانو سے ہوئی تھی-

ان پیچ در پیچ رشتوں کی بنا پر خواجہ میر درد کے اجداد شہنشاہ اورنگ زیب کے خاندان سے مربوط اور متعدد رشتوں میں بندھے ہوئے تھے- لیکن خواجہ میر درد اور ان کے والد بزرگوار کو اپنی شہزادگی اور امیر زادگی اتنا فخر نظر نہیں آتا جتنا اپنی نجابت اور سیادت پر - چنانچہ خواجہ ناصر عندلیب کو خطاب کرتے ہوئے ایک بزرگ نے اس لئے کہا تھا کہ ۱

"اگرچہ الی الحال این همه بیان احوال آن گذشتگان (یعنی پادشاه پادشاهزادگان) خود را ننگ خویش می دانیدند آن که فخر خو نگارید - برائے آن که بموجب آن خبر که کل شیٔ یرجع الی اصله جانب مقرر اصلی خود رجوع نمود دولت فقر محمدی را که ارث جد شما است حاصل گردہ آید والحق که شما از طرف مادر و پدر صحیح النسب بنی فاطمه و سید حسنی هستید که سادات و نجابت از آفتاب و ماهتاب منور تر است که از جانب پدر از نبیرہ‌هائے مد العرفا خواجه خواجه‌ها حضرت خواجه بہاءالحق و الدین المعروف نقشبند هستید و از طرف والده از نبیرهائے محبوب سبحانی سید عبدالق جیلانی می شوند و بنده چنانچه از امور نسب شما به تفصیل آگهی دارم . کاروبار مسب گذران ایشان را هم واقف هستم که بارها به جناب پیر بزرگوار شما حضرت شیخ محمد زبیر نقشبندی مشرف گردیده میان حلقه هائے مراقبه ایشان ننشسته ام"

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ خواجہ ناصر عندلیب کو اپنے آباؤ اجداد ا سلسلہ نسب پر ان معنوں میں فخر نہیں کہ وہ امیرزادوں اور شاہزادوں کے زمرے میں شامل تھے بلکہ ان کو اس بات پر ناز ہے کہ وہ نجیب‌الطرفین ا

---

۱ - رسالہ ہوش افزا از خواجہ ناصر عندلیب - ص ۹۳ ب و ۹۷ الف

صحیح النسب حسینی سید اور سادات بنی فاطمہ میں سے ہیں اور ان کے سلسلہ ہائے پدری و مادری علی الترتیب خواجہ بہاالدین نقشبند اور حضرت غوث الاعظم جیسے بزرگوں تک پہنچتے ہیں - یہ حقیقت میں ایک بہت بڑی اور لا زوال دولت ہے جس پر کوئی خاندان جتنا فخر کرے بجا ہے چنانچہ خواجہ میر درد اسی لئے اپنی تصنیف علم الکتاب میں اپنی سیادت و نجابت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ (۱)

"آباؤ اجداد پدری و مادری الی انفسنا و ذریاتنا و نسائنا و ہمہ اطراف ایشان و اطراف اطراف ایشان سادات صحیح النسب و ذوات رفیع الحسب بودہ اند و ہستند"

اور پھر وہ اپنی اس صحیح النسبی اور رفیع الحسبی کی اہمیت اس لحاظ سے بھی بتاتے ہیں کہ ان کے آباؤ اجداد پدری و مادری کے اوصاف ظاہری و باطنی منتہائے کمال تک پہنچے ہوئے تھے وہ ایک جگہ اپنے نانا میر سید محمد قادری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ (۲)

"جناب ایشان عجب جاہ و جلال مرتبہ فقر و استغنا داشتہ اند و مرتبہ بزرگی و کمال دادہ اند - سیادت و امارت و شرافت و شجاعت و غیرت و ہمت و جرأت و فتوت ایں خاندان و آبا و اجداد مادری و پدری ایشان ثابت بالاتفاق است و شہرہ آفاق - غرض کہ اوصاف ظاہری و باطنی بزرگان خود تا کجا نگارد کہ بہ فضل الہی حدے و نہایتے نہ دارد و ہم منجر بہ خودستائی نہ گردد و احتمال افتخار نہ شود"

فقر و سیادت کا یہ سرمایہ جو خواجہ میر درد کو پدری و مادری دونوں سلسلوں سے ورثے میں ملا تھا انہیں سلاطین دنیوی کے خزانوں سے عزیز تھا

---

۱ - علم الکتاب از خواجہ میر درد - ص ۸۴

۲ - علم الکتاب از خواجہ میر درد - ص ۸۴

اور وہ الفقر فخری کے تاج کے سامنے افسر شاہانہ کو ہیچ سمجھتے تھے وہ اپنی اس متاع عزیز پر بار بار فخر کرتے نظر آتے ہیں اور ہر جگہ اپنی خاندانی اہمیت اور فضیلت، شاہی تعلقات کی بنا پر نہیں بلکہ فقر و سیادت کی وجہ سے جتاتے ہیں مثلاً رسالہ درد دل میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ (۱)

"سادا ے کہ ایشاں را وراثت از فقر محمدی رسیدہ و افسر الفقر فخری زیب سر استغنائے قلبی گردیدہ و باب مدینہ علم و معرفت بروئے باطن کشادہ و توسل تام بہ حق و انقطاع کلی از خلق دست دادہ سلاطین ملک فراغت اند و مسند نشین عزت و عزت گروہ ذلّ من طمع ناچار پیش این جماعت عز من قنع سر فرو می آرند و بے اختیار ارباب توکل و استقامت را عزیز می دارند و اعیا بر آستان چنیں فقرا سر نیاز می سایند و استدعائے مدد و تائید می نمائند و ایں بے پروایان اصلا بر تخت و تاج نگاہ نمی اندازند و وجود ما سوی اللہ را بہ آتش عشق الہی می سوزند و ہماں دود سوختہ دلہا خود مانند شمع چتر شاہی ایں روشن ضمیران است و دیدہ گریاں ابرو بخشش ایں گداختہ دلاں واللہ معہم حیثما کانوا و ہو العزیز الحکیم"

سہ دو ما غذائے فقر گرفتہ چناں مزاج — اس جا بعید نیست کہ شاہاں دہند باج
کے بنگرند بے سرو پاداں بہ تخت و تاج — روشن دلاں بغیر ندارند احتیاج
بر سر جوں شمع بال ہما گشتہ دود ما

---

۱ - رسالہ درد دل خواجہ میر درد - ص ۲۲۳ - درد نمبر ۲۳۵

فہارس

اورینٹل کالج میگزین

★

از

۱۹۳۲ - ۱۹۵۷ء

فہرست مندرجات

توضیح

اورینٹنل کالج میگزین فروری ۱۹۲۵ء میں جاری ہوا تھا۔ مئی ۱۹۲۵ء میں اس کی جلد اول ختم کر دی گئی۔ اسکی دوسری جلد نومبر ۱۹۲۵ء سے شروع ہوئی۔ اور اگست ۱۹۲۶ء میں ختم ہوئی۔ اس رسالہ کا نمبر مسلسل ۶ تھا۔ کیونکہ اس کے بعد فی جلد ۴ نمبر شائع ہوتے رہے۔ اسلئے مسلسل نمبر ۷ سے تیسری جلد شروع ہوئی۔ اور اس نمبر سے نمبر مسلسل باقاعدہ اس رسالہ پر درج ہونے لگا۔ اور اب تک جاری ہے۔

اس سے قبل اس میگزین کے مضامین وغیرہ کا ایک اشاریہ میگزین کے شمارہ مئی ۱۹۴۲ء (جلد ۱۸ ۔ عدد ۳ ۔ عدد مسلسل ۹۴) میں شائع ہو چکا ہے۔ اب نیا اشاریہ فروری سنہ ۱۹۴۲ء سے لیکر نومبر سنہ ۱۹۵۷ء تک کے پرچوں سے متعلق ہے۔ اس اشاریے کی ۲ فہرستیں ہیں :-

۱ ۔ فہرست مضمون نگاراں

۲ ۔ فہرست مضامین

جلد اور صفحے کا حوالہ اس طرح دیا گیا ہے۔ ۱۵/۳۳/۴ (۴ سے مراد نمبر ، ۳۳ سے مراد جلد اور ۱۵ سے مراد صفحہ ہے) و علیٰ ہذا القیاس۔

ایڈیٹر

فہرست مضمون نگاراں

بلدیو سنگھ گیانی

جنگ نامہ یا سکھوں اورانگریزوں کی لڑائی کے حالات

مئی ۱۹۴۲ء ۱/۱۸/۳
اگست ۱۹۴۲ء ۴/۱۸/۴
نومبر ۱۹۴۲ء ۶/۱۹/۱

بنارسی داس

عبدالرحمن کا سندیش راسک

فروری ۱۹۴۷ء ۸۶/۲۳/۲

تاج محمد خان

دیوان خواجو کرمانوی

نومبر ۱۹۴۴ء ۱۲۹/۲۱/۱
فروری ۱۹۴۵ء ۱۴ /۲۱/۲
اگست ۱۹۴۵ء ۱۶۱/۲ /۴
فروری ۱۹۴۶ء ۱۰۷/۲۲/۲
مئی ۱۹۴۶ء ۲۰۹/۲۲/۳
اگست ۱۹۴۶ء ۲۲۵/۲۲/۴
نومبر ۱۹۴۶ء ۲۵۷/۲۳/۱
فروری ۱۹۴۷ء ۲۸۹/۲۳/۲
مئی ۱۹۴۷ء
حصہ اول ۳۰۷/۲۳/۳
حصہ دوم ۱/۲۳/۳
اگست ۱۹۴۷ء ۵/۲۳/۴
نومبر ۱۹۴۷ء ۳۷/۲۴/۱

جگن ناتھ اگروال

ڈاکٹر لکشمن سروپ

فروری ۱۹۵۶ء ۱۱/۳۲/۲

خادم محی الدین

برادر مرحوم کی یاد میں

نومبر ۱۹۵۱ء ۷۹/۲۸/۱

خان اے رحمان (ڈاکٹر)

خطبہ صدارت

مئی ۱۹۵۶ء ۱/۳۲/۳

خلیل الرحمن داؤدی

گلدستہ نازنیناں

نومبر ۱۹۵۵ء ۵۷/۳۲/۱

ڈوی - کے - پروفیسر

جاپانی شاعری

فروری ۱۹۵۶ء ۴۷/۳۲/۲

رحمن - ایس - اے - (ڈاکٹر)

تقریر یوم کالج

نومبر ۱۹۵۴ء ۴/۳۱/۱

رضی الدین صدیقی (ڈاکٹر)

خطبہ صدارت یوم کالج

فروری ۱۹۵۶ء ۲۵/۲۲/۲

ریاض الدین احمد

اقبال مرحوم

نومبر ۱۹۵۱ء ۷۳/۲۸/۱

سخاوت مرزا

نصاب الاحتساب عربی کا کاتب غواصی گولکنڈوی

نومبر ۱۹۵۶ء ۷۳/۳۳/۱

شجاع الدین خلیفہ (ڈاکٹر)

خطبہ صدارت

مئی ۱۹۵۵ء ۱/۳۱/۳

شمس اللہ قادری حکیم

خلاصتہ التواریخ کا مصنف

مئی ۱۹۴۳ء ۴۳/۱۹/۳

صادق علی دلاوری

غنیمت کنجاہی

مئی ۱۹۴۲ء ۱۳/۱۸/۳

غنیمت کا وطن

نومبر ۱۹۴۳ء ۲۶/۲۰/۱

ظفر حسن (خان بہادر)

سلاطین دھلی کے سکے

نومبر ۱۹۵۰ء ۱/۲۷/۱
مئی ۱۹۵۱ء ۱۳/۲۷/۳
فروری ۱۹۵۲ء ۶۲/۲۸/۲

عابد علی عابد، (سید)

شروان اور ملحقہ علاقے

نومبر ۱۹۵۲ء و فروری ۱۹۵۳ء
۱۳/۲۹/۲ و ۱

عبادت بریلوی (ڈاکٹر)

جدید اردو غزل

مئی و اگست ۱۹۷۳ء ۳و۴/۲۹/۳۵

عباس شوستری

تصوف در ایران

فروری ۱۹۴۶ء ۳/۲۲/۲

امثال در قرآن مجید

مئی ۱۹۴۷ء ۳/۲۲/۳

افسانہ نفس و ایزد کام

اگست ۱۹۴۹ء ۲۵/۲۵/۴

قیصر جولیانوس

فروری ۱۹۵۰ء ۳۰/۲۶/۲

مزدک و کیش او

مئی ۱۹۵۰ء ۱۷/۲۶/۳

افکار نو افلاطونی

اگست ۱۹۵۰ء ۲۰/۲۶/۴

عبداللہ چغتائی (ڈاکٹر)

مثنوی نیرنگ عشق کا ایک مخطوطہ

اگست ۱۹۴۳ء ۵۴/۱۹/۴

شہاب عبدالکریم قوام ناگوری

مئی ۱۹۵۱ء ۱/۲۷/۳

پروفیسر شیرانی مرحوم اور ان کے خطوط

نومبر ۱۹۵۴ء ۶۱/۳۱/۱

بادشاھی مسجد

فروری ۱۹۵۵ء ۳۵/۳۱/۲

عبدالحق، (ڈاکٹر مولوی)

محمد اقبال

نومبر ۱۹۵۱ء ۱۳/۲۸/۱

عبدالحمید خان دستی (سردار)

افتتاحی خطبہ یوم کالج

فروری ۱۹۵۷ء ۱/۳۳/۲

عبدالحی حبیبی قندھاری

ملتان کا لودھی شاھی خاندان

مئی ۱۹۴۸ء ۴۵/۲۴/۳
فروری ۱۹۴۹ء ۶۵/۲۵/۲
مئی ۱۹۴۹ء ۴/۲۵/۳

عبدالرؤف (خان بہادر)

اقبال مرحوم

نومبر ۱۹۵۱ء ۶۳/۲۸/۱

عبدالصمد صارم

آلہال اودل

مئی ۱۹۵۷ء ۱۹/۳۳/۳

عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لا

مرحوم پروفیسر شیرانی کی یاد میں

فروری ۱۹۴۷ء ۹/۲۳/۲

عبدالقادر بالقابہ، سر شیخ

مغرب کا اثر ادب اردو پر

غلام یسین خان نیازی (ڈاکٹر)

مثنوی اسپ نامہ

مئی ۱۹۴۷ء ۱۶/۲۳/۳

غنی (اے۔ ار) و ابواللیث صدیقی (ڈاکٹر)

گائیڈ۔ ٹو۔ انگلش اردو ڈکشنری

نومبر ۱۹۵۳ء و فروری ۱۹۵۴ء
۱ و ۲۷/۳۰/۲

فضل حسین تبسم

مثنوی سوهنی مہیوال از صالح

اگست ۱۹۴۶ء ۳/۲۲/۴

مثنوی سوهنی مہیوال فارسی

نومبر ۱۹۴۶ء ۳/۲۳/۱

فضل الرحمن

کتاب الفہرست کے ملحقات

فروری ۱۹۴۴ء ۵۷/۲۰/۲

فضل محمود اثیری (ڈاکٹر)

جاپان ایز نون ٹو عربز

مئی ۱۹۵۵ء ۱/۳۱/۳

شاہ ولی‌اللہ دهلوی

نومبر ۱۹۵۶ء ۱/۳۳/۱
مئی ۱۹۵۷ء ۱/۳۳/۳

فیوض الرحمان (مولوی)

ابو محمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ

اگست ۱۹۵۲ء ۱/۲۸/۴

کلب علیخان فائق رامپوری

دلی کا دبستان شاعری پر ایک ریویو

اگست ۱۹۵۷ء ۵۵/۳۳/۴

اردو کے طرحی رسالے

نومبر ۱۹۵۷ء ۵۲/۳۴/۱

مجتبی هاشم نوگانوی

مسر اور گردیزی

مئی ۱۹۴۴ء ۳۱/۲۰/۳
اگست ۱۹۴۴ء ۳/۲۰/۴

محمد ابراهیم ڈار

"هندوستان میں مغلوں سے قبل فارسی ادب"

اگست ۱۹۴۸ء ۱/۲۴/۴
نومبر ۱۹۴۸ء ۳۷/۲۵/۱
فروری ۱۹۴۹ء ۳۹/۲۵/۲
مئی ۱۹۴۹ء ۲۷/۲۵/۳
اگست ۱۹۴۹ء ۳/۲۵/۴
نومبر ۱۹۴۹ء ۳/۲۶/۱

تیسری صدی هجری کا مشہور نحوی اور ادیب

فروری ۱۹۵۱ء ۱/۲۷/۲

محمد اقبال (ڈاکٹر)

فرهنگستان ایران

مئی ۱۹۴۲ء ۳/۱۸/۳

خان بہادر مولوی محمد شفیع

نومبر ۱۹۴۲ء ۳/۱۹/۱

شیرانی نمبر (تبصرہ)

فروری ۱۹۴۷ء ۳/۲۳/۲

فرخی پر مزید روشنی

فروری ۱۹۴۷ء ۶۶/۲۳/۲

"کتاب خرم نامہ میں قدیم شعراء کے اشعار"

اقبال مرحوم کے غیر مطبوعہ انگریزی خطبے کا ترجمہ
اگست ۱۹۴۷ء ۱/۲۳/۴

علی بن الجہم
نومبر ۱۹۴۷ء ۱/۲۴/۱
فروری ۱۹۴۸ء ۵۳/۲۴/۲
اگست ۱۹۴۸ء ۷۹/۲۴/۴

علی بن الجہم کے اشعار کا اردو ترجمہ
نومبر ۱۹۴۸ء ۱۱۹/۲۵/۱

ابا جان مرحوم (پروفیسر اقبال)
نومبر ۱۹۵۱ء ۳۲/۲۸/۱

محمد شجاع الدین

ملک قطب الدین ایبک
نومبر ۱۹۴۵ء ۳/۲۲/۱

عبدالرحیم خان خانان کا کتب خانہ
مئی ۱۹۴۶ء ۱/۲۲/۳

استاد مرحوم
نومبر ۱۹۵۱ء ۸۴/۲۸/۱

محمد شفیع (ڈاکٹر مولوی)

مطلع سعدین جلد ۲ جزء ۲ و ۳
فروری ۱۹۴۲ء ۶۲۱/۱۸/۲
مئی ۱۹۴۲ء ۶۷۵/۱۸/۳
اگست ۱۹۴۲ء ۷۲۳/۱۸/۴
نومبر ۱۹۴۲ء ۸۱۱/۱۹/۱
فروری ۱۹۴۳ء ۸۵۱/۱۹/۲
مئی ۱۹۴۳ء ۵۷/۱۹/۳
اگست ۱۹۴۳ء ۱۱۳/۱۹/۴
مئی ۱۹۴۴ء ۲۱۸/۲۰/۳
فروری ۱۹۴۵ء ۲۴۹/۲۱/۲
اگست ۱۹۴۵ء ۲۸۱/۲۱/۴
نومبر ۱۹۴۵ء ۳۱۳/۲۲/۱

خطاطی کے دو نادر نمونے
نومبر ۱۹۴۳ء ۵۵/۲۰/۱

لاہور قدیم
نومبر ۱۹۴۳ء ۶۴/۲۰/۱
فروری ۱۹۴۴ء ۹۸/۲۰/۲

حاجی میر حسین الحسینی المشہور بہ میر کلنگی کاتب بخاری
اگست ۱۹۴۵ء ۳/۲۱/۴

الخلیل بن احمدالعروضی
فروری ۱۹۴۶ء ۲۸/۲۲/۲
مئی ۱۹۴۶ء ۵۳/۲۲/۳

مرحوم حافظ محمود خان شیرانی
فروری ۱۹۴۷ء ۱۷/۲۳/۲

فصلے از خلاصۃ الاخبار
نومبر ۱۹۴۷ء ۱۸/۲۴/۱

شیخ سعدی اور خواجہ ہمام تبریزی اور امیر خسرو کی ہم قافیہ اور ہموزن غزلیں از تحفۃ الحبیب فخری
نومبر ۱۹۴۹ء ۴۷/۲۶/۱

اقتباس از وقائع بدائع آنند رام مخلص
نومبر ۱۹۴۹ء ۱/۲۶/۱
فروری ۱۹۵۰ء ۳۳/۲۶/۲
اگست ۱۹۵۰ء ۵۰/۲۶/۴
نومبر ۱۹۵۰ء ۸۴/۲۷/۱

رسالہ آداب العشق از بابا شاہ اصفہانی
مئی ۱۹۵۰ء ۵۲/۲۶/۳

الطرماح بن حکیم
اگست ۱۹۵۰ء ۳۹/۲۶/۴

خطبہ صدارت یوم کالج
نومبر ۱۹۵۴ء ۳۲/۳۱/۱

مرقع دارا شکوہ
فروری ۱۹۵۵ء ۱/۳۱/۲

خواجہ عمید الدین نونکی
اگست ۱۹۵۶ء ۱۱۵/۳۳/۴

سید محمد عبداللہ (ڈاکٹر)

فارسی شاعری میں گل و گلزار کی حقیقت

فروری ۱۹۳۲ء ۲۰/۱۸/۲

نل دمن احمد اور اس کی زبان

اگست ۱۹۳۲ء ۳/۱۸/۴

ہندوستان کے چند انگریز محبان فارسی اور مصنفین

فروری ۱۹۴۳ء ۳۳/۱۹/۲

قدیم عربی تصانیف میں ہندوستانی الفاظ

مئی ۱۹۴۳ء ۳/۱۹/۳

ابوالقاسم البصری کی کتاب التنبیہات

اگست ۱۹۴۳ء ۳۳/۱۹/۴

اردو کی تعمیر میں خان آرزو کا حصہ

نومبر ۱۹۴۳ء ۳/۲۰/۱

اردو کا جرمن شاعر فراسو

مئی ۱۹۴۴ء ۳/۲۰/۳

پنجاب کا ایک اور ریختہ گو

اگست ۱۹۴۴ء ۱۹/۲۰/۴

کتاب خانہ شیرانی کے نوادر

فروری ۱۹۴۷ء ۳۵/۲۳/۲

ہمارے پرانے شاعروں کی علمی استعداد

اگست ۱۹۴۷ء ۳/۲۳/۴

تذکروں کی اہمیت تنقید کے نقطہ نظر سے

فروری ۱۹۴۸ء ۳/۲۴/۲

تذکروں میں تنقیدی عنصر

اگست ۱۹۴۸ء ۳/۲۴/۴
فروری ۱۹۴۹ء ۱۴/۲۵/۲

صنائع بدائع کی تقسیم جمالیاتی نقطۂ نظر سے

مئی ۱۹۴۹ء ۳۸/۲۵/۳

غرائب اللغات میر عبدالواسع ہانسوی

نومبر ۱۹۵۰ء ۱۴/۲۷/۱

محاکمات الشعراء میر محسن

فروری ۱۹۵۱ء ۶۶/۲۷/۲

سالانہ روئداد اورینٹل کالج

مئی ۱۹۵۱ء ۱/۲۷/۳
مئی ۱۹۵۵ء ۱/۳۱/۳
مئی ۱۹۵۶ء ۱/۳۲/۳
اگست ۱۹۵۷ء ۱/۳۳/۴

اقبال صاحب

نومبر ۱۹۵۱ء ۱۸/۲۸/۱

اردو مثنوی کا دکنی دور

نومبر ۱۹۵۲ء و فروری ۱۹۵۳ء
۱/۲۹/ ۱ و ۲

خطبہ استقبالیہ ۔ یوم کالج

نومبر ۱۹۵۴ء ۶/۳۱/۱
فروری ۱۹۵۶ء ۱/۳۲/۲
فروری ۱۹۵۷ء ۱/۳۳/۲

تذکرہ مردم دیدہ

فروری ۱۹۵۵ء ۱/۳۱/۲
اگست ۱۹۵۵ء ۳/۳۱/۴
نومبر ۱۹۵۵ء ۱۵/۳۲/۱
اگست ۱۹۵۶ء ۲۳/۳۲/۴

استاد بزرگ میری نظر میں

فروری ۱۹۵۶ء ۳۵/۳۲/۲

محمد فضل حق میاں

خطبہ صدارت

اگست ۱۹۵۷ء ۴۶/۳۳/۴

محمد یعقوب

مرد کم گو (= پروفیسر محمد اقبال)

نومبر ۱۹۵۱ء ۹۲/۲۸/۱

محمد یوسف چودھری

کتاب العمدہ کا مصنف ابن رشیق

نومبر ۱۹۵۳ء و فروری ۱۹۵۴ء
۱ و ۱/۳۰/۲

فہرس القوافی

مئی و اگست ۱۹۵۴ء ۳-۴/۱/۳۰
فروری ۱۹۵۷ء ۲۳/۳۳/۲

محمود شیرانی (پروفیسر حافظ)

تنقید بر آب حیات مولانا محمد حسین آزاد

فروری ۱۹۴۲ء ۳/۱۸/۲

پہلی صدی ہجری میں عرب عمال کے ایرانی مسکوکات

نومبر ۱۹۴۲ء ۱۰/۱۹/۱

محمد شاہ کے عہد میں پنجابی جفت فروشوں کے فساد پر بے نوا سنامی کا مخمس

اگست ۱۹۴۵ء ۶/۲۱/۴

محمود شیرانی کے خطوط اقبال کے نام

نومبر ۱۹۵۱ء ۱/۲۸/۱

مختار الدین احمد (ڈاکٹر)

فہرست مخطوطات عربی و فارسی

نومبر ۱۹۵۵ء ۲۵/۳۲/۱

مرتضیٰ حسین فاضل

غالب کی نادر کتابیں

فروری ۱۹۵۲ء ۵۳/۲۸/۲

مشتاق احمد بھٹی

سیف الدولہ محمود بن ابراہیم بن محمود غزنوی

نومبر ۱۹۴۴ء ۳/۲۱/۱

مقتدری آقای

فرہنگ مقتدری

فروری ۱۹۵۵ء ۱/۳۱/۲
اگست ۱۹۵۵ء ۳۰/۳۱/۴

میرک شاہ اندرابی (مولوی)

عمر ابن الفارض

فروری ۱۹۵۱ء ۱۸/۲۷/۲

نذیر احمد چوہدری

خطبہ صدارت یوم کالج

فروری ۱۹۵۷ء ۱۹/۳۳/۲

نذیر احمد (ڈاکٹر)

تذکرہ میخانہ

نومبر ۱۹۵۶ء ۱/۳۳/۱
مئی ۱۹۵۷ء ۳۹/۳۳/۳
اگست ۱۹۵۷ء ۸۳/۳۳/۴

نسیم ا - د

خواجہ میردرد کا فن شاعری

اگست ۱۹۵۵ء ۱/۳۱/۴
نومبر ۱۹۵۵ء ۷۵/۳۲/۱
نومبر ۱۹۵۷ء ۱/۳۴/۱

نورالحسن (حافظ)

جائزہ

نومبر ۱۹۵۴ء ۴۱/۳۱/۱

نورالحق (مولوی)

سورۂ بقرہ میں ربط آیات

نومبر ۱۹۴۹ء ۳۰/۲۶/۱

واجد علی شاہ اختر (سلطان)

تاریخ ممتاز

اگست ۱۹۵۱ء ۲۵/۲۷/۳

وحید قریشی (ڈاکٹر)

خسرو کا نظریہ اسلوب

نومبر ۱۹۵۰ء ۲۴/۲۸/۱

حالات حسن کے دو ماخذ

مئی ۱۹۵۷ء ۱/۳۳/۳

وزیرالحسن عابدی (سید)

ایرانی صوتیات

مئی و اگست ۱۹۵۴ء
۱/۳۰/۴ - ۳

وقار عظیم (سید)

داستان امیر حمزہ

اگست ۱۹۵۶ء ۳۹/۳۲/۳

(۲) فہرست مضامین

تذکروں کی اهمیت تنقید کے نقطۂ نظر سے

فروری ۱۹۴۸ء ۳/۲۳/۲

تذکروں میں تنقیدی عنصر

اگست ۱۹۴۸ء ۳/۲۴/۴
فروری ۱۹۴۹ء ۱۴/۲۵/۲

تذکرۂ بیدل

اگست ۱۹۵۲ء ۱۱/۲۸/۴

تذکرہ مردم دیدہ

فروری ۱۹۵۵ء ۱/۳۱/۲
اگست ۱۹۵۵ء ۳/۳۱/۴
نومبر ۱۹۵۰ء ۱۵/۳۲/۱
اگست ۱۹۵۶ء ۲۳/۳۲/۴

تذکرہ میخانہ

نومبر ۱۹۵۶ء ۱/۳۳/۱
مئی ۱۹۵۷ء ۳۹/۳۳/۳
اگست ۱۹۵۷ء ۸۳/۳۳/۴

تصوف در ایران

فروری ۱۹۴۶ء ۳/۲۲/۲

تلخیص مجمع الآداب فی معجم الالقاب لابن الفوطی (کتاب اللام والمیم)

فروری ۱۹۴۲ء ۲۹۷/۱۸/۲
مئی ۱۹۴۲ء ۳۲۹/۱۸/۳
اگست ۱۹۴۲ء ۳۳۷/۱۸/۴
نومبر ۱۹۴۲ء ۳۷۳/۱۹/۱
فروری ۱۹۴۳ء ۳۹۲/۱۹/۲
مئی ۱۹۴۳ء ۴۲۵/۱۹/۳
اگست ۱۹۴۳ء ۴۶۷/۱۹/۴
نومبر ۱۹۴۳ء ۴۹۷/۲۰/۱
فروری ۱۹۴۴ء ۵۲۹/۲۰/۲
مئی ۱۹۴۴ء ۵۶۱/۲۰/۳
مئی ۱۹۴۵ء ۵۹۳/۲۰/۳
اگست ۱۹۴۵ء ۶۲۷/۲۱/۴
نومبر ۱۹۴۵ء ۶۴۱/۲۲/
فروری ۱۹۴۶ء ۶۹۳/۲۰/۲
مئی ۱۹۴۶ء ۶۴۳/۲۲/۳
اگست ۱۹۴۶ء ۶۸۹/۲۲/۴
نومبر ۱۹۴۶ء ۷۲۱/۲۳/۱
فروری ۱۹۴۷ء ۷۵۳/۲۳/۲
مئی ۱۹۴۷ء ۷۸۵/۲۳/۳
اگست ۱۹۴۷ء ۸۱۷/۲۳/۴
نومبر ۱۹۴۷ء ۷۴۹/۲۴/۱

تنقید بر آب حیات مولانا محمد حسین آزاد

فروری ۱۹۴۲ء ۳/۱۸/۲

تیسری صدی هجری کا مشهور نحوی اور ادیب

فروری ۱۹۵۱ء ۱/۲۷/۲

جاپان ایز نون ٹو عربز

مئی ۱۹۵۵ء ۱/۳۱/۳

جاپانی شاعری

فروری ۱۹۵۶ء ۸۴/۳۲/۲

جائزہ

نومبر ۱۹۵۴ء ۳۱/۳۱/۱

جدید اردو غزل

مئی و اگست ۱۹۵۳ء
۳۵/۲۹/۴-۳

اگست ١٩٤٥ء ٢٨١/٢١/٤
نومبر ١٩٤٥ء ٣١٣/٢٢/١

مستشرقین اور فارسی کی تحصیل و تدریس
نومبر ١٩٥٤ء ٢١/٣١/١

مصحفی
اگست ١٩٤٩ء ٣٦/٧/٤
فروری ١٩٥٠ء ٣/٢٦/٢

مصحفی اور اس کا کلام
اگست ١٩٥٠ء ١/٢٦/٤

مطلع سعدین جلد ٢ جزء ٢
فروری ١٩٤٢ء ٦٢١/١٨/٢
مئی ١٩٤٢ء ٦٧٥/١٨/٣
اگست ١٩٤٢ء ٧٢٣/١٨/٤
نومبر ١٩٤٢ء ٨١١/١٩/١
فروری ١٩٤٣ء ٨٥١/١٩/٢
مئی ١٩٤٣ء ٥٧/١٩/٣
اگست ١٩٤٣ء ١١٣/١٩/٤
مئی ١٩٤٤ء ٢١٨/٢٠/٣
فروری ١٩٤٥ء ٢٤٩/٢١/٢
اگست ١٩٤٥ء ٢٨١/٢١/٤
نومبر ١٩٤٥ء ٣١٣/٢٢/١

مغرب کا اثر ادب اردو پر
فروری ١٩٤٣ء ٥٣/١٩/٢

مقبرہ زیب النساء
اگست ١٩٥٢ء ١/٢٨/٤

ملتان کا لودھی شاہی خاندان
مئی ١٩٤٨ء ٣٥/٢٤/٣
فروری ١٩٤٩ء ٦٥/٢٥/٢
مئی ١٩٤٩ء ٣/٢٥/٣
مئی ١٩٤٣ء ٦٢/١٩/٣

مولوی! ترغیبات نفسی کا ماہر
نومبر ١٩٥٥ء ١/٣٢/١
فروری ١٩٥٦ء ٥٥/٣٢/٢
اگست ١٩٥٧ء ١١٩/٣٣/٤

میر حسین الحسینی المشہور بہ میر کالنگی کاتب بخاری
اگست ١٩٤٥ء ٣/٢١/٤

میر گردیزی (مسلسل)
مئی ١٩٤٤ء ٣١/٢٠/٣
اگست ١٩٤٤ء ٣/٢٠/٤

نصاب الاحتساب عربی کا کاتب غواصی گولکنڈوی
نومبر ١٩٥٦ء ٧٣/٣٣/١

نظیر اکبر آبادی، ان کا عہد اور شاعری
نومبر ١٩٥٢ء و
فروری ١٩٥٣ء ٣٤/٢٩/٢-١
مئی و اگست ١٩٥٣ء
١٢٩/٢٩/٤-٣

نومبر ۱۹۵۳ء و
فروری ۱۹۵۴ء ۱-۲/۳۰/۵۱

نظیر کی غزلیں
مئی و اگست ۱۹۵۴ء
۳-۴/۳۰/۷۱

نل دمن احمد اور اس کی زبان
اگست ۱۹۴۲ء ۳/۱۸/۴

ہمارے پرانے شاعروں کی علمی استعداد
اگست ۱۹۴۷ء ۳/۲۲/۴
فروری ۱۹۴۲ء ۳۱/۱۸/۲

ہندوستان کا قدیم ترین عربی کتبہ
اگست ۱۹۴۲ء ۴۴/۱۸/۴

ہندوستان کے چند انگریز محبان فارسی اور مصنفین

فروری ۱۹۴۳ء ۳۳/۱۹/۲

ہندوستان میں علم حدیث
فروری ۱۹۴۹ء ۴۱/۲۷/۲
مئی ۱۹۴۹ء ۱۱/۲۷/۳
مئی ۱۹۵۰ء ۳/۲۶/۳

"ہندوستان میں مغلوں سے قبل فارسی ادب"
اگست ۱۹۴۸ء ۱/۲۴/۴
نومبر ۱۹۴۸ء ۳۷/۲۵/۱
فروری ۱۹۴۹ء ۴۹/۲۵/۲
مئی ۱۹۴۹ء ۲۷/۲۵/۳
اگست ۱۹۴۹ء ۳/۲۵/۴
نومبر ۱۹۴۹ء ۳/۲۶/۱

تبصرے

ART IN URDU POETRY

آرٹ ان اردو پوئٹری

اردو شاعری میں بلا کا حسن ہے ۔ غضب کی دل آویزی ہے ۔ وہ اپنی رنگینی اور رعنائی سے پہچانی جاتی ہے ۔ دلوں میں اترنا اور روح پر ایک سرخوشی بن کر چھا جانا ، اس کے صفات میں داخل ہے ۔ اس کی فضا بڑی ہی مہذب اور اس کا ماحول بہت ہی شائستہ ہے ۔ اس میں فکر کا جلال بھی ہے اور جذبے کا جمال بھی ۔ وہ جذبات کو اکساتی نہیں ، ان کی تہذیب کرتی ہے ۔ اسی لئے اس میں آسودگی بہم پہنچانے کا کمال نظر آتا ہے ۔ وہ ایک تہذیب کا آئینہ ہے ، ایک قوم کی ذہانت و فطانت کی تصویر ہے لیکن اس میں ایک انسانی آہنگ ہے ۔ اسی انسانی آہنگ کا یہ اثر ہے کہ ہر شخص اس میں اپنا عکس دیکھتا ہے ۔ ہر انسان کو اس میں اپنی تصویر نظر آتی ہے ۔ وہ زندگی سے بھرپور ہے ۔ اس میں زندگی کا سوز بھی ہے ، ساز بھی ۔ اس کی جگمگاہٹ بھی ہے ، تاریکی بھی ۔ اس کی تندی بھی ہے ، نرمی بھی ۔ اس کی سادگی بھی ہے ، پرکاری بھی ۔ غرض اس میں زندگی کا تنوع اور اس کی رنگا رنگی پوری طرح بے نقاب ہے ۔ اسی لئے وہ دامن دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے ۔ اور جو شخص اس کی ایک ہلکی سی جھلک بھی دیکھ لیتا ہے ، وہ اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے ۔

سر شہاب الدین رحمۃ اللہ نے اپنی کتاب ''آرٹ ان اردو پوئٹری'' اردو شاعری کی ایک جھلک دکھانے ہی کی غرض سے لکھی ہے ۔ اس کا مقصد اردو شاعری کی اصل روح کو لوگوں تک پہنچانا ہے ۔ شہاب صاحب نے خود اپنے دیباچے میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ وہ اردو شاعری کے حسن سے حد درجہ متاثر ہوئے ہیں ، اور انہوں نے اسی شدید تاثر کے تحت اس بات کی کوشش کی ہے کہ اردو شاعری میں حسن کے جو مختلف پہلو ہیں ، یا مختلف پہلوؤں کا جو حسن ہے ، اس کی حقیقت نہ صرف اردو کے عالموں اور طالب علموں تک پہنچائی جائے بلکہ اس کے عام بولنے اور پڑھنے والوں ، اور اس زبان کے نہ جاننے والوں تک کو اس سے واقفیت کا موقعہ بہم پہنچایا جائے ۔ اور وہ اپنی

اس کوشش میں خاصی حد تک کامیاب ہوئے ہیں - ہوں اس میں اردو کے عالموں اور طالب علموں کے لئے تو، خیر دلچسپی کا سامان ایسا کچھ زیادہ نہیں ہے - کیونکہ یہ کتاب کسی گہرائی کے ساتھ نہیں لکھی گئی ہے - اردو شاعری کے مختلف پہلوؤں سے متعلق تفصیل و جزئیات بھی اس میں نہیں ہے - تحقیق اور چھان بین کا بھی اس میں پتہ نہیں چلتا - کوئی اہم تنقیدی باب بھی اس میں نظر نہیں آتی - البتہ اردو کے عام پڑھنے اور بولنے والوں کے لئے یہ کتاب یقیناً دلچسپ ہوسکتی ہے - خصوصاً انگریزی داں طبقے کے وہ لوگ اس سے بہت کچھ حاصل کرسکتے ہیں جو اردو شعر و ادب کو درخوراعتنا نہیں سمجھتے اور جن کے نزدیک مغربی شاعری ہی سب کچھ ہے - ان لوگوں کو بھی اس کتاب میں اپنی دلچسپی کا سامان مل سکتا ہے جن کی مادری زبان اردو نہیں لیکن جو اردو شاعری کو پڑھنا اور اس سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں - اصل میں یہ کتاب اردو کے عالموں اور طالب علموں کے لئے نہیں لکھی گئی - یہ تو صرف انگریزی داں طبقے کے لئے لکھی گئی ہے - اسی لئے مصنف نے اس کو انگریزی میں لکھا ہے - اور اردو شاعری کے بارے میں ایسی عام اور سرسری باتیں کہی ہیں جن کو سب ہی جانتے ہیں -

یہ کتاب کئی ابواب میں تقسیم کی گئی ہے - پہلا باب تمہیدی ہے - اس میں اردو زبان کی پیدائش، اس کی ابتدائی تاریخ اور دکن میں اس کی ترقی پر حد درجہ اختصار اور اجمال کے ساتھ چند خیالات کا اظہار کیا گیا ہے - مولف نے اس سلسلے میں یہ بات واضح کی ہے کہ اردو برج بھاشا سے تعلق رکھتی ہے - جب مسلمان اس ملک میں آئے تو ان کے میل جول سے اس مقامی زبان نے اردو کی شکل اختیار کرلی - امیر خسرو، کبیر داس، گرو نانک وغیرہ کی تحریروں میں اردو کی جھلک نظر آجاتی ہے - مغلوں کے زمانے میں اس نے ترقی کی منزلیں طے کیں اور دیکھتے دیکھتے وہ ایک ایسی زبان بن گئی جس میں ادب کی تخلیق کا سلسلہ شروع ہوگیا - دکن نے اس سلسلے میں پیش قدمی کی، اور بہت سے اعلیٰ درجے کے شاعر پیدا کئے - اس سلسلے میں دوسرے باب میں ان اصناف سخن پر اظہار خیال ہے، جن میں اردو کے شاعروں نے اپنے خیالات پیش کئے ہیں - غزل، قصیدہ، مثنوی اور مسدس وغیرہ کی خصوصیات کو بیان کیا ہے - اور موضوع

اور صورت ، مواد اور ہیئت دونوں کے بارے میں بعض بنیادی باتیں کہی ھیں۔ تیسرا باب اردو شاعری کے مختلف دبستانوں کے بارے میں ھے، اور جو فن کار ان دبستانوں کے علم بردار رھے ھیں ، ان کا تذکرہ ھے۔ سب سے پہلے مولف نے دکن اسکول پر روشنی ڈالی ھے ، اور اس کا سب سے بڑا علم بردار ولی کو قرار دیا ھے ۔ اس کے بعد دبستان دھلی کے پہلے دور کی خصوصیات کو بیان کیا ھے اور اس سلسلے میں میر تقی میر ، سودا ، میر درد اور میر حسن کے خصوصیات کلام کی وضاحت کی ھے۔ پھر لکھنؤ کے پہلے دور کا بیان ھے۔ اس دور کے علم بردار مولف کے خیال میں انشا اور مصحفی ھیں۔ اسی سے ملا ھوا لکھنؤ کے دوسرے دور کا بیان ھے ۔ اس دور کے نمایاں فن کار ناسخ، آتش، نسیم، انیس اور دبیر قرار دئے گئے ھیں۔ اس کے بعد مولف نے دلی کے دوسرے دور پر اظہار خیال کیا ھے اور مومن، ذوق اور غالب کے کلام پر روشنی ڈالی ھے۔ دبستان رامپور کا بھی اسی باب میں تذکرہ ھے ، اور امیر مینائی اور داغ اس دور کے نمایاں فن کار بتائے گئے ھیں۔ اس باب کا آخری حصہ نئے دور سے متعلق ھے ، جس کے تحت آزاد ، حالی ، چکبست ، اسمعیل، اکبر ، شاد عظیم آبادی ، فانی اور حسرت کا تذکرہ کیا گیا ھے۔ چوتھے باب میں اقبال کی شاعری کا مطالعہ ھے۔ پانچواں باب اختتامیہ کے طور پر لکھا گیا ھے۔ اس باب میں اردو شاعری پر انگریزی ادب کے اثرات ، مشاعرے ، اردو شاعری میں فن کاروں کے موضوعات ، اردو شاعری کی تنقید اور بلبل و شاھین وغیرہ پر بحث ھے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ھوتی ھے کہ اس کتاب میں تاریخ ادب کا ایک خاکہ بھی پیش کیا گیا ھے ، مختلف ادوار میں شاعری کے جو علم بردار رھے ھیں ، ان کا تذکرہ بھی لکھا گیا ھے ۔ ان کے کلام کی خصوصیات کی وضاحت بھی کی گئی ھے۔ منتخب اشعار بھی پیش کئے ھیں اور ان پر تنقیدی رائے بھی دی گئی ھے۔

جہاں تک تاریخ اور تذکرہ کا تعلق ھے ، مولف نے اس کو کتاب میں کوئی خاص اھمیت نہیں دی ھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ھے کہ مولف کا یہ موضوع نہیں تھا۔ اسی لئے اس کے تحت جو خیالات پیش کئے گئے ھیں، ان میں تشنگی کی

حد تک اجمال اور اختصار ہے۔ بڑے بڑے شاعروں کے حالات ذرا تفصیل سے لکھے جاتے تو مناسب ہوتا تاکہ ان کی شخصیت کے خط و خال نمایاں ہوتے۔ اور اس کی روشنی میں پڑھنے والے کو ان کے کلام کے سمجھنے کا موقع ملتا۔ لیکن مولف نے اس کو اپنے موضوع سے خارج سمجھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعروں کے بارے میں تفصیل اس کتاب میں ذرا بھی نہیں۔ صرف اشارے مل جاتے ہیں۔ ظاہر ہے ان اشاروں سے شخصیت کا پورا نقشہ سامنے نہیں آسکتا۔ بس ایک جھلک دیکھی جا سکی ہے۔ لیکن اس سے مقصد حل نہیں ہوتا۔ جی یہی چاہتا ہے کہ تفصیل اس سے کچھ زیادہ ہوتی۔

تنقیدی خیالات کا اظہار ایسی کتاب میں خوبی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن چونکہ اس کتاب کا میدان تنقید سے زیادہ تعارف ہے، اس لئے تنقیدی پہلو اس میں نمایاں نہیں ہوسکا ہے۔ ویسے مختلف شعراء کے فکر و فن کے بارے میں مولف نے اظہار خیال ضرور کیا ہے اور اس سلسلے میں بڑی پتے کی باتیں کہی ہیں۔ ان باتوں میں کوئی چونکا دینے والا انداز نہیں ہے۔ جدت اور آپچ بھی ان میں نہیں ملتی۔ ان میں عام خیالات کا اظہار ہے۔ ایسے خیالات جن کو سب جانتے ہیں۔ البتہ جو رائیں پیش کی گئی ہیں وہ جچی تلی ہیں۔ ان میں توازن ہے۔ ایک سنبھلا ہوا انداز ہے۔ افراط و تفریط کا ان میں کہیں بھی پتہ نہیں چلتا۔ بات یہ ہے کہ مولف اردو شعر و ادب کا پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس کا مطالعہ بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ اس کے نشیب و فراز سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ اس کے ارتقائی عمل کو وہ خوب سمجھتے ہیں۔ اس کی رفتار کا انہیں اچھی طرح اندازہ ہے۔ انہیں قدرت نے ایک ذوق سلیم دیا ہے۔ ظاہر ہے ایک ایسے شخص کی رائیں غلط نہیں ہوسکتیں۔ اس کتاب میں پیش کی ہوئی رائیں بھی غلط نہیں ہیں۔ البتہ ان میں گہرائی کی تلاش بے سود ہے۔

اس کتاب میں مختلف اردو شعراء کا انتخاب کلام بنیادی حثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کو ایک نظر دیکھنے ہی سے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب انتخاب کلام کو پیش کرنے ہی کی غرض سے ترتیب دی گئی ہے۔ اس انتخاب سے مولف کے ذوق سلیم کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن عام طور پر وہی اشعا انتخاب کئے گئے ہیں جو بہت مشہور ہیں، اور جن سے اردو داں طبقہ بخوبی

واقف ہے ۔ شاید ایسا کرنے کی وجہ یہ ہوئی ہے کہ مولف نے انتخاب کرتے وقت شاعر کے کلام کی خصوصیات اور اُس کے عام انداز کو اپنے پیش نظر رکھا ہے ۔ جو اشعار انتخاب کئے گئے ہیں، ان کے علاوہ بھی ہر شاعر کے کلام سے اچھے شعر نکالے جا سکتے تھے ۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ جو اشعار انتخاب کئے گئے ہیں اُن کی تعداد بہت کم ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر مولف اس سے زیادہ تعداد میں اشعار انتخاب کرتے ۔

مولف نے اُردو اشعار کا ترجمہ بھی انگریزی میں دے دیا ہے ۔ ترجمے میں اصل کی سی بات تو خیر آ ہی نہیں سکتی ۔ نظم کا ترجمہ نظم میں ذرا ٹیڑھی کھیر ہے ۔ خصوصاً غزل کے اشعار کا ترجمہ تو انگریزی نظم میں ہو ہی نہیں سکتا۔ مولف نے ترجمے کو اصل کے مطابق بنانے میں خاصی محنت کی ہے ۔ لیکن کہیں کہیں اصل مفہوم ظاہر ہونے سے رہ گیا ہے ۔ ویسے مجموعی طور پر ترجمہ صاف اور سادہ ہے ۔ اُس میں کسی قسم کا الجھاؤ اور کسی طرح کی پیچیدگی نہیں ۔ برخلاف اس کے ترجمے میں خاصی روانی پائی جاتی ہے اور اس روانی ہی میں اُس کا حسن ہے ۔

اشعار کے ساتھ فاضل مولف نے اس کتاب میں چند تصویریں بھی شامل کی ہیں ، جنھوں نے اس کتاب کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے اور اُس کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے ۔ بعض تصویریں اچھی نہیں چھپی ہیں ۔ بہتر ہوتا اگر ان کی چھپائی کی طرف زیادہ توجہ کی جاتی ۔

کتاب کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے مولف شہاب الدین صاحب شاعر بھی ہیں ۔ انھوں نے جگہ جگہ اپنے اشعار اس کتاب میں درج کر دئے ہیں اور دیباچے میں یہ لکھا ہے کہ بعض دوستوں کی فرمائش پر وہ ایسا کرنے کے لئے مجبور ہوئے ہیں ۔ ان کے دوستوں کا یہ مشورہ صائب نہیں تھا ۔ دوستوں کی نادانی اور نادانوں کی دوستی بعض اوقات اچھی خاصی چیز کو مضحکہ خیز بنا دیتی ہے ۔ یہ اشعار اس کتاب میں اچھے نہیں لگتے ۔ کچھ ان مل، بے جوڑ سی بات معلوم ہوتی ہے ۔

اس کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب صدر انجمن ترقی اُردو نے لکھا ہے ۔ اور کتاب کی تعریف کی ہے ۔ اُن کے اس خیال سے شاید ہی کسی

کو اختلاف ہوکہ "اُردو شاعری پر انگریزی زبان میں یہ کتاب اپنی نوعیت کی ایک ہی ہے ۔ فاضل مولف ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ اُنہوں نے اُردو شاعری کو اُس طبقے تک پہنچایا ہے جو اب تک ہماری شاعری کی حقیقت اور اُس کے محاسن سے نا آشنا ہے ۔ جن اصحاب کو ہمارے شعرا کے کلام اور اُس کے تنقیدی مقالات تک دسترس نہیں یا جو برعظیم پاک و ہند کی مقبول ترین زبان اُردو سے ناواقف ہیں ، اُن کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بصیرت افروز ہوگا"۔

عبادت بریلوی

— — -

JOURNAL OF THE ASIATIC SOCIETY OF PAKISTAN
Volume 1, Number 1.

ایشیاٹک سوسائٹی آف پاکستان کا یہ پہلا درجہ علمی تحقیق کے میدان میں ایک خوش آیند اضافہ ہے ۔ اس میں مختلف موضوعات پر آٹھ تحقیقی مقالے درج ہیں ۔ اور اس کے ۱۳۹ صفحات ہیں ۔ یہ رسالہ ڈھاکہ سے شائع ہوا ہے جو مذکورہ سوسائٹی کا مرکز ہے ۔ رسالہ کے آخر میں سوسائٹی کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے اور اس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ یہ مقاصد مختلف علوم و فنون کے ماہرین اور اہل علم و فضل کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے اور تحقیق کے مختلف شعبوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے سے عبارت ہیں ۔ اس سلسلہ میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اگرچہ سوسائٹی کا مرکز مشرقی پاکستان ہے لیکن اس کا دائرہ عمل بہت وسیع ہے ۔ سوسائٹی نے اپنے ریسرچ جرنل کے علاوہ عربی ، فارسی ، سنسکرت ، پالی اور بنگالی کی ایسی اہم اور نادر کتابوں کی طباعت کا فیصلہ کیا ہے جو یا حال شائع نہیں ہوئیں یا اب دستیاب نہیں ۔ اس کے علاوہ ایسے تخلیقی اور تحقیقی کام کی اشاعت کا فیصلہ بھی کیا گیا ہے جو سوسائٹی کے زیر اہتمام سرانجام دیا گیا ہو ۔

رسالہ میں درج آٹھ تحقیقی مقالوں کی تفصیل حسب ذیل ہے :

(۱) امام ابن تیمیہ کی ایک نظم پر ڈاکٹر سراج الحق کا ایک مختصر مقالہ
اگرچہ امام ابن تیمیہ شاعر نہیں تھے لیکن ایک ذمی کے آٹھ سوالیہ اشعار

کے جواب میں آپ نے ارتجالاً یہ نظم کہی - یہ نظم قاھرہ میں ۱۹۰۶ء میں چھپ چکی ہے لیکن بقول مضمون نگار اس میں کئی ایک اغلاط ھیں اور جس مخطوطہ سے یہ نظم لی گئی ہے اس کا حوالہ نہیں دیا گیا - موجودہ نظم کی اشاعت میں مصری ایڈیشن کے علاوہ برٹش میوزیم کے ایک قدیم نسخہ اور جرمنی کی ٹوبنجن یونیورسٹی کے دو مخطوطات سے مدد لی گئی ہے ان تمام نسخوں کے باھمی اختلاف کی طرف باقاعدگی سے توجہ دلائی گئی ہے - نظم ایک سو تین اشعار پر مشتمل ہے آخر میں اس کا خلاصہ دیا گیا ہے -

(۲) البیرونی پر ڈاکٹر کالے کا مقالہ ، مشہور مستشرق ڈاکٹر کالے نے اپنے مقالہ میں البیرونی کی جامع صفات شخصیت کے بعض پہلوؤں سے مختصر بحث کی ہے - البیرونی کے مذھبی عقاید پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر موصوف نے بروکلمان کے نظریہ سے اتفاق کیا ہے کہ مشرق کے اس عظیم مفکر کے عقاید بہت پختہ تھے - پروفیسر کالے نے کتاب الہند کا ذکر کرتے ہوئے پاکستان ھسٹاریکل سوسائٹی کو مشورہ دیا ہے کہ وہ البیرونی کے اس عظیم الشان تاریخی شاھکار کے بارے میں مزید تحقیق کرے - اس مضمون میں ڈاکٹر کالے نے البیرونی کی استعداد کے ایک خاص پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے اور وہ یہ کہ فلسفہ و تاریخ و ریاضی کے علاوہ اس پیکر علم و ھنر کو جواھرات اور چینی ظروف کے بارے میں وسیع معلومات حاصل تھیں اور اسکے نو سو برس قدیم بیانات آج کی تحقیقات کی روشنی میں حیرت انگیز طور پر صحیح نظر آتے ھیں -

(۳) ڈاکٹر مفیض اللہ کبیر نے اپنے مبسوط مقالے میں خاندان بویہ کے عہد کی ثقافتی ترقی اور سرگرمیوں کا حال لکھا ہے - خلافت عباسی کے زوال کے بعد جب فارس پر علی ابن بویہ اور ری ، اصفہان اور جبال پر حسن ابن بویہ کا تسلط ہوا تو اول الذکر خاندان نے ادب نوازی اور ھنر پروری کی شاندار روایات قائم کیں - اس دور میں عربی ادب، تاریخ، ریاضیات، جبر و مقابلہ، ھیئت ، نجوم ، فلسفہ، موسیقی، طب غرضیکہ مختلف علوم و فنون کو بہت فروغ ہوا فاضل مصنف نے اپنے مقالہ کی تیاری میں بڑی محنت اور تحقیق سے کام لیا ہے اور اس خاندان کے مختلف حکمرانوں اور باذوق وزیروں کی سرپرستی اور تربیت کا فرداً فرداً ذکر کیا ہے -

(۴) ڈاکٹر اے ۔ حلیم کے مضمون کا عنوان "سد ۔ لودھی عہد میں شمالی ھندوستان مں موسیقی کی نشو و نما،، ھے ۔ موصوف نے اس مقالہ میں عربی اور ایرانی موسیقی کی آمیزش اور ھدوستانی موسیقی پر اسکے اثرات کا جائزہ لیا ھے مسلمان بادشاہوں کو موسیقی سے جو شغف رہا فاضل مقالہ نگار کے خیال میں اس کا نتیجہ مذکورہ اثرات کی صورت میں ظاھر ھوا علاؤالدین خلجی کے زمانے میں جنوبی ھندوستان کے متعدد ماھرین موسیقی نے شمالی ھندوستان کا رخ کیا اور مسلمان بادشاھوں اور امیروں کی سرپرستی اختیار کی ۔ اس دور میں ھندوستانی اور دوسری طرف عربی اور ایرانی موسیقی کا امتزاج ھوا ۔ ھندوؤں کے ھاں موسیقی کو مذھبی تقدس حاصل تھا اور مسلمانوں کے نزدیک اس کی حیثیت جمالیاتی تھی اس امتزاج نے ھندوستانی موسیقی مں مزید وسعت اور تاثر پیدا کی ۔ مغلیہ دور سے پہلے جن لوگوں نے اس موسیقی کے فروغ مں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں امیر خسرو ، حسین شاہ شرقی والی جونپور اور راجہ مان سنگھ والی گوالیار کا نام خاص طور سے قابل ذکر ھے ۔ مقالہ نگار نے ان کی انفرادی استعداد اور تخلیقی کاوشوں کا ذکر کیا ھے ۔ موصوف نے زیر بحث عہد میں موسیقی کی ترقی کے جو اسباب گنوائے ھیں اُن میں مقامی حکمرانوں کی طرف سے گویوں کی سر پرستی ، موسیقی سے صوفیا کی دلچسپی ، بالخصوص سلسلہ چشتیہ کے بزرگوں کا سماع سے شغف اور اس دور کے شاعروں اور بھگتوں کا موسیقی سے گہرا لگاؤ شامل ھیں ۔

(۵) ڈاکٹر ایس ۔ اے ۔ سبزواری نے اپنے مضمون " اردو کے ایک صوتیاتی رجحان ،، مں اردو زبان کے ایک صوتیاتی پہلو سے بحث کرتے ہوئے اس زبان کے سر چشمہ کا کھوج لگانے کی کوشش کی ھے ۔ مقالہ نگار نے پروفیسر محمود شیرانی مرحوم کے اس نظریہ کی تردید کی ھے کہ اردو کا ماخذ پنجابی ھے ۔ سسکرت کے بعض الفاظ میں ایسے دو صامت (Consonants) اکٹھے استعمال ھوتے ھیں جنکا تلفظ ادا کرنا مشکل ھے ۔ پنجابی نے یہ خصوصیت برقرار رکھی ھے اردو میں اس کے برعکس بقول مضمون نگار رجحان " تخفیف ،، اور "تسہیل،، کی طرف ھے اس کی مثالیں

پیس کرنے کے بعد موصوف کا کہنا ہے کہ پروفیسر محمود شیرانی نے پنجابی کو
اردو زبان کا سرچشمہ ثابت کرنے میں ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ اردو
میں بھی پنجابی کی طرح سنسکرت کا مذکورہ بالا رجحان موجود تھا لیکن برج
بھاشا کے زیر اثر آنے کے بعد اس میں تبدیلی واقع ہوئی مقالہ نگار کا کہنا ہے کہ
اگرچہ یہ کیفیت پنجابی میں اب بھی ہے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ
اردو کا ماخذ پنجابی زبان ہے ۔ مضمون میں اپنے نقطہ نظر کو درست
ثابت کرنے کے لئے اس رجحان کے آغاز اور ابتدائی تاریخ کا پتہ چلانے کی
کوشش کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں برج بھاشا ، پالی اور پراکرت
کے صوتیاتی رجحانات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے ۔

مذکورہ بالا مقالات کے علاوہ اس رسالہ میں لفظ گنگوتی کی تحقیق پر
ڈاکٹر اس ۔ اے ۔ کیو ۔ چستی ، ہندو مت میں قربانی کے مسئلہ پر پروفیسر پی ۔ آر ۔
بروا اور ہندوستانی سکوں پر ڈاکٹر احمد احسن دانی کے مقالات شامل ہیں
جن میں ان موضوعات پر بہت مفید اور اہم معلومات ملتی ہیں ۔ رسالہ میں
کچھ تبصرے بھی ہیں ۔ اور آخر میں سوسائٹی کے ممبروں کی فہرست بھی شامل
ہے جو پچاس افراد پر مشتمل ہے ان میں سے اڑتالس کا تعلق ڈھاکہ اور
راجشاھی سے ہے ۔ باقی دو حضرات کراچی اور پشاور سے متعلق ہیں ۔ رسالہ
پر ایڈیٹر کا نام نہیں اور نہ ایڈیٹوریل بورڈ کا ذکر ہے البتہ کونسل کے
افراد کے نام الگ دئے گئے ہیں ۔

بہ حیثیت مجموعی رسالہ کے مضامین کا معیار اچھا ہے ۔ اگر یہ رسالہ
مستقل اور باقاعدہ طور پر چھپتا رہے تو تحقیق کے میدان میں اس سے بہت مفید
اور اہم کام لیا جا سکتا ہے ۔ لیکن سوسائٹی کی تاریخ کا حال پڑھ کر حیرت
ہوتی ہے کہ اگرچہ اس کی بنیاد ۱۹۰۱ میں رکھی گئی لیکن اس کے ریسرچ
جرنل کا آغاز ۱۹۵۶ میں زیر بحث رسالہ سے ہوا ہے اور اگرچہ تاریخ کی ایک
کتاب کی طباعت کا اعلان بھی کیا گیا ہے لیکن پانچ سال کے طویل عرصہ
میں کوئی کتاب نہیں چھپ سکی ۔

شکور احسن

تذکرہ مردم دیدہ

[سلسلے کے لئے دیکھو اورینٹل کالج میگزین شمارہ اگست ۱۹۵۶ء]

برنگ آئنه در کار خویش حیرانم
که یار در نظر و انتظار من باقیست

نیم چو آئنه در وقت هجر فارغ بال
ز دیده رفتی و شکل تو در نظر باقیست

زده ام بر سر جهان پاپوش
بے سبب ایں برهنه پائی نیست
خوبرویاں مگر بشهر شما
رسم و آئین آشنائی نیست

کرا بدولت بیداد خود نواختهٔ
که دست و تیغ تو از خون تازه رنگیں است

دیوانه‌هاے چشم ترا طرفه طور ها ست
نرگس کلاه بر سر خود واژگون کد است
در هر دماغ شور جدائیست باده را
جمشید خود عجب خلف ذو فنون کد است

هزار شکر که کارم بخوبی آمد راست
ز دور یار مرا دیده سر و قد برخاست

مانیٔ نازك قلم نقشے ز چشم مست بست
چوں نظر افکند بر محراب ابرو دست بست

بر سرم فقر خدا داد سلامت باشد
ایں سوادیست که با یُمن‌تر از ظلّ هما ست

ز خار و سنبل این بوستان نمیدانم
بجیب و دامن من باغبان چه خواهد ریخت

سرفراز آنجهان باسد ذلیل این جهان
حرف ختم صفحه تاج صفحهٔ آئنده است

ناله کردم تا بگوش او رسد نشنید و رفت
گریه کردم تا بداد من رسد خندید و رفت

بیکسان را خود بخود نشو و نما رو میدهد
در بیابانها درختانرا که خدمت میکند

آهوان را سبزهٔ نو میدهد ذوق بهشت
اینقدر از خط، چرا چشم تو وحشت میکند

تا توانی خلق خوش را با عبادت جمع کن
سبحه صندل ز صندل بیش قیمت میشود

شکوه خال برونے حبیب باید دید
ستاره سوخته خوش نصیب باید دید

باد پرواز بگردد دل او پر نه زند
عندلیبے که بدام تو گرفتار افتاد

نکته پردازے که خواهد معنیئے انشا کند
چون نگه یار باید گوشهٔ پیدا کند

مداد نیست ز سامان علم جاهل را
مگس سیاهی حرف از کتاب بردارد

خبر رساند عزیزے غرور یار نماند
بگفتمش که درست است ؟ گفت خط آمد

مردم سر حلقه را حرص فزوں تر بود
مقرئی(۱) تسبیح را رشته مکرر بود

ربود مرغ دلم خال گوشهٔ ابرو
که دید زاغ کماں کار شاهباز کند؟

آه آں پر زده رو گرد سر من باز آمد
رنگ هوش من وا مانده به پرواز آمد

دل ستم زده اکنوں بداد خویش رسید
که شانه از سر گیسوے او به ریش رسید

عاشق صادق کے از کوے وفا هجرت کند
شانهٔ زلف تو آخر ریش را خدمت کند

اے پری آئنه دامے است که گیرا باشد
بر حذر باش که در حق تو مینا باشد

از هوا زلف تو بر گوشه ابرو افتاد
آخر قوس کماں شب (؟) بادا باشد

---

۱ - آنند راج : مقری٘ تسبیح و مقری سجعه بالضم مهره کلاکی که بر سر تسبیح باشد و آں را در عرف امام تسبیح گویند -

هست بلبل ز غلامان قدیم قدت
اے گل آزادہ مشو حق وفا را بشناس

چه واقع شد که اکنوں نقش پاے او نمی بینم
خوشا وقتے کہ تا بالین سر من بود زانویش

چشم عبرت باز کن بر جلوہ آر ایان باغ
غنچه چوں سنبل پریشاں، بید لرزاں، لاله داغ

سخت حیرانم نمی دانم علاج کار خود
شوق من بے‌باک، فرصت تنگ، جاناں بے دماغ

ساقیا گرد سرت گردم عطا کن جرعۂ
یک نفس خواهم که از قید خودی یابم فراغ

ز خال گوشۂ آں چشم سخت می ترسم
که هندوے شده با کافر فرنگ رفیق

روم بسیر بهشت حجاز بار دگر
اگر کرامت پیر مرا کند توفیق

روز قیامت هر کسے در دست گیرد نامۂ
من نیز حاضر می شوم تصویر جاناں در بغل

کرد آخر ناتوانی‌ها ز صیادم خجل
می پریدم باقفس گر بال و پر می داشتم

می رود مکتوب و داغم من ز بخت نارسا
کاش من هم بال مرغ نامه بر می داشتم

بار منت بر نتابد همت مردانه ام
نیش بر دل می خورد از بهر کشتن دانه ام

تا آمدم چو غنچه نرگس دریں چمن
چشمے کشادم و گل حیرت بسر زدم

دلم را باز دادن بر تو دشوار است میدانم
گرفتار خودی آئینه درکار است میدانم

سیه کارم ز طفلی خو پذیر بادهٔ نابم
چو نیلوفر بود نشو و نما در عالم آبم

نیست پیدا جوهر پرواز من زیر فلک
مے تواں دیدن برون بیضه بال انشانیم

حالتم با گرد باد دامن صحرا یکے است
تا نفس باقیست پا برجاست سر گردانیم

پیش آے عندلیب که باهم بسر بریم
بعد از زمانهٔ بچمن وا رسیده ایم

کذبے که گرد فتنه نشاند فرو رواست
اں حرف را ز مخبر صادق شنیده ایم

سیر حسن آں ذقن با زلف عنبر فام کن
سایه و چاهے است ایدل اندکے آرام کن

چو شیشهٔ که دراں نرگس از هنر سازند
خیال چشم کسے جا گرفت در دل من

رسید موسم گل راہ گلستان سر کن
چو گل زرے کہ تراھست صرف ساغر کن

نقد خودی بعالم مستی ز کف مدہ
چون بت نظر کشادہ دریں دیر خواب کن

سائلم اما لب اظہار مطلب بستہ ام
حالتم جون ماہ نو پیداست از سیائے من

خدمت احمق اگر فیضے رساند نست بد
گاؤ پروردن بود از بہر عنبر یافتن

خون ریخت یکنھے تیغ کین او
اظہار کرد لعل لب آستین او

باز خورشید صفت جلوہ طراز آمدۂ
چشم بد دور کہ خوش ذرہ نواز آمدۂ
عمرت اے سرو گلستان وفا باد دراز
کہ سوئے ما ز رہ دور و دراز آمدۂ

ھست امید شہی از حال مسکینی مرا
زخم دل را میتواند دوخت ایں مور سیاہ(۱)

---

۱ - شہی کی رعایت سے 'سپاہ' بھی پڑھا جا سکتا ہے -

نوائے نے نوازے بر دل من زخم زد کاری
نہان در پردۂ نے ناخن شیر است پنداری

ز خود آسودگاں دانند آئین حق آگاہی
دریں دارالخلافہ میرسد منصور را شاہی

مساز از سرمہ در رخسار خود خال
چہ خواہی از سیاہے؟ بے وفائی

روزے ز دور او را عشق بلند گفتم
فرمود کیست گفتند آزاد بینوائے

رباعی

دوشنبہ بخواب خوش دیدم بر پا
دربان ارم ستادہ در دست عصا
رفتم کہ اجازت طلبم، گفت کہ،
گفتم کہ غلام علی ام، گفت : بیا

قزلباش خاں امّید

خان آرزو گوید! ''نام اصلی این عزیز بزرگوار، محمد رضا ست۔ از ہمدان بود ۔ از مدت مدید وارد ہندوستان گردید ۔ بیشتر رفیق ذوالفقار خان بہادر نصرت جنگ میر بخشی محمد اورنگ زیب بہادر شاہ غازی بود ۔ اکثر در دکن تشریف داشتہ، بعد ازاں مدتے برفاقت نظام الملک آصف جاہ صاحب صوبہ دکن عمر عزیز خود گزرانیدہ، با آنکہ

قریب چهل سال که دریں ملک است زبانش بلهجه هندی خوب میگردد ـ و لیکن زبان این ملک را خوب می فهمد و نکته هاے نغمات هندی مثل او مغل بچهٔ که اکثر اهل هند نمیرسند، از بسکه طبیعت او منصف افتاده ـ اکثر چیزهائے هندوستان را داد میدهد ـ و از تعصب مطلق معرّا و مبراست ، باوجود زیّ امارت، دنیا را یک ذرّه وجود نمی گذارد، بسیار مجردانه می زید ـ صاحب مشرب عالی است، آدمی باین اخلاق حسنه و اوصاف پسندیده کم دیده شد ـ قریب هشت نه سال است که سواد حضرت شاه جهان اباد دهلی را باسعّه ذات فائض الانوار مشرق تجلی ساخته هیچ هنگامه و مجمعے نیست ـ که بے تکلف گلچین تماشاش نبوده ـ بقیةالسّیف آدمست و چراغ دودمان اهانت بود ـ در قدما به سلمان که از اهل بیت سخن است شعرش بسیار ماناست ـ با فقیر آرزو بغایت اشفاق و اخلاص داشت، سه سال پس ازیں برحمت حق پیوست انّاہے که فقیر رساله تنبیه‌الغافلین فی الاعتراضات علی اشعار الحزین نوشته بود بعضے از کاسه لسان هند که بتصدیق بلاتصور معتقد کلام شعرائے ایرانند بخان مسطور ظاهر کردند که فلانے یعنی فقیر آرزو اعتراضات از جهت خلاف محاوره و سستی‌عبارت و نارسائی مصارع بر اشعار شیخ محمد علی حزین‌نموده خان امیّد که گفت که در زبان دانیٔ شیخ شبه نیست اما اینقدر هم یقینی است که آنچه فلانے یعنی فقیر آرزو گفته باشد بے چیزے نخواهد بود ـ،، انتهی کلامهٗ ـ

مؤلّف گوید ـ خان مرحوم را وقتے که در جهان آباد در سن ۱۱۵۲ یکهزار و یک صد و پنجاه و دو وارد شد دیده و مکرر بصحبتش رسیده، با کبر سن و عمدگی که داشت خیلے متواضع و خلیق بود بگرم جوشی تمام برخورد ـ خود را از تلامذهٔ میرزا طاهر وحید دبیرالممالک ایران مے شمرد ـ بسیار صاحب درد و ذوق بنظر آمد ـ گاهے طرفه آهے

سرد می کشید۔ مجلسش اکابرانه و کلامش بزرگانه بود ۔ این شعر
فقیر را بسیار پسند نمود ؎

نشد آغشته سبک روح به آلایش دهر
حرف رنگیں نشود در دهن خون آلوده

چون از دهلی بلاهور رسیدم خبر فوتش شنیدم و این فقره در تاریخ
فوتش گفتم ۔ ''آه از قزلباش خان امید،، اشعارے که خان آرزو از
دیوانش انتخاب زده، نوشته مے شود ۔ مطلع اول غزل دیوان امید
'ینست، خیلے به مزه واقع شده ؎

سراسر همچو مهر و ماه گردیدیم دنیا را
ندارد منزل آسایش گر دیدیم دنیا را

ما چون هما به خلق نداریم احتیاج
چون سایه دولتست غلام سیاه ما

سفله طبعان همه گویا نخود یک آش اند
مزهٔ نیست چو سنغم کرم ایشان را

در شکست کعبهٔ دل اینقدر ابرام چیست
حرمتے آخر بود در کار صاحب خانه را

بار احسان بدوش نگذارند
خوب رسمے است در زمانهٔ ما

حاجی، عبث بطوف حرم میکنی تو سعی
باید شدن به صاحب این خانه آشنا

پُر ز چشم خویش هم نادیدنیها دیده‌ام
گوشهٔ اکنون بس است از مردم دنیا مرا

چو بوئے گل کہ سیمس برون برد از باغ
ھوائے کوئے تو مارا دمے بما نگذاشت

نیست دلسوزے بجز خود سمع را
بیکسی ها را کسے درکار نیست

وحشت خیز است وادئی عشق
بے شور جنوں نمے تواں رفت

طوطی خاموش تصویرم، اسد
حرفها دارم کہ کس نشنیده است

اے عمر برق جلوه چه عیّار شده ای
کز رفتنت نمی شود آواز پا بلند

فلک ز بام تهی مایگاں درین بازار
مرا چو گوهر دزدیده آشکار نه کرد

داد مارا ز حال خویش خبر
بد بما هر که کرد احساں کرد

چوں صید زخم خوردهٔ صیاد در قفا
من بیقرار و یار ز من بے قرار تر

ز مرداں پیروی کردن بنامرداں نمے زیبد
شود ہرکس مرید زال دنیا لعن بر پیرش

در خاطر هیچکس نیاید یاد
از یاد تو هر که شد فراموش

سخن آنست که میگوید یار
حرف آنست که من میگویم

این بیت و بیت آینده انتخاب آرزو نیست ــــہ

گویند که جبر میکند یار
گفتیم که اختیار دارد

وقت آنست که از هجر تو چوں ابر بهار
گریه جائے کنم و ناله افغاں جائے

داغ شوق تو بسر، خار ملامت در پا
داد عشق تو مرا خلعت سر تا پائے

سراج الدین علی خان آرزو

در مجمع النفائس ترجمه خود چنیں می‌نویسد : ''بندهٔ عصیاں شعار بفضل حق امیدوار سراج‌الدین علی ، آرزو تخلص، از بدو شعور بتحصیل علم‌اشتغال داشت۔ تا چهارده سالگی داخل جرگه طلبه علم بود، بعد ازاں بمقتضائے شور نوجوانی (و طغیانی'' نادانی میلے به گفتن اشعار پیدا کرد، بعد یک سال ازاں) بمیر صاحب میر عبدالصمد سخن تخلص، افکار خود

گزرانیده یک ماه برین نگذشته بود که مفارقت به میان آمد۔ ناچار تنهائی‌را استاد خود مقرر نموده بدرس خاموشی اشتغال داشت۔ اتفاقاً سعادت و شرافت پناه میر غلام علی احسنی (۱) تخلّص که سابق احوال ایشان قلمی گردیده خود بخود بفقیر خانه تشریف فرمودند۔ و بے وجهے وغرضے در تربیت احقر می کوشیدند و دران ایام که سن شانزده سالگی بود اول این غزل از نظر ایشان گزرانیده۔

این حلقه حلقه زلف سیاه تو دام کیست
این شوخ شوخ آهوئے چشم تو دام کیست

بعد اندک مدتے گرفتار اشغال دیگر گردیده و دکّان سخن گوئی را بر چیده، پس ازان اتفاق رفتن لشکر ظفر اثر حضرت محی‌الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاه غازی بسمت دکن شد و بعد نه ماه سفر رسیدن (۲) به لشکر مذکور همراه بادشاه زاده عالیجاه محمد اعظم شاه که بعد فوت پدر برتخت سلطنت نشست از دکن روانهٔ هندوستان شده بود العود احمد گویان بگوالیار رسید۔ و بحکم حضرت والده مرحومه چندے دران شهر فروکش کرد۔ تا آنکه میان شاهزاده مذکور و برادر بزرگش جنگ عظیمے واقع شد۔ و محمد اعظم شاه کشته گردید۔ و بهادر شاه بتخت سلطنت نشست۔ درین بین فقیر از گوالیار باکبرآباد آمد۔ و بسبب برهمزدگیٔ زمانه و قدر نشناسئی خانه زادان قدیم و پیش آمد نو دولتان چند سال بکسب علوم پرداخت وکتب متداوله را در خدمت استاد العقول، واقف فروع و اصول حضرت مولانا عمادالدین مشتهر بدرویش محمد قدس الله اسراره گزرانید۔ پس حسب‌الطلب حضرت والده بگوالیار رفت چندگاه مانده بود که باز گردش سلطنت که

---

۱ - احسنی گوالیاری (گل رعنا و مجمع)
۲ - ب و برشدن

انموذج قیامت است۔ رو نمود، پسرانش باهم در افتادند تا آنکه محمد عظیم الشان پسر دومی و محمد رفیع‌الشان پسر سومی و جهانشاه پسر چهارم مقتول گشتند و معزّالدین جهاندار شاه اولین پسر فتح‌یاب شده برتخت سلطنت جا گرفت، و این احقر در سلطنت جهاندار شاه باز از گوالیار باکبرآباد آمد تا آنکه در میان جهاندار شاه مذکور و محمد فرّخ سیر پسر دوم محمد عظیم الشان جنگے واقع شد۔ و جهاندارشاه بطرف دهلی گریخت۔ و محمد فرخ سیر مالک تخت شاهی گشته روانه دارالخلافه گشت۔ و دران جا رسیده عموی خود را ظاهرا بانتقام پدر بقتل رسانیده چند سال بعیش و کامرانی و سخا و زر افشانی گذرانند۔ و فقیر اوائل سلطنت محمد فرخ سیر بادشاه مرحوم بتقریب خدمتے بدهلی رفت چند سال بخوسدلی که نتیجهٔ غفلت است۔ بسر برد۔ درین میان گاهے بمشق شعر هم مشغول بود (و چون سادات باره بادای حق نمک بادشاه شهید محمد فرخ سیر را کشتند) پای عزل خدمتے که داشتم بمیان آمد۔ و چند روز بیکار مانده پس از اتفاقات زمانه نیرنگ ساز فقیر(۱) باکبرآباد

---

۱ - مجمع النفائس قلمی نسخه ب میں درج ذیل عبارت ہے جو حاکم کے یہاں نہیں - بظاہر تلخیص کر دی گئی ہے :—

پس از اتفاقات زمانهٔ نیرنگ ساز هنگامه و محمد نیکو سیر پسر محمد اکبر و از (؟) عالمگیر بادشاه که او را قلعه اکبر آباد ببادشاهی برداشته بودند بر همین کار و بار سادات شد ، و اینها بعد فوت رفیع‌الدرجات پسر رفیع الشان که او را بجاے محمد فرخ سیر بر تخت نشانده بودند رفیع الدوله برادر کلان رفیع الدرجات را بر تخت نشانده ناچار عازم اکبرآباد گشتند ، قضا را بعد رسیدن افواج بادشاهی باکبر آباد رفیع الدوله قضا کرد سادات ملجا (؟) شده سید نجم‌الدین علی خان برادر خورد خود را صاحب صوبه شاهجهان‌آباد بود نوشته بادشاه زاده روشن اختر ولد جهان دار شاه را مخفی طلب داشته بر تخت نشانده ملقب به محمد شاه گردانیدند ، درین ضمن قلعه اکبر آباد نیز مفتوح شد و فقیر پس از هنگامهٔ مذکور باکبر آباد در خدمت بزرگان و آشنایان رسید

رسید ۔ و بتوجه نواب مغفرت مآب مرزا جهان(۱)مرحوم بخدمتے از خدمات گوالیار مامور گشته درانجا رفت ۔ و یکسال ماند ۔ و هنگامے که فردوس آرامگاه بعد فتح (سند) عبدالله خاں بدهلی نهضت فرمودند(۲) ۔ این عاجز در هماں سال از گوالیار بدهلی آمده سیے نرور و روزے بسر مے آورد ۔ و سی سال است که درین شهر کرامت بهر بسر می برد ۔ از جمله آن سیزده سال است که اکثر اوقات صرف خدمت و صحبت(۳) نواب اسحق خاں نجم الدوله مے نماید ۔

نسب این ذرّه بے مقدار از طرف والد شیخ کمال الدین همشیره زاده قطب الواصلین شیخ نصیرالدین محمود المشهور بچراغ دهلی و از طرف والده بمرکز دائره ولایت شیخ حمیدالدین عرف محمد غوث گوالیاری قدس سره مے پیوندد(۴) خاتمه فقیر بهمین معنی این بیت گفته :

جدا ست مرا حضرت عطّار ازین راه
اسعار خود اکنون به نشاپور فرستم

بهر طور شاعری إرثاً بمن رسیده و پدر مرحوم من شیخ حسام الدین که گاهے حسامی و گاهے حسام تخلص میکرد ۔ نیز طبع نظمے داشت ۔ هر چند مرد سپاهی پیشه بود سلک منصب داران عالم گیر شاهی منسلک امّا گاهے به سلسله جنبائی موزونیت طبع شعر میفرمود ۔ ازوست رحمة الله علیه ۔

۱ - مرزا خاں (مجمع النفائس نسخه ب)
۲ - یہاں پھر تلخیص ہے
۳ - حاکم نے طویل القاب والی عبارت حذف کر دی ہے
۴ - مجمع النفائس میں یہاں یہ عبارت ہے :-
"و نسب حضرت شیخ محمد غوث بچند واسطه بسر دفتر اولیا و سر سلسله عرفا خواجه فرید الدین عطار دام ملکه می پیوندد و لهذا فرزندان ایشان را عطاری می گویند"

گہے چین بر جبین گاہے تبسم کردہ ہے آئی
بہر رنگے کہ خواہی جلوہ کن محو تماشائیم

باہنگے عجب بردہ است مطرب زادۂ ہوسم
کہ از حسرت سراپا ہمچو نے گہ چسم و گہ گوسم

در بیاباں ژالہ کار سنگ طفلاں میکند
در ازل شد قسمت دیوانہ از ہر باب سنگ(۱)

مخفی نماند کہ مدت پنجاہ سال است کہ ناموس سخن گوئی بر گردن دارم۔ و اوراق کتب و دواوین چوں رور و سب مے سپارم۔ امّا ہنوز سر رشتہ مضبوط گوئی چنانچہ باید بدست بیفتاد و بنفس سخن شناسی دست نداده، با این همه خیال سخنگوئی از سر نمیرود۔ وگوس سخن فهمی غیر این حرف نمے شنود۔ ناچار پارۂ از اشعار خود هم داخل نموده نام خود را پائین نام عزیزان نوشته باآنکه باین رتبه هم نبوده ام۔ امیّد ار بزرگان فن و صاحبان سخن آنست که این تقصیر را بآب عفو بشویند و در حق این عاصی جز جزاه الله خیرالجزاء نگویند۔ مصنّفات و مؤلّفات این عاصی اینست : کلیات اشعار وغیره در نظم و نثر قریب سی هزار بیت۔ فرهنگ سراج اللغه در بیان لغات قدیمه فارسیه قریب چهل هزار لغت۔ چراغ هدایت در لغات و مصطلحات متاخرین قریب پنج هزار لغت۔ نوادر الالفاظ در بیان لغات هندیه که فارسی و عربی آن غیر مشهور بود، قریب پنجاه هزار لغت(۲)۔ شرح گلستان که در اوان طفلی نوشته بود مسمی بخیابان قریب سه هزار بیت(۳)۔ شرح سکندر نامه (قریب) شش هزار بیت۔ شرح قصائد عرفی (قریب) چهار هزار بیت۔ نسخهٔ داد

---

۱ - اصل : نیست، تصحیح مجمع النفائس ب
۲ - کذا
۳ - پنج هزار لغت (گل رعنا)

سخن - شرح محاکمه منیر که بر اعتراضات شیدا بر قصیدهٔ قدسی نموده قریب سه هزار بیت، نسخه سراج منیر اجوبهٔ اعتراضات منیر بر چهار شاعر، عرفی وغیره قریب دو هزار بیت، نسخهٔ سراج وهاج شرح محاکمهٔ شعرا که در حل بیت حافظ شیراز مباحثه نموده (سه هزار بیت: گل رعنا) رساله موهبت عظمی در فن معانی بزبان پارسی بطریق مفتاح و تلخیص قریب دو هزار بیت - رسالهٔ عطیه کُبری در فن بیان (بزبان)(۱) پارسی بطریق مذکور (قریب) یکهزار و پانصد بیت - رساله تنبیهه الغافلین مشتمل بر اعتراضات بر اشعار شیخ علی حزین قریب سه هزار بیت - تذکره النعرای اکثر متقدم و متاخر شعرا که عبارت است از همین کتاب و این هم اگر باتمام رسد بفضل الٰهی قریب سی هزار(۲) بیت خواهد بود - انتهی کلامه -

مؤلف گوید : امام سخنوران سراج الدین علیخان تمک بزم گفتگو یعنی آرزو، عزیز صاحب کمال و شاعر شیرین مقال بوسعت مشرب موصوف، بے ساخته و بے تعین کسے بود - اخلاق حمیده و صفات ستوده داشت - در کتاب دانی و اصطلاحات و لغات بیبظیر، گویا درین وقت بجهان آباد ملک النعرای عصر خود بود - اکثر اشعار او ناخن بدل میزند - هرچند بعضے اعزه سخن فهم منکر زبان اویند لیکن شعر انتخابی او اگر جمع کرده شود دیوانے میشود سراپا موثر و پر درد، و بمعانی بلند و بمضمون تازه خیلے میل داشت - فقیر بعد رفتن نادرشاه بحسب اتفاق بجهان آباد وارد شدم - اول وهله باو بر خوردم و خط شاه آفرین مرحوم که حواله احقر فرموده بودند رسانیدم - به گرمئی بسیار پیش آمد و می گفت که من معتقد اخلاص فلانیم - یعنی فقیر که در جهان آباد باوجود جمعے از شعرا اول همین تمن ملاقات کرد - ازاں باز صحبت برآر شد - و هرگاه

---

۱ - گل رعنا

۲ - مجمع النفائس ب : چهل هزار

ز لاهور بجهان آباد می آمد دید وا دید باهم و آمد و رفت بسیار مے
بد، درآن ایام جواب دیوان فغانی در پیش داشت، فقیر هم گاهے غزل
ر تتبع آن میگفتم۔ بسبار محظوظ مے شد و دیوان خود را بخدمتش
ردم که بنظر تعمّق و تأمل مطالعه نموده از حسن و قبحش آگاهی باید
خشید۔ اول خود امتناع نمود آخر نگاه داشت و بعد دو ماه فرستاد۔
نچه بخاطرش رسید بران نونست۔ اکثر آن از راه سهو و فراموشی مرقوم
موده بود مگر در بعضے جا دخل بجا کرده، بهر حال بآن عزیز فقیر را
بط اخلاص زیاده از حد بود۔ روزے غزلے در تتبّع غزلش گفتم که
مقطعش اینست :

گر چنین از فیض خان آرزو گیرد نمک
طرفه شورے زین غزل حاکم بلاهور افگند

خان مرحوم این بیت بدیهه گفته فرستاد :

نیست شعر آرزو را رتبهٔ
گر تو با این هم پسندی حاکمی

درین لفظ (حاکمی) لطفے و ایهامے هست۔ بعد چندے احقر همراه
نواب صفدر جنگ وزیر الممالک در صوبه اوده افتادم و بعد فوت نواب
مرحوم، خان آرزو نیز همراه سالار جنگ برادر نجم‌الدوله در لکهنو
رسید و نواب علی قلی خان واله هم در آنجا همراه شجاع‌الدوله بود۔
صحبتهائے طرفه روداد ، آخر از نیرنگئی فلک دو رنگ، من همراه نواب
واله بجهان آباد روانه شدم و خان آرزو همان جا ماند۔ بعد چندے خبر
فوتش رسید۔ طرفه المے عائد حال این محزون گردید ، ۔

روزے در لشکر شجاع الدوله خواجه محمد یحیی خان خرد
تخلص، غزلے تازه طرح کرده حوالهٔ فقیر نمودند که بخان آرزو نمایند۔
اگر جائے غلط باشد اصلاح دهد۔ فقیر غزل مسطور بخانهٔ مذکور نمودم

و درخواست اصلاح بموجب تاکید صاحب غزل کردم، تبسمے کرد وگفت۔ خود تو چرا اصلاح نمیکنی که بمن بے نائی۔ در تتبع کتب و معلومات کم از من نیستی۔ و این سخن بهزل نمیگویم بیان واقع است۔ گفتم شما از راه مهربانی چنین گمان دارید و حسن ظنّ شما است و الا من هیچمدان به کدام عرصه ام۔ و چه میدانم۔ و صاحب غزل فقیر را چنانچه گمان شماست ظاهرا نمیدانسته باشد۔ بعد ازان به پاس خاطر فقیر چند جا دران غزل اصلاح داد۔ لیکن خود آن را قبول نه کرد و پسندش نیفتاد، وفاتش در سن ۱۱۶۹ یکهزار و یکصد و شصت و نه هجری در لکهنو واقع شد، انتخاب خود که آرزو در مجمع‌النفائس نوشته اینست :-

کجیئے نیست در طریق خدا
بنگین راست می کنند دعا

هلاک حسن تو پیرانه سرشدم گوئی
برائے جور تو پرورد روزگار مرا

همیشه جلوه گه یار ما بود جائے
که دخل نیست در آنجا درون و بیرون را

اختلاط خلق کامل را دهد نقص تمام
کم بود زین وجه قیمت جامه پوشیده را

شرم گناه در دل حیوان اثر کند
مستی جبین کند عرق آلود پیل را

---

۱ = شاید 'دور'

بصحرائے محبت گریہ‌ام را نیست هم دردے
مگر گاهے سیاهی میکند از دود ابر آنجا

———

صوفیان را میرسد آفت زنفس خویشتن
همچون آن کرمے که ضائع میکند پشمینه را

———

بگزار غفلت کز خواب بود است
تصدیع یوسف رنج زلیخا

———

در حضض فقر ما ، بر اوج دولت پادشاه
همدگر را در نظر کم قدر مے آئیم ما

———

شکسته پا بنشیں آرزو به گوشهٔ فقر
که شاه مملکت فقر چون تمرلنگ است

———

آرزو از مردم دنیا که کمتر از زن اند
چشم پوشیدن ترا واجب چو ستر عورتست

———

فلک هایں همه گردش نمے رسد جائے
گذشتن از سر آفاق سخت دشوار است

———

همچو من دیگر کرا با زشتیٔ اعمال خوست
طاعتم بد تر ز عصیان چون نماز بیوضوست

———

کوشش آدمی از سعی ملک بشتر است
خاکی(۱) از تیر دگر رفتن او بیشتر است

خاکم بسر که دیر خبردار گشته‌ام
تا بار بندم از نظرم کاروان گزشت

این جا چگونه دخل بود ذکر عمر را
کز نام دوست خانۂ ما چوں نگیں پرست

زنہار مپرسید بجز حرف دل از ما
خواندیم همیں مخزن اسرار و دگر هیچ

جز غلط کاری نباشد ظاهر آرائی خلق
چوں کنی تقطیع شعر، الفاظ بے معنی شود

نسبت خاص ضرور است وگرنه هیچ است
حق بسار که فرعوں بموسی دارد

افتادگی است مایۂ نشو و نمائے من
نخلم چو گرد باد ز خاک آب میخورد

بیقرار مال دنیا بہر روزی جان دهد
کشته چوں سیماب می گردد که زر پیدا کند

---

۱ - یہ شعر درست نہ ہوسکا مجمع ب میں یہ مصرعہ موجود نہیں -

گر تو مجنوں نشوی گرد رہ محمل باش
چند گامے بره عشق دویدن دارد

مے(۱) شناسد که چه در وصل و جدائی باشد
هرکرا عضو ز جا رفته بجا مے آید

چه ناداں مردم(۲) اند ایں بت پرستاں
ز خود عاجز ترے را مے پرستند

ذکر تو سرمه الیست که خاموشی آورد
یاد تو داروئے است که بیهوشی آورد

گرد خجالتے برخم جاودانه ماند
کز سجده ام غبار بر آں آستانه ماند

بشعر زندۂ جاوید مے شود انسان
که در زمیں غزل آرزو نه بینی قبر

ایکه میخواهی مرا در محفل شاهاں بری
مطلقاً آداب آں صحبت نمیداند فقیر

نمے بینم بزنداں عناصر روئے آسایش
چو جاں از کلفت ایں جسم خاکی زنده در گورم

---

۱ - مجمع ب میں شعر بالکل مسخ ہو گیا ہے
۲ - تصحیح از مجمع ب - اصل "مردند"

من زادهٔ درد دلم و پیشهٔ من غم
چون اسک مپرس از حسب و از نسب من

نامهٔ اعمال خود خواندم سراسر آرزو
جز خطا نامد برون والله اعلم بالصواب

این چند بیت فقیر حاکم که از زبانش شنیده بود و خوش آمده
مے نگارد۔

نزدیک بود قطع شود راه کوئے دوست
چشم عجب ز آبله پائی بپا رسید

دیدن پرواز فارغبالئے مرغان دلا ست
تو بدام افتاده ام صیاد چشم من بدوز

بود ز درد سخن آگہی باهل سخن
علاج سکتهٔ ابیات بوعلی نکند

به یمن عشق تو مقبول عالمے شده ام
کدام دل که درو جائے آرزو بتونیست

اے زخم دل ز به شدنت در خجالتم
بیدردهائے چشم ترے داشتی چه شد

چنانکه زنده بتریاک هست افعونی
اگرچه دشمن جانست یار جان منست

در بیابانیکه باز از خود دل ما میرود
راهبر میخواهد آن خارے که در پا میرود

گره به کار تو اے آہن نمے افتاد
دو روز غنچهٔ طبعم اگر شگفته شود

آید بحال ذائقه خوش گزیده ام
یک آشنای با مزه در روزگار نیست

آنروز که بردند دلم را با سیری
معلوم نگردید بدست چه کس افتاد

گفتم بسیر آب، دلم وا شود، نشد
یک گل شگفته بر لب دریا شود نشد

دل گر گداخت ریگ روان گرد گفتنی
ما چشم داشتیم که دریا شود نشد

نیافتم بجهان آرزو بغیر از خود
مصاحبے که بگویم مزاجدان منست

گلرخان تنگدلم خاطر من شاد کنید
چون شود بند قبا باز مرا یاد کنید

شیخ محمد علی حزیں سلمہ اللہ تعالیٰ

خان آرزو گوید، ''شیخ محمد علی حزیں تخلّص از مردم لاهجان گیلانست، گویند از اولاد سخ زاهد مرشد سخ صفی‌الدین اردبیلی است که صاحب سلسلۂ سلاطین صفویه بود۔ والد او ابوطالب نام داشت۔ ازیں جهت سجع نگینش علی ابن ابی طالب اسب و خالی ارلطفے نست، مدت مدید گزسته که از تسلط نادر ساه برقلمرو ایران و نارسائی روزگار و مزاج خودش وارد هندوستان جنّت نشاں گسته و در هنگامے که نادر شاه بر شاهجهان آباد دهلی مسلّط سده بود و شهر مذکور بتصرف قشون او در آمده در گوشۂ خزیده بود۔ بعد از رفتن افواج شاهی باز ظاهر شد، چوں کسے چنانکه قدر او بود درآنوقت نشناخت و نازکئی مزاجش که از کمر خوباں باج مے‌خواهد با سختی ایام نساخت بعزم ولایت عازم لاهور گردید۔ و بیشتر نتوانست رفت ۔ از بسکه طبع ناساز دارد وطن و غربت بر و یکسانست ، و در وقتیکه عمدة‌الملک امیر خاں بهادر از اله آباد* بحضور آمد۔ سخ بتوقّع قدر شناسی رجع القهقری نموده به شاهجهان آباد باز آمد ۔ و چندگاه[1] دیگر مثل عنقا وکیمیا متواری دریں شهر بود، غرض از گمنامی استباق افزائی مردم است و پس چوں بختش مدد و اقبال یاوری کرد عمدة‌الملک قریب مبلغ[2] لک دام جید (؟) از بادشاه برائے اوگرفت پس بجمعیت مے گزرانید و عجب آنکه شیخ مذکور رساله مشتمل بر حسب و نسب و سیر و سفر خود نوشته دعوی هائے بلند درآن نموده که صاحب داعیه ازاں معلوم می شود۔ گویا علّت غائی نوشتن رساله مذمت هند و اهل هند است ۔ از گدا تا بادشاه با آنکه هرچه او را رسیده از اهل ولایت

---

۱ - یه عبارت مجمع النفائس ب میں نهیں ، الف میں ہے

۲ - مجمع النفائس بست (هر دو نسخہ)

خودش رسیده و در هندوستان بہشت نشان هیچکس او را بالائے چشمت ابرو نگفته، عبث عبث۔ در حق این ملک و اهالئی آن گفته آنچه گفته، الحمد لله که حالات قبائح هند به حسنات بدل شد۔ درینولا بعزم حج و زیارت عتبات که روانه بنگاله سده بود۔ از عظیم آباد برگشته در بنارس که معبد عظیم هندوان است فروکش کرده ــه

ترسم نرسی بکعبه اے اعرابی
کیں ره که تو میروی 'بکفرستان' است

بالجمله شیخ میگوید۔ این دیوان که سهرت دارد دیوان چهارم است و سابق دیوان در تراب افاغنه تلف سد۔ بهر حال دیوان مذکور هم مکرّر بمطالعه در آمده بآن درجه که مظنون یا متقن [جماعه] نصیریان اوست نیست۔ اگر ایهم بآن دوسه دیوان ملحق میگردید مورد اینهمه اعتراضات نمی شد، اکثر تربیت طلبان و کاسه لیسان هند اعتقاد بیش از بیش در خدمت اس عزیز دارند، و او خود مثل کاهم و سلیم و غیرهما را مطلقاً وجود نمیگذارد۔ و چون امارت مرتبت نواب سیر افگن خان پسر غیرت خان مرحوم که سابق بشاگردی ومریدی (مرحومی) میر محمد افضل ثابت افتخار نموده در نگین خود کنده بود ع

"شیرافگن خان مرید ثابت است"

بعد از وفات میر مذکور باین عزیز اعتقادے که مافوقش متصور نبود بهم رسانید۔ محمد عظیم ثبات تخلص پسر میر مذکور بنا بر تعصب قریب دو صد بیت ماخذ اشعار شیخ حزیں برآورده چنانچه پارهٔ ازاں در تذکره عالیجاه خان شفقت نشان علی قلیخاں واله داغستانی (که معتقد و مخلص حزین بود۔ و حالا سوره برات دوستی شیخ حفظ کرده) مرقوم است۔ چون ثبات مذکور سیّد غریب است کسے آنرا نمے پرسد۔ بهر کیف میگویند که شیخ مذکور فاضل است و صاحب تصانیف، لکن هیچ

تصنیفے از علم حکمت و کلام بنظر نیامده، بعد مطالعه احوال مصنفات معلوم خواهد شد آرے شعر که(۱) میگوید۔ انتہی کلامه :

مؤلف گوید که در بنارس دو مرتبه بصحبت شیخ محمد علی حزیں سلمه الله تعالی رسیدم بسیار بخلق برخورد، در صحبت اول از اشعار خود چیزے نبرده بودم۔ تکلیف خواندن شعر کرد۔ گفتم اینوقت بیادم نیست۔ و اوراق نظر بپاس ادب بخدمت نیاوردم۔ وقت رخصت تاکید تمام فرمود که فردا صبح البته خواهی آمد که چمچه دالے باهم خورده شود و پارهٔ از اشعار خود نیز بیاری، چوں مبالغهٔ بسیار نموده بود۔ روز دوم صبح رفتم و چند غزلے تازه که مشق کرده بودم بردم و گذرانیدم، بغور تمام تا دیرے مطالعه نمود۔ جائے ناخنش بند نه شد، بسیار محظوط گردید و تحسین های بلیغ نمود و بعد فراغ طعام تادیرے صحبت گرم ماند۔ و هنگام وداع گفت که اگر فردا کوچ شجاع الدوله نشد۔ البته خواهی آمد که صحبت غنیمت است۔ و یک ورق از اشعار تازهٔ خود طریق یادگار عنایت نمود۔ چوں صبح اتفاق کوچ افتاد دیگر ملاقاتش دست نداد، از حالات و کمالاتش چه نویسم که در هندوستان و ایران اشتهار تمام دارد۔ دریں عصر همچو اوئے نیست بسیار صاحب مذاق است و زبانش طرفه صفا و روانی دارد۔ آنچه خان آرزو در تنبیه الغافلین بر اشعارش ایراد گرفت اکثر آں از ستم ظریفی است ۔ مگر در بعضے مواضع گرفت بجاست ، بالفعل در بنارس فروکش دارد۔ درلباس فقیری امیرانه میگذارد۔ اشعار انتخابی ازو ؎

دریں دریائے بے پایاں دریں طوفان شور افزا

دل افگندیم بسم‌الله مجریها و مرسٰها

---

۱ - کذا - مجمع النفائس ب میں بھی یہی ہے - ممکن ہے 'شعر که می گوید' ہو مگر اس سے کچھ مطلب نہیں نکلتا اور شعر کہ میں 'ک' تحقیری ہے مگر آرزو کی طرف سے اتنا عتاب؟ سمجھ میں نہیں آتا - ہاں ناراضگی بیجا ہے۔

بفردا وعده داد امروز جان ناشیکبا را
که شادی مرگ سازد وعدۂ فردائے او ما را

نشود باز که زندانی آباد شویم
به کجا می بری اے خضر بیابان ما را

بکویت جذبۂ شوق مرا رهبر نمے باید
شتابم در فلاخن مے نهد سنگ نشانها را

جنون را کارها باقیست با مشت غبار ما
که بازیگاه طفلان می‌شود خاک مزار ما

هنوز آغاز رعنائی‌است عشق سرکش ما را
فروزان ترکند دامانِ محشر آتش ما را

چند اے فلک دوں ز در صلح درآئی
بگذار یا خاطر رنجیدۂ ما را

گل داغے ز عشق او بیاراید جهانے را
که یک خورشید بس باشد زمین و آسمانے را

زد فقر حلقه بر در دولت سرائے ما
نقش مراد شد شکن بوریائے ما

آں بلبلم که میگذرانم بزیر بال
ایام شادمانیٔ گلزار خویش را

از شمع اے صبادم افسردہ باز دار
بگذار تا بہام کنم کار خویش را

مے شنیدم کہ سر بے سر و پایان داری
اول اے دوست من بے سر و پا را دریاب

در کوئے غم آواز حزینے کہ شنیدی
نالیدن دل بود ندانم چہ بلا داشت

دل بسپدہ ستیم بہ نیرنگ بہاراں
آں رنگ کدام است کہ در برگ خزاں نیست

در باغ کسے نکند فہم صفیرت
این زمزمہ آں مرغ سناسد کہ اسیر است

حباب از خویشتن چون بگذرد دریا کند خود را
سکستن شبنم را عرقہ آب(۱) بقا دارد

در کیش ما چو سجدۂ کافر قبول نیست
شکرے کہ منکران محبت ادا کنند

گرچہ میگردد از پرہیز ہر دردے کہ ہست
درد ما را میکند پرہیزگاری بیشتر

---

۱ - ایضاً دیوان حزین - الف - غرقۂ ریاض‌الشعرا وغیرہ میں بھی یہی ہے

بـا یـد رفتن بـا ضطرارت
برخیز بـا ختیـا ر برخیز

دست فارغ نشد از چاک گریباں ما را
آستینے نه کشیدیم بچشم تر خویش

دارم ز داغ دل چمنے درکنار خویش
در زیر بال میگذرانم بهار خویش

ز امشب مگذران گر می کنی نکرے برائے من
منِ آتش بجاں چوں شمع تا فردا نمے مانم

تا چـنـد حزیں بـد شت گـر د ی
اے خانه خراب، خانه ات کو ؟

کدامی دست فارغ داشتم تا سبحه گردانم
که دستے رهن ساغر بود و در دست سبو دستے

دل باسباب پریشیاں جهاں شاد مکن
فال جمعیت از اورق خزاں نکشائی

اے زا هد افسرده ترا زنده نگویم
بے درد چه حال است، نه سوزے نه گدازے

حاکم - حکیم بیگ خان

خان آرزو گوید که ''حکیم بیگ خان حاکم تخلص، [آو] (۱) از مردم مغلیه است، والد شریفش شادمان خان خطاب داشت، از طرف جدّه سید است از فرزندان قاضی میر یوسف که از سادات معتبره هرات بود، و از طرف پدر اوزبک(۲). اورغ دورمن که از نجبائے قوم اوزبک است شادمان خان در عهد عالمگیر از بلخ بهند آمده و در آن عهد بمنصب هفتصدی پنجاه سوار سرافرازی داشت و در زمان سلطنت پادشاه (شهید) محمد فرخ سیر سه هزاری و در عهد فردوس آرامگاه محمد شاه پادشاه بمنصب پنجهزاری ممتاز(۳) گشت، بسیار طبع هموار و خیلے سلامت مزاج دارد، از ملازمان پادشاهی است، از مدتے بوطن لاهور اختیار نموده - کسب فن شعر در خدمت شاه (۴) آفرین نموده، خیلے مشقش رسیده و تلاش معنی تازه دارد، چند سال پیش این دیوان خود را که قریب چهار هزار بیت است بنظر فقیر در آورده، بسیار مضبوط و مربوط گفته، در عالم اخلاص و پاس آشنائی و حسن اخلاق و تمامی وفاق یگّهٔ روزگار است، چندین مرتبه وارد شاهجهان آباد گشته، این مرتبه که بسبب ظلم صوبه‌دار پنجاب و ضبط جاگیرهائے مردم درینجا رسیده نیز ملاقات باحقر مے‌نماید، عاشق سخن است، خدائش سلامت دارد - الحال پارهٔ از اشعار خود نوشته داده، این ابیات ازان انتخاب زده نوشته آمد

پا برو می نماید چشم شوخش کجکلاهی ها
که می نازند دانم بر بروت خود سپاهی‌ها

---

۱ - اضافه و ترمیم از مجمع الف

۲ - اصل : اورنگ : گل رعنا میں بھی اوزبک ہے

۳ - مجمع الف : سرفراز

۴ - ملا

هر که با دیوانگاں پیوست، ایمن از بلاست
نیست بیم دزد هرگز خانهٔ زنجیر را

نمایم گر با سکندر کتاب سینهٔ خود را
نسپارد فرد باطل صفحهٔ آئینه خود را

بود (۱) در فقر لب بستن ز حرف مدعا واجب
کنم از موی چینے خرقهٔ پشمینهٔ خود را

داده ام مفت ز کف گوشه دامانے ر
چکنم گر نکنم پاره گریبانے زا

در گلشنے که مدعی آنجا چو گل شگفت
هرگز مرا چو نخل خزاں دیده بار نیست

دور از چشم تو از بسکه گریست
خبر کوری نرگس قلمی است

در خموشی گفتگو، اے شوخ، مستی در خمار
نیست کار هیچکس ایں کار کار چشم تست

از چه دل تنگ نشینیم درین فصل بهار
پنجهٔ هست و گریبانے و صحرائے هست

نیست معلوم که جاں داد، ز ما دل شدگاں
اینقدر هست که در کوئے تو غوغائے هست

---

۱ - تصحیح از مجمع ب : ایضاً گل رعنا شفیق -

ملایمت کند از سختی فلک ایمن
زرے که آب شود کے غم محک دارد

اگر بخاک رود بعد مرگ روشندل
چو آفتاب همان جائے بر فلک دارد

تا نگردد کهنه داغ عشق کے بخشد فروغ
شمع کم پرتو دهد چوں تازه روشن میشود

از صفائے آں در دنداں چو حرفے سر شود
نام گوهر حلقه از غلطانیٔ گوهر شود

طوق بدنامی اگر جزو تنش گردد رواست
هر که نافهمیده چوں طوطی سخنور میشود

چوں غنچه فسرده که نشگفت در بهار
گفتم بوصل هم دل من وا شود، نشد

نشد آغشته سبکروح بآلائش دهر
حرف رنگیں نشود در دهن حرص آلوده

بے تعلق تر بود چالاک تر در راه دوست
پا برهنه هر که گردیده است بهتر میدود

شد فرض عین خدمت طفل سرشک من
کو را نسب بحضرت یعقوب می رسد

آهو مگیر گر گفت، چشمش، غزاله خود را
تغییر نام حاکم بیمار می نماید

دست از جهان نشسته بحق در نیاز بود
زاهد وضو نکرده بفکر نماز بود

هستند زان دلیر بخون ریختن بتان
کز یک ادا ادائے دو صد خون بہا کنند

بلبلاں چوں بچمن زمزمہ بنیاد کنید
یاد محرومیٔ مرغان قفس زاد کنید

جدائی‌شد نصیب از خنده لب‌ها را ز یک دیگر
بروز خوشی فلک از همدمانم دور مے سازد

نه بدرد آشنائی نه به عشق راه دارد
به چکار آید این دل که کسے نگه دارد

ز من باشد به عالم خاندان کفر و دین روشن
دلم شمعے است کاندر کعبه و بت خانه میسوزد

بآن نگار گل از شرم روبرو نه شود
هزار رنگ شود لیک همچو او نشود

بکن ملاحظه در چاک کردن دل من
که این قماش اگر پاره شد رفو نشود

زنده در گور بے تو می سوزیم
همچو اخگر بزیر خاکستر

رویم بموئے سر، من مجنون ره سگت
دیوانهٔ ترا نبود زین شعار عار

ناقهٔ(۱) لیلی بصحرا رفت هان اے گرد باد
مے بری گر مشت خاك ما هم از پے، زود باش

صبر(۱)را گر نبرد از خود ادائے چشم مے نوشش
چرا از بزم، در میخانه مے آرند بر دوشش

حاکم نساخت سوختگانرا هوائے دهر
حالم بیک نسیم دگر گوں شود چو شمع

هلاك چشم تو با منکر و نکیر از ناز
دهد بگوشهٔ ابرو جواب در ته خاك

اهل دولت نیز اظهار پریشانی کنند
با وجود زر لباس پاره در برداشت گل

در دل خیال چشم تو دایم بگردش است
مانند آں مریض که جا می(۲) کند بدل

---

۱ - تصحیح از مجمع ب
۲ - مجمع ب : « جاں می کنند » گل رعنا ایضاً

در شادی و غم همدم تو با تو(۱) شریک است
کے خنده بیک لب کنی و گریه بیک چشم

بتاں نه شکّر بوسے نه زهر دشنامے
هزار شکر که شرمندهٔ شما نشدم

سوخت برق جلوهٔ آں سرو قدّت(۲) پیکرم
چشم قمری می شود آئینه از خاکسترم

ز دنیا و ز ما فیها ز دنیا و ز ما فیها
همین یار آرزو دارم همیں یار آرزو دارم

دریں بیت که گذشت اشاره به دوستئی فقیر آرزو نموده،

بسیلاب فنا داد آب خجلت‌ها(۳) وجودم را
لباس هستیم فرسود از بس شست و شو کردم

گر نه دنیا بآں دهن ماند
از چه حاکم بهیچ دل بستم

خود قاصد خود گشتم از رشک و ز ناکامی
پیغام شد از یادم گم گشت کتابت هم

حاکم بشهر قحطے(۴) ز اطفال و سنگ نیست
دیوانه نیست تا که بصحرا رود کسے

دهد اهل نظر را زینت ظاهر پریشانی
که آرد خانهٔ چشم از سفیدی رو بویرانی

---

۱ - مجمع الف : 'یار شریک است'
۲ - مجمع الف د ب : ' قد تا پیکرم'
۳ - مجمع الف : خجالت ها : دارم بجاے کردم
۴ - تصحیح از مجمع الف

میر محمد علی رائج

خان آرزو گوید: ''میر محمد علی رائج از سادات نجیب است کسب علم و فضل و شعر در خدمت والد بزرگوار (میر دوست محمد نام و صانع(۱) تخلص میکرد) نموده با میرزا عبدالقادر بیدل و شاه ناصر علی و فقیرالله آفرین و دیگر شعرای عصر هم طرح بود - عمرے دراز یافته، گاهے خالی از [شور و] جذبه عشق نبوده، در قصبه سیالکوٹ من اعمال لاهور چند دهنه چاه داشت که بسبب آب(۲) تاریک قناعت ساخته متوکلانه بسر میکرد - و هرچه ازاں حاصل می شد با صادر و وارد یکجا می خورد - دیوان کلانے دارد - آنچه بنظر فقیر آرزو در آمده قریب بیست هزار(۳) خواهد بود - بسیار بدمعاش حرف مے زند و خیلے تلاش معنئی تازه دارد - از دیوان او دریافت مے شود که مثل آن هم طرحان را کم اتفاق افتاده - پانزده شانزده سال است که برحمت ایزد پیوسته اکثر زمین غزلهایش طرحیٔ خود است و در بحور غیر مشهور که میرزا بیدل گفته اکثر غزلها گفته و خوب گفته و داد تلاش داده -،، انتهیٰ کلامه -

آنچه این فقیر می داند میر مرحوم از علم و فضل چندان بهرهٔ نداشت - لیکن در فارسی و فنّ نظم و نثر بسیار ماهر بود و کتابهائے دقیق نظم را بدقّت درس میگفت و در شعر طور تازه دارد، معنی بند و مضمون یاب است - خوش محاوره و نقل هائے رنگین و حرفهائے شیرین میکرد - چنانچه روزے نزد احقر نقلے کرد که سابق ازین چند سال بخانهٔ میر جلال‌الدین و سید فخرالدین محمد حسین که از اکابر لاهور و سادات معتبر و عمدهٔ آنجا بودند ورود اتفاق افتاد جماعهٔ دیگرهم از اهل سخن

---

۱ - مجمع الف و ب: صانع گل رعنا: سانع
۲ - مجمع ب: که سبب آن باب تاریک
۳ - مجمع الف و ب: هفت هزار

وغیرہ دران محفل هنگامه سخن گرم داشتند، عزیز ساده ازان مجمع خطاب بمیر فخرالدین کرد - و اسم ایشان پرسید، فرمودند : سید محمد فخرالدین محمد حسین، بعد از ساعتے باز گفت - که اسم شریف چیست؟ میر مذکور اظہار نمود که فخرالدین محمد حسین بعد ازان باز عرض کرد - که بنده فراموشی کردم - امیدوارم که اسم مبارک بشنوم - میر مذکور گفت فخرالدین محمد، بعد زمانے متصدع شد که یکبار دیگر مہربانی فرموده بگویند، او گفت فخرالدین، لمحۂ نگذشته بود که ایستاده شد و معروض داشت - گستاخی معاف همین بار که نام نامی خواهم شنید دوباره جرأت پرسیدن نخواهم کرد، ایشان گفتند که فخر، سلام کرد و نشست - هرگاه مجلس آخر شد و مردم رخصت وداع کردند، طرف ایشان نگاه کرد و گفت لاله جین مل جیو صاحب - ہام مردم از خنده ضعف کردند و میر مذکور طرفه حجالت کشید، میر رائج استاد عصر خود بود - فقیر اول در سیالکوٹ ملاقاتش کردم و هنگامیکه بلاهور آمد - مکرر بغریب خانه مہربانی فرمود - و این فقیر هم اکثر میرفتم ، چندے نگذشته(۱) که بلاهور فوت کرد، عمرش صد سال کسرے کم یا زیاده بوده باشد - تابوتش از لاهور بسیالکوٹ که وطنش بود بردند - تاریخ وفاتش چنین یافتم : رفت رائج بعالم باقی -

من اشعاره

از خم گردن تسلیم کشی گر ناخن
چقدر عقده ز دل باز توان کرد اینجا

چقدر بر تن ما کسوت فقر آمده است
خرقه گوئی که بود جامۂ فرسودۂ ما

---

۱ - ۱۱۵۰ھ میں (گل رعنا)

بزیر سایهٔ گم گشتگی سعادت‌هاست
درین زمانه هما(۱) هم بغیر عنقا نیست

در سوختن خروش من، از عشق شکوه نیست
نالہ اگر کباب نما خوانِ آتش است

در جهان پست و بلندے کو، که عشق آباد نیست
دشتے از مجنون و کوهے خالی از فرهاد نیست

آب میگردم ز شرم کین و موجے میزنم
بر رخ خصم(۲) اگر شمشیر می باید کشید

یا رب چه ساز مطرب بزم ازل نواخت
کز گوشها هنوز صدا کم نمے شود

بعالم هیچ کس خالی ز ما و من نمے باشد
بود هر جا که گردن بے رگ گردن نمی باشد

خرقهٔ صد پارهٔ من خانهٔ آئینه است
بس که دل در فکر کسب روشنائی میکند

عمر تلف شد بحرف سبحه و زنّار
آه که سر رشته بچنگ نیامد

---

۱ - مجمع الف و ب : 'همائے بغیر'
۲ - تصحیح از مجمع ب

بطور قرب توان برد ره بخاموشی
شد آنکه بهر تو الکن کلیم گویندش

میوه از بهر رسیدن مے رود یکساله راه
پختگیها گر هوس داری سفر شرط است شرط

محو ذوق کاو کاو ناخن غم گشته ام (۱)
سنه بودے کاتش در عشقت سرا پا بیکرم

به پیش ریزش اهل کرم دامن ضرور آید (۲)
نخستم وسعت مسرب ده آنگه هرچه خواهی ده

تا کے بنعمت ایں همه مغرور میروی
آخر چو لقمه در دهن گور میروی

خواجه میر درد

خان آرزو گوید که : ''خواجه میر درد تخلص پسر جناب عرفان مآب حضرت خواجه محمد ناصر است، سلمهٔ ربه ـ سلسلهٔ آبائے او بلا شبه بحضرت خواجه بهاءالدین محمد نقشبند قدس سره می رسد، از بزرگی و کمال(۳) خانوادهٔ او چه نوان نوشت، علی‌الخصوص والد بزرگوار او خواجه ناصر که امروز شمس فلک هدایت است، الغرض خواجه میر جوانے است خیلے صاحب فهم و ذکا، با شعر ربط بسیار دارد، سیّما ریخته که الحال در هندوستان رواج دارد، ـ فارسی هم خوب

---

۱ ـ اصل : کم : تصحیح از مجمع
۲ ـ مجمع ب : آمد
۳ ـ مجمع الف

می گوید چه بسیار بمذاق آشناست، بالقوه اش آنچه دریافت سے شود گر بفعل آید انشاءاللہ تعالی از جمله آنها می شود که در فنّ تصوف صاحب نامند۔ بزبان پارسی رباعی اکثر میگوید ۔ و خوب می گوید و با ایں عاجز (۱)رابطهٔ خاصے دارد و خلے شفقت بر احوالِ این عاجز(۲) نماید،، ۔ انتهٰی کلامه ۰

ایں عزیز بزرگ عالی دودمان را فقیر مکرّر بخانهٔ خان آرزو روز مراخته یعنی صحت ریخته گویان هندی که در پانزدهم هر ماهے مقرر بود دیده ام ۔ بسار خلق و متواضع و صاحب معنی بنظر آمد۔ در زبان هندی رباعی های مؤحدانه خوب خوب مگوید ۔ و اشعار فارسیش هم که خان آرزو نوشته خالی از تلاش نست ۔ درینولا از میر صاحب آزاد سلمهُ الله شنیده شد که میر درد سال گذشته در برهانپور رسیده ارادهٔ حرمین شریفین دارد ۔ لیکن فقیر آن بزرگ را در جهاز و هم در کعبه شریف ندید ۔ شاید بر سال آئنده موقوف داشته باشند، ۔ هر جا باشند حلاوت (کذا) باشد ۔ ازو ست ــــه

رباعی

بر دوش هوا بسته نفس محمل ما
حیف است که پیچد هوسے در دل ما
حل(۳) همچو حباب گرچه کردیم دلے
جز هیچ نداشت در گره مشکل ما

رباعی

یک عمر ز دور می شنیدم او را
در بر بخیال می کشیدم او را
اکنوں که چو آئینه رسیدم پیشش
خود را او دید، من ندیدم او را

---

۱ - مجمع الف و ب 'ربط خاص'
۲ - هیچ مدان، مجمع ب
۳ - مجمع ب : حال

رباعی

ناچار اے درد در جہاں باید زیست
هر چند که شد زیست گراں ، باید زیست
مردن به مراد خود میسر گر نیست
چندے بمراد دیگران باید زیست(۱)

علی عظیم خاں

آرزو گوید : ''علی عظیم پسر شاہ ناصر علی بسیار عزیز کسے و مرد از خود گذشته فانی مشربست، از عنفوان جوانی فقیر را ازیں عزیز اخلاص محقق است، خیلے منوّکلانه مے زید ۔ و هرچه بد ستش مے افتد صرف عزیزان مے نماید ۔ گویا نام اصلی او عزیز الدین محمد است، چنانکه والد او میفرماید :

عظیم الدین محمّد صاحب هوش
من و تو هر دو یک خواب فراموش

در تیر اندازی هم دستے دارد ۔ بهر طور صاحب اخلاق حسنه است، شعر هم خوب میگوید ۔ اگرچه کم میگوید : ازوست(۲)

می پرد چشم ، مرده ایست عظیم
بعد ازیں دیده‌ها و دیدنها

از بیابان عدم تا سر بازار وجود
بتلاش کفنے آمده عریانے چند

بغارت گشت یا خوں گشت یا محو تماشا شد
خدا داند چه پیش آمد دل دیوانهٔ ما را

بذوق سنگ طفلاں از بیاباں میرسد مجنوں
باشوبے که در بازار رسوائی نمیگنجد

---

۱ - مجمع النفائس میں رباعیات کی تعداد زیادہ ہے ۔

بعد مراجعت نادر شاہ، فقیر بخدمت این مرد بزرگ در جہان آباد ہنگامے کہ بر دروازۂ باغ بیگم فروکش داشت مکرّر رسیدہ بلکہ اکثر نزد او می رفت، خیلے صاحب تمکین. کم حرف و بزرگ منش بنظر آمد ۔ اول ملاقات چندان گرم برنخورد، بعد برس و جرئے و اطّلاع نام والد بجوسس تمام سلوک کرد و فرمود ۔ کہ حق والد تو بر من بسیار است ۔ دیوان خود بر آورد و چند شعر بر جستہ خواند ۔ ہر چند استاد و استاد زادہ است و حالی از تلاش نیست لیکن شہرت بدر کجا، اشعارش آنقدر مشہور نشد روزے بتقریبے گفتم کہ نقل رقعہ والد شریف یعنی شاہ ناصر علی مرحوم کہ بحاجی فریدون شاملو نوشتہ بودند نزد فقیر موجود است ۔ فرمود کہ البتہ بفرست کہ از نثر والد خود ہیچ ندارم ۔ کتابے کہ در پشت او رقعہ مرقوم بود فرستادم، بسیار محظوظ و خوشوقت شد و نقل آنرا بدستخط خود گرفت، الحال معلوم نیست کہ بقید حیات است یا رحلت کردہ ، اگر زندہ است سبحانہ تعالی بعافیتش دارد کہ درینوقت غنیمت است، دران ایام عمرش قریب بہفتاد بودہ باشد، ازوست ۔

ہر کہ شد محو تو از قبلہ ندارد خبرے
چون گہر نیست جہت افتاد جبین سائی دل

میر شمس الدین فقیر

خان آرزو گوید : ''میر شمس‌الدین فقیر سابق مفتون تخلص می کرد ، و آنرا نیز بحال داشت، بہر دو تخلص مقاطع غزلہا دارد، الحاصل از اکابر زادہ ہاے دہلی و از طرف والد عبّاسی و از جانب مادر سیّد است، خیلے شریف النسب و کثیرالاخلاق واقع شدہ، از مدت سی و چند سال کہ اوائل نومشقیٔ شعرش بود بر فقیر آرزو مہربانست

خداش سلامت دارد که امروز مثل او در هند نیست، مدتے مدید در خجسته بنیاد اورنگ آباد دکن بود آخر همراه خان مرحوم قزلباش خان امید بشاهجهان آباد دهلی که وطن اجداد امجاد او ست تشریف آورده مشق سخن و صفائیٔ زبان را بجائے رسانده که اهل زبان ازو حساب بر میدارند بلکه بعضے دم از تلمّذش مے زنند ـ در فضل و کمال و شعرو انشاء و فنون دیگر مثل عروض و قافیه و معانی و بیان و بدیع یکتای روزگار و منتخب لیل و نهار است حتّے که در اکثر این فنون رسائل مفیده نوشته چنانچه عالیجاه علی قلی خان **واله** آنرا داخل تذکرهٔ خود که مسمی است **بریاض الشعرا** نموده و نیز قصیدهٔ دارد که مشتمل است بر جمیع صنائع شعری و بعد از رسید وطواط ایمسم قصیده بنظر نامده، مثنویات متعدده موزون کرده و نهایت بصفا گفته، و در غزل تتبّع بابا **فغانی** دارد ـ بلکه اگر انصاف فرمایند دانند که کمان ابروئے ابیات بطاق بلند آویخته،، انتهی کلامه ـ

میر فقیر را این فقیر اول یکدفعه در صحبت قزلباش خان امید دیده بود، بعد ازان اتفاق نیفتاد، پس از چند سال در عهد احمد شاه بادشاه پسر محمد شاه روزے غزلے در تتبّع غزل نظیری که معزی الیه هم فکر کرده بود گفتم و نزد ایشان فرستادم ـ بعد مطالعه رقعه بنهایت جوشش نوشتند، لهذا یکبار بخانه انس رفتم دیوان خود طلبید و شعرهائے بسیار خواند الحق درینوقت بے همتا ست و صاحب کمال، و یک دو بار در صحبت نواب **واله** نیز دیده شد، ازان باز معلوم نیست که بچه حال است، یک دو غزل فقیر که باو رسیده بسیار بسیار محظوظ شد و اخلاص بهمرسانید، این چند شعر از انتخاب خان آرزو نوشته شد سه

ز صاحب خانه مهمان را بخود مشغول میسازد
تماشا کرده ام بسیار این سقف منقّش را

باغبان گو ندهد ره به گلستان تو ام
بس بود جلوهٔ خار سر دیوار مرا

خارے که رهروان تو از پا بر آورند
آید بچشم یوسف گل پیرهن مرا

زان سطیم بدام به ذوق اسیریم
صیاد اگر بداند سر مدهد مرا

در جهان کار بتعجیل نگیرد صورت
در چهل روز سرستند گل آدم را

چو نفس با نتوانیم از زمین برخاست
نشسته در ره او نقش ناتوانی ما

بخاکدانِ جهان گنج بے نیازی را
کسے نیافته غیر از فقیر خانه خراب

ز آمد آمد قاصد فقیر از خویشتن رفتم
چه خواهم کرد اگر دلدار گردد ناگهان پیدا

دلت شرک خفی دارد بعشقش چاره کن زاهد
به صرافش بده تا بشکند این قلب روکش(۱) را

تا چند فقیر از حرم و دیر بگوئی
خلوت کدهٔ حضرت یار ست دل ما

---

۱ - (آنند راج) نوعی از زر قلب

تو سرو ناز قدم چون بجلوه افشاری
ز دل چو آب روان می بری قرار مرا

نالۂ مرغ قفس می برد از کار مرا
کہ ازیں پیش دلے بود گرفتار مرا

پُر خون دلہا میخوری جانہا بغارت میبری
ترسم کہ باشد پرسشی ایں خوردہ و این بردہ را

در محبت جستم آزادی، ادیب عشق گفت
درمیان ھفتۂ اطفال را آدینہ نیست

روز فراق رفت و شب وصل ھم گذشت
آخر ز پیش چشم من این بیش و کم گذشت

نقد جان در عوض بوسہ توان کرد قبول
کہ خریدار فقیر است تونگر خود نیست

زاھداں را ز بانگ نے چہ اثر
سیر ایں کوچہ از کجا کردند

بستۂ زھد محالست رھائی یابد
گرہ دانہ تسبیح کجا باز شود

معلوم نشد کہ خان آرزو با ایں ھمہ تعریف و توصیف فقیر کہ در تذکرہ نوشتہ، کم نوشتن اشعار او چہ معنی داشتہ باشد۔

مظهر، جان جاں

خان آررو گوید : '' حان جانان، مظهر نخلص آنحه از زبانش مسموع است آنست که نام اصلی او حان حان اسب حه والدش محمد جان نام داست نظر دران محان جان موسوم گردانیده، حالا به حانجانان سهرت گرفته، ار عنفوان حوانی که والد مرحومس ودیعت حیات سپرده نفقر و فنا مشغولست، حنانحه در حدمت بزرگے ار سلسلهٔ نقشبندیه داخل طریقه گسته بعد ازان کسب فضائل صوری و معنوی نموده، الحال که عمرش به ىنجاه رسیده همىىه در استحکام مراتب صوفی گری ساعی اسب، با اینهمه ار سور عسق طاهری گاهے خالی نبوده باوجود نقشّد مذهب کمال توسع مشرب دارد، در دقت نهم و ذکاوت طبع یکتائے ملک و بهار بلکه بے مثل روزگار است ـ جدت طبع و حودت ذهن بمرتبه دارد که مصداق این مصرع است ـ ع

که سخن نگفته ناسی سخنی رسیده باسد

از ابتدائے نو مشفق با فقیر کمال اخلاص و ارتباط دارد ـ بسنعر گاهے ریخته که شعر آمیختهٔ هندی و فارسی است طریقه خاص مگفت(۱)، حالا خلاف رتبه خود دانسته ترک کرده، بعضے ار تلامذهٔ خود را تربیت بسیار کرده حتی که بعضے مگویند که سعر حود گفته با و میدهند ـ والله اعلم، ـ

هر چند که سعر دون مرتبه اوست درسولا انتخاب اشعارش نوشته مے سود، ـ انتهی کلامه ـ

مؤلف در مسجد جامع جهان آباد دو مرتبه بایں بزرگ ملاقات نموده ـ در ملاقات اول فرمود که دریں سهر چند بار آمدی و مارا ندیدی

---

۱ - مجمع ب : خاصه

ایں معنی باعث غبن طرفه شد، معلوم نگردید که غبن در حق فقیر خواهد بود نه از خدمت همچو عزیز بزرگ صاحب طریق مستفید شدم سخنهائے نهایت بعلّو مراتب سفرمود. و معنّی کمال در مزاجش معلوم شد، در ملاقات دوم گفت نه اش آمدن محسوب نیست، روزے بغریب خانه تائی و سیے نگدرانی و اشعار مرا بشنوی . گفتم بچشم، لیکن اتفاق نیفتاد، دیوانش قریب به دو سه هزار بیت خواهد بود، شهرت تمام دارد، ایں فقیر مطالعه نموده‌ام. بسیار بدرد میگوید ـ الحال که بر مسند ارشاد نشسته فکر شعر کم میکند، سلمه‌الله تعالی ـ

من اشعاره

آبے نرد بروئے گراں خواب بخت ما
با آنکه گریه داده بسیلاب رخت ما
یک(۱) ناله درد از دل ما بنوا نرفت
خوان خلیل شد جگر لخت لخت ما

———

چیزے نوشته اسم بلوح مزار خویش
ایں حرف گفتنی است بنا مهربان ما

———

چه خوش بروئے دل تنگ ما درے وا کرد
خدا دراز کند عمر زخم کاریٔ ما

———

کرد آخر حسن بالا دست او رسوا مرا
مو کشاں چوں خانه تصویر برد از جا مرا

———

اجر ایں حسن عمل می دیدی اے مرغ چمن
در قفس برگ گلے گرمی فرستادی مرا

---

۱ - مجمع الف و ب : یک ناله از در دل بے نوا رفت

دیدی آخر حال باغ اے بے مروت باغبان
رخصت سیر چمن کردن نمی دادی مرا

از سر افرازی سنان یا رب که میدادے مرا
کار با افتادگیها گر نیفتادے مرا

اگر ز بندگیٔ چون منے ترا عار است
تو زنده باش، خریدار بنده بسیار است

بندهٔ مردن خویشم که در ماتم ما
درد فریاد بر آورد و غم یار گریست

دریں موقع بیت فقیرهم (یعنی حاکم) نوشتنی بود ـــ

من در دم پسین و غم او برنگ شمع
استاده است بر سر من، گریه میکند

(حاکم)

چون شب هجر تو مرگم بعیادت آمد
دست بر سر زد و بر حال من زار گریست

طرفه حال است که دل این همه تنگست هنوز
از برائے غم درد تو بدل جائے هست

نیست دخل اسباب را این جا که چون مژگان چشم
بوریائے خانه ام بیرون در افتاد است

مگوئید ، آه ، پیش من مگوئید
که معشوق کسے عاشق نواز است

یار از گریۂ شبہائے غم من مے پرسید
ناگہاں ابر سیاہے ز مقابل برخاست

چو آفتاب نجانم دہد گر از شب ہجر
چو صبح بر علامے برو خرید کند (؟)

یار مجروح مرا دید دواں مے آید
ہمچو آں طفل کہ نبرس بہ نساں مے آید

برنگ غنچہ کز اندك نسیمے باز میگردد
اگر حرفے بپرسد یار، دل دفتر بروں آرد

نعش مظہر چو ز کویت گذرد جسم ببوتش
آخر ایں مردہ ہما نست کہ بہار تو بود

مے تواں انصاف کرد آخر کہ اول حقّ کیست
در ہلاك کوہ کن پرویز نے تقصیر بود

(فقیر حاکم گوید کہ بس ساہ آفرین ہم شاہد بیت مظہر است

شیریں بکام خسرو، فرہاد و تلخ کامی
از خود نمے تواں کرد معشوق دیگراں را)

با دل دیوانہ در یکجا اسیرم کردہ اند
پر گنہ گارم کہ ہم زنجیر شیرم کردہ اند

خوں ریزی ات بجا ست کہ سرو قدت ترا
چوں نیزہ از برائے نبرد آفریدہ اند

زود دکّان خود اے سیسه گران تخته کنید
فوج طفلاں بقفا مظهر ما مے آید

باغ نزدیکست و من در دام و فصل گل رسد
الوداع اے هم صفیراں مرگ این بلبل رسد

چون بر ابروری رخسم، اے عالم از دست تو داغ
سگرنزد سرمه از چشم تو چون دود چراغ

بشنود یا نشنود یک بار سلامم بگو
اے دل بے جرأت من، ما علیک الا البلاغ

چو مکتوبے که از سهرے به شهرے می رود مظهر
ر عالم آنچه بردم من همین نقد سخن بردم

شیخ عبدالرّضا متین

خان آرزو گوید : ''شیخ عبدالرضائے متین، گمان دارم که اصلش از عرب است، فقیر را بارها اتفّاقی صحبت و ملاقات او افتاده، درد مند و شکسته دل بنظر آمده، اوائل عصر محمد شاه بادشاه در جهان آباد در زی ارباب روزگار بود - بعد ازان بلکھنو پیش برهان‌الملک سعادت خان رفته - گویند در آنجا ترک لباس کرده و سعادت خان برائے او وظیفه مقرر نموده، تا حال در قید حیات است، الحال مفصّلاً از حالات او اطلاع نیست ایّامے که در دهلی بود میر افضل ثابت را باوجود کمال ربط، ناخوشی باو بمیان آمده و ظاهرا بر سر شاگردیٔ مرزا ابراهیم استعداد تخلص - و میر دریں باب قصیدهٔ گفته، در کلیاتش مسطور است

بہر حال شیخ بسیار خوش مشرب(۱) و خوش صحبت کسے است - و کارے بکار کس ندارد - و با موافق و مخالف گرم می جوشید،، انتہی کلامہ -

مولّف گوید - سیخ سلمہ اللہ تعالی را بلشکر نواب صفدر جنگ در باںر گھاٹ دیدہ بودہ - دیوان خود طلبد و اسعار خود از قسم غزل و قصدہ خواند - صاحب ربان اسب و خوس فکر - لیک بسیار نازک مزاج و کم دماغ، نواب والہ سابق ازیں چند سال از اودھ بہ لکھنو رسید - و فقیر همراہ بود - سیخ مذکور را بنا بر ربط و اخلاص قدیم طلب داشت و رقعہ نوست و در جواب و سوال رقعہ خیلے آزردہ شد و ترک ملاقات نمود - هم چنین با شیخ محمد علی حزیں هم (کذا) ندارد و معتقدش نیست - فقیر اکثر اشعار خود نزد او خواندہ ام - بسیار پسند کردہ - خصوصاً ایں بیت بنهایت خوسس آمدہ بود -

گر با تو دل بہم زدہ سودا، مرا چہ جرم
زلف تو کرد بحس بے جا، مرا چہ جرم

شمع کافورند حاکم، در سبستان وفا
روشنم سد سرد مہری هاے ایں یاران گرم

ایں چند شعر ازوست ــہ

سفلۂ بے مغز همچو بہلہ هر جا دست یافت
میشود هم پنجہ دائم دستگیر خوس را

نیست اکسیرے بہ از صحبت کامل عیار
گفتہ‌ام حرفے کہ مے باید بآب زر نوشت

سفلہ از آلودگیٔ دولت دنیا ست عزیز
ایں ملمّع چو ازو دور شود مس گردد

---

۱ - مجمع ب ؛ خوش صحبت و با مشرب

نزد بر آتش دل اشک حسرتم آبے
ازین چه سود که چشمم چو شمع گریانست

رباعی

در عرصهٔ کائنات کردیم نگاه
گشتیم ز یکتائیے یکیک آگاه
هر کس دیدیم مثل و مانندش نیست
هر فرد بود بوحدت خویش گواه

فاضل خان منصف

خان آرزو گوید که : " فاضل خان منصف عزیزے بود از اهل توران، داخل جرگه امرائے عالم گیر بادشاه۔ بسیار خوش سخن و با شاه ناصر علی خیلے ربط داشت،، انتہیٰ کلامهٗ ۔

فقیر در ایام صغر سن بعمر ده یازده سالگی منصف مرحوم را در لاهور بخانهٔ والد خود مکرّر دیده ام و یادم درست مانده. احوال او بوجه احسن معلوم این هیچمدان است (کذا) ۔ نامش خواجه بابا ملقب بفاضل خان از اکابر و نجبای سمرقند است ۔ ظاهرا خدمت صدارت آن ولایت هم چندے با و بود ۔ و روشناس سبحان قلی خان بادشاه توران، و امرائے آنجا همه معتقد و مخلص او بودند، سیادتش ازین مصرع شاه ناصر علی که در قصیده گفته مستفاد مے شود ۔ ع

توئی که سید منصف رفیق من گردی

در عهد عالمگیر دو سال خدمت داغ تصحیحه داشت بعد ازان استعفے داد ۔ از رفقای و مصاحبه نواب محمد امین خان چین بهادر که در آنوقت بخدمت صدارت امتیاز داشت، بود، هرگاه معرفت امیر خان

پنهی ملازمت پادشاه نمود داخل درس گردید ـ بادشاه را باو خیلے اعتقاد بهمرسید چنانچه مىفرمود که فاضل خان گنج مخفی بود، افسوس در آخر عمر یافتم ـ و نواب سیف‌الدوله عبدالصمد خان باو اتّحاد و اخلاص بدرجه اتّم داست بلکه معتند و مخلص او بود ـ هم جنس والد مولّف با منصف مرحوم کمال دوستی و محبت دانست و اکثر بلکه در هر هفته دو بار بخانهٔ والد تشریف مىفرمود ـ و شبها روز مىکرد ـ فضیلت بکمال داشت ، در نجوم و رمل و علم هند سه و هئت بے نظر بود ـ لیکن در شعر آن قدرها نیست که مردم توران گمان دارند ـ

روزے در ملتان نواب سیف الدوله ازین فقیر پرسیدند که اشعار منصف مرحوم بهتر است یا اشعار شاه آفرین. احقر نظر بر اخلاص و اعتقاد ایشان گفتم ـ شاه آفرین را چه نسبت با منصف است ـ ازین خیلے مزاج مبارك نواب خوش شد و انحرف بسند طبع عالی ایشان افتاد ـ فرموده که نو جوان منصف بودی. بر اهل سخن معلوم است که منصف را بشاه آفرین چه مناسبت لیکن بنا بر پاس خاطر مبارك نواب مغفور حرفے گفتم و ایشان را خوش کردم ـ بهر حال خان مرحوم طبع نند و خوبے درست داشت، خالی از جنونے نبود ـ اگرچه تاعزه که باو کمال اخلاص داشتند بسختی و درستی بیش مے آمد ـ آنها بر مے داشتند و گاهے ازو آزرده نمے شدند، بعد فوت عالمگیر بادشاه بحج رفت و از آنجا بعهد فرخ سیر بادشاه بجهان آباد رسید ـ نواب اعتمادالدوله بپاس آشنائی و رفاقت قدیمش خواستند که باز در سلک ملازمان شاهی منسلک گردد، قبول نکرد، ـ و بلاهور برفاقت نواب سیف‌الدوله نقد عمر صرف کرد و همانجا در سنّ یک هزار و یک صد و بست برحمت حق پیوست ـ چنانچه تاریخ وفاتش، عزیزے، برحمت حق پیوست گفته، ـ پیش از احتضار بچند ساعت نقد و اموال خود را تقسیم نموده و از جمع آشنایان وداع کرد و در حجره بربست و جان بحق سپرد ـ

من اشعاره

جہاں پیراست نبود ار جوان بختی اسد اینجا
برنگ نامه زاید طفل با موئے سفید اینجا

با کسے نیست مرا طاقت همسائیہا
بعد ازیں دست من و دامن تنہائیہا

هر درد سر که میکشم از جور روزگار
مضمونِ نامه خطِّ پشیمانی منست

نقد دو کون در گره چشم بستہ است
سیر بہشت در پس زانو نشستن است

ما خود سفر ز خاطر احباب کرده ایم
یادش بخیر هر که فراموش کار ماست

هر جا خطاب اهل محبت رقم کنند
مارا درم خریدِ وفا عنوان نوشت

ما خراباتیان دُرد کشیم
با خوش و ناخوش زمانه خوشیم

لب فرو بسته دلِ بسمل صد رنگ هوس
محشر آه و فغانست کجا خاموشی است

آنچه نخواهم مصحف ازو یافتیم
خواهش او سفت ها، هیچ نخواهیم ما

نظام خاں معجز

خان آرزو گوید : " نظام خاں معجز نخلص، افغان نژاد وطنش نواح کابل و پشاور است ـ ایّامے کہ عبداللّطیف خان تنہا دیوان صوبہ کابل بود بخدمتش رسیدہ و اسعار خود را از نظرش گذرانیدہ، طرز و طور اشعار مسکلہ میرزا جلال اسیر سہرستانی و عبداللطیف خاں تنہا کہ بربر(۱) از فہمید ناقص لہالانسب اختیار نمودہ، با فقیر آسنا بود، عمرے دراز یافتہ ـ یک مرتبہ رباعی در تعریف احمر گفتہ فرستادہ، پیرانہ سر از حلیہ بصارت عاری گشتہ بعد ازاں مفلوج گردید ـ سال گذشتہ کہ سنہ یک ہزار و یکصد و سصت و دو ہجریست برحمت حق پیوست ـ خلیے تقوی و ورع داست، اکثر ملّایان مکتبی ساھجہان آباد مستفیدش بودند ـ کتب فارسیہ را درس مگفت و مدّعی آں بود کہ اشعار زلالی و اسیر را چوں او کم کسے می فہمد و اغلب کہ راست باسد کہ در دور خیالی متبع دو عزیز بودہ ، درینولا دیوانے ازو بنظر آمدہ ، انتخاب زدہ پارۂ ازاں نوسہ سد. اگرچہ بعضے جاھا اندک تفاوتے در وزن بنظر آمد محمول بر ساھل و بے پرواھی نمودہ، چنانکہ از بعضے ساگردان او نیز بتحقیق بپوست کہ باوجود دانستن باز متوجہ اصلاح آں نشد ـ اگرچہ دیوان عزیزان بقدر پسند خود انتخاب زدہ لیکن دیوان ایں عزیز را بقدر فہم خود نونشتہ، نصرت‌اللہ خاں نثار(۲) ھمطرح و ھم مذاق و ھم استاد او بود ـ اینقدر ھست کہ سعر نثار یک پردہ نازکتر از شعر او بود ـ بہر حال ھر دو را خدای کریم بیامرزد کہ آشنا بودند ـ مخفی نماند کہ از اشعار خوب ایشاں چناں دریافتہ مے شود کہ ابیات مغلقہ ایں عزیزاں کہ فہمیدہ نمے شود از قصور

---

۱ - مجمع ب : اکثر آں طرف تراز فہمید ما۔۔۔۔"

۲ - مجمع : کہ احوالش خواھد آمد انشاء اللہ تعالی ـ

ذهن ماست و الاّ این همه خوب از کجا بهم می رسند، و این معنی بر فکر دقیق روسن اسب،، انتهی کلامه ـ

مولف گوید ـ معجز مرحوم را در جهان آباد در سن یک هزار و یکصد و پنجاه و چار یکبار ملاقات نمودم بسّن کبر رسده بود در آخر عمر گوسه انزوا اختیار کرده به توکل و قناعت میگذرانید ـ نزد فقیر ستائش اشعار میرزا جلال اسیر زیاده از حد نمود وگفت میرزا صائب را چه نسبت به میرزا جلال اسیر ـ فقیر این دو بیت خواندم ـه

سعرے بگو اسیر که صائب کند پسند

طوطی بہند و موج بعمّان چه می بری

باوجود آنکه اسادم فصیحی بود اسیر

مصرع صائب مواند یک کتاب من سود

از بس که معتقد اسیر بود جانب داری نموده فرمود که در ابتدائے حال میرزا جلال اسیر اینقسم بیت ها گفته باسد و الاّ رتبهٔ او معلوم است ـ نظر بر بزرگیٔ آن عزیز ساکت ماندم ـ چندے از اسعار خود خواند، معنیٔ این بیت بفهم ناقص این فقیر نیامد ـه

ناله بر ناله در آغوش خودست

نے نیستان نسود گوش خودست

بعد چندے سنیدم که فوت کرد، این چند اشعار از اشعار او که خان آرزو انتخاب کرده نوسته سد ـه

دگر ز منت پرواز بر نمے آئیم

شنیده ایم به صیاد میدهد ما را

در سلسلهٔ وفا نگنجد

دردے که بدرد متصل نیست

چون برگ گل ببرگ در آغوش هم بود
چاك دلم بچاك گریبان مصاحب است

در گریه ناله ها که به کوئے تو میکنم
فریاد میکنم که مرا آب می برد

از ابر بهاری چه کشم منّت خشکے
دامان مرا چشم ترم لاله ستان کرد

هنوز حسرتِ مجنون و کوه کن باقی است
سکایت دل عاشق بسر نمی آید

نالۀ زنجیر می آید بگوش
بر سر کوئے که غوغا می شود

دل دیوانه در زنجیر سود است
گرفتاران مبارك باد خوشتر

ستاره سوخته دائم چو خال خواهی ماند
بروئے لاله رخان چشم خود سیاه مکن

بخرامت نتوانست رسید
چکند سرو که رفتارش نیست

نه مکتوبے تو بنوشتی نه پیغام وفا کردی
که میدانست کز ما این چنین بیگانه خواهی شد

دلم همیشه بکوئے تو مے طپد در خون
چه میشود که بپرسی، چه مدّعا دارد

واله علی قلی خان بهادر

خان آرزو گوید : ''که علی قلی خان بهادر، واله تخلص، از اولاد حضرت عباس عمّ پیغمبر است صلی‌اللہ‌علیه و سلم، در سلطنت کفره جنگبزیه، یکے از اجدادش بداغستان وارد می شود۔ مردم آنجا که الحال بهم سوافع اند او را جا داده به حکومت برگرفتند تا آنکه دولت سلطنت به سلاطین صفویه رسید. و چون داغستان سرحد ایرانست درمیان پادشاهان ایران و داغستان همیشه نزاع بود۔ پس ناچار یکے از سلاطین صفویه به یکے از خوسحالان(۱) داغستان پیغام کرد۔ که فرزندیرا از خود بفرستد تا او را بسرانه تربیت کرده اید۔ لهذا یکے از آبائے خان مذکور بایران آمده بوالا پایۂ امارت رسید و داغستان همان ملکے است که مهرمان ایران نادر شاه تا آنکه بهم ممکت ایران و توران و اکثر از روم را بیک عنان گردش بخاک شاه برابر کرد باوجود یساق سه ساله خوب از عهده داغستان بر نیامد۔ بهر حال خان مذکور از ازبک زاده‌هائے دیار ایرانست. عموی او فتح علیخان در عهد سلطان حسین میرزائے صفوی اعتمادالدوله وزیرالممالک کلّ ایران و والدش محمد(۲) علیخان بیگلر بیگی ایران که سرحد روم است بودند۔ بعد مکحول نمودن و قید کردن این دو شخص ملک مذکور محشر فتنه و آشوب گشت تا رسید کارش بجائیکه رسید. و خان مذکور بعد فوت پدر طفل بود که در مکتب با خدیجه سلطان عمو زادۂ خویش درس می خواند۔ پس مانند لیلے و مجنون عشقے بهمرسید و چون بعنفوان رسیدند در ایام تغلّب افاغنه بر ایران بسبب تعرّض بعضے موانع مواصلت دست بهم نداد۔ و خان مذکور ازاں ملک بهندوستان آمده داخل جرگه امرا شد۔

---

۱ - مجمع - سشحالان (میں اس لفظ کو حل نہیں کر سکا -)

۲ - مجمع الف : سهر علی خان

هرچند از علوم ظاهر بهرهٔ وافی ندارد ۔ امّا از جهته صفائے ذهن و تتبع کتب از اکثر مطالب آگاهی دارد ۔ و بشتر مقدمات مستحضر اوست ۔ علی الخصوص تصوف که از برکات تصفح و تحص اولیا توحید حقیقی پے برده وعالم را حدیقهٔ واحد شمرده ۔ در مقدّمه و صحابه تلكَ أُمَّةٌ قد خَلَتْ لَها ما كَسَبَتْ و لَكُمْ ما كَسَبْتُمْ و لا تُسألُونَ عَمّا كانوا يَفعَلُون گویاں دست از تعصب و تعنّت سنی و شیعه برداشته، بزرگان هر دو طرفی را ببزرگی و خوبی یاد کرده و میکند و از طعن و تشنیع که شیوهٔ متبریان بیهوده گوست مدام بر حذر می باشد، شاهد احوال اوست این مقال او :

رباعی

دیدم نزاع سنّی و شیعه لقب

کسوخته اند دلش جهل از ام و ابّ

هر جا که خریست تشنش شیعه بود

هر جا که سگے ست سنّتی هست لقب

خلاصهٔ کلام چوں در عشق که مبدأ معرفت و لُبّ لباب دنیا و آخرتست مستهلک و منهمک است تمام دیوانش از وقائع عشق و اسرار عرفان مملو است، در آشنا دوستی و جانب داری و اخلاص یکّهٔ روزگار است ۔ و در میدان شجاعت و دلاوری بے همتا شهسوار. باوجود آنکه با فقیر آرزو چنداں اخلاص ندارد، دریں بے کسی ها که هجوم آورده آنقدر عطوفت فرموده که از حیّز تقریر و تحریر بیرونست، اشعارش باکمال سلاست و بلاغت، اکثر تتبّع بابا فغانی است بلکه اگر بچشم دقّت نظر کرده آید چاشنی که در کلام اوست در شعر بابا نیست، زیرا که اینهمه مقدمات تصوف بابا را کم دست داده، چنانچه بر آگه بعد مطالعه کلّیاتش ظاهر

میگردد و تذکره متقدم و متأخر نیز نوشته قریب بچهل هزار بیت
نهایت مضبوط و مربوط، و فقیر آرزو را بعد نوشتن این نسخه تذکرۂ مذکور
بنظر آمد و الّا این همه درد سر میکشید لیکن واقعه اینکه اذواق
مختلف است، بهر حال انتخاب کتاب و انتخاب مذکور(۱) قلمی میگردد ـ،
انتهی کلامه ـ

مؤلّف گوید: خان مذکور چون بعزم هندوستان از ایران بلاهور
رسید شاه آفرین بقید حیات بود ـ استدعاے ملاقات کرد ـ شاه مرحوم
ابا نمود که فقرا را با مردم دنیا چه کار ـ آخر رقعه طولانی در باب
تشریف آوردن نوشت و این بیت شاه آفرین که در قصیده از قصائد که در
آن ایّام تازه مشق کرده بود درآن مرقوم نمود ـ

پژمرده ایم بے تو بفریاد ما برس
از باغ ما دریغ مدار اے بهار پا

شاه مذکور بعد مطالعه رقعه بخانه خان واله رفته چند ساعت صحبت
داشته ظاهر بکان(۲) (کذا) بمکان) بار دیگر که دعوت کرده بود و فقیر
نیز محرک شده بود همراه من بیا (کذا) قصر دران ایّام هوائے دیگر
در سر داشت ـ قبول نکرد بعد ازان خان مذکور بدارالخلافه رسیده
بوساطت روشن الدوله و بموجب نوشته برهان الملک ملازمت فردوس
آرامگاه محمد شاه بادشاه کرد ـ و بمنصب چهار هزاری سر افراز گردید ـ
و میر توزک دوم شد بعد ازان در عهد احمد شاه ششی هزاری و بخطاب
خان زمان بهادر ظفر جنگ مخاطب گردید ـ و ایّام سلطنت عالمگیر ثانی
که از اوده براۓ اصلاح کارهاۓ صوبه داریٔ شجاع الدوله پسر صفدرجنگ
بدهلی رفته معرفت عماد الملک وزیر بمنصب هفت هزاری سر افتخار

---

۱ - مجمع: مسطور
۲ - اس کے بعد کی عبارت مشکوک ہے - دو سطر - کذا تک

فلک اقتدار رسانید۔ و فقیر در هنگامے که صفدر جنگ با احمد شاه سر محمد شاه آزرده شد و بیرون شهر خیمه زده باعءادالملک جنگ بمیان آمد۔ وساطت خواجه محمد یحیی خان خرد تخلص (که احوال او خواهد آمد نشاء الله تعالی) در خانه نواب اعزازالدوله میر یحیی خان بهادر خلف واب زکریا خان بهادر که از مدتے بلباس فقیرانه مے گذراند ملاقات نواب معزی الیه کرده، بعد ازان مکرر بخانه اش رسیده بکرم جوشیٔ بسار بر میخورد۔ چون نواب صفدر جنگ بعد صلح از حضور بصوبه خود عازم سد۔ اکثر در راه انفاق دیدن نواب واله میشد۔ اشعار خود بسار مے خواند۔ که مے شد که از اول شام تا نصف شب گرم غزل خوانی می بود۔ روز بروز اخلاص استحکام مے پذیرفت، چنانچه بعد فوت صفدر جنگ فقیر را بجدّ تمام از شجاع الدوله متعین کرده همراه خود بدهلی آورد۔ و قریب یکهزار روپیه مدد خرچ برائے فقیر مقرر کرد که مصحوب مولوی محمود کشمیری که از مقرّبان او و اخلاص مند فقیر بود بفرستند لکن بسبب بعض امور قبول نکردم۔ این معنی باعث مزید اخلاص گردید۔ بعد رسیدن بجهان آباد عهد و پیمانے که با فقیر بسته بود۔(از تندئی مزاجے که داشت کار خودش صورت نگرفت) بوقوع نامد۔ آخرالامر فقیر رخصت شده بلشکر شجاع الدوله رسید و بعد چند ماه خبر فوتش شنید و متألم گردید۔ چهل و شش سال عمر یافت۔ این فقره در تاریخ وفاتش گفته بودم۔ پیوست برحمت واله، افسوس از جوانیٔ او، طرفه یا دوست خوش معاش و خوش پوش بود۔ اکثر مقروض مے ماند۔ خیلے خوش صحبت و خوش کلام و خوش تقریر و سریع التحریر دیده شد۔ در شعر کسے را منظور نمیداشت۔ و اکثرے از شعرائے عصر خود را وجود نمیگذاشت، قصاید غرّا و دیوانے قریب شش هفت هزار بیت دارد، و اکثر بطور قدما میگوید۔ و سخنش خیلے بدرد و بامزه است۔ روزے غزلے مشق میکرد و نزد فقیر خواند که این بیت ازانست ؛

آبحیات و کیمیا عمر دوباره و وفا　　اینهمه میرسد بهم - یار بهم نمیرسد

و گفت دریں زمان مجال کسے نیست که مصرعے تواند گفت و همان لحظه بانی هیچ مدان گفت تا تو هم دریں مشقے بکن، گفتم خود صاحب میفرمایند که مجال کسے نیست دیں نیز حد وسع نواهم گفت. سعی کرد و فرمود - من هم حدی نے کوہ - البته فکرے بکنند و میر علی فروغ تخلص که احوال شان نوشته خواهند شد - نیز بکلفت این غزل کرد - چنانچه میر غزلے بے مطلع که نه آورد و فقیر نیز بقدر استعداد خود دست و پاے دریں بحرزده - این دو سه ابیات غزلست :

باد زمانه که من گل بخزان بچیدمے
موسم گل ببیں کنوں خار بهم نمی رسد

پنجه عشق چاک کرد بس که لباس هستیم
دست بجیبم ارزنی تار بهم نمیرسد

صبرو قرار جان و دل مصرع والهم ربود
این همه میرسد بهم یار بهم نمیرسد

از استماع این غزل حظے محظوظ شد و میر فروغ و این احقر تحسینهائے بلیغ نمود زبانی مولوی محمود شنیده شد که نواب واله قریب بحالت احتضار در فکر شعر بود که ملا عبداللہ نامی در آنوقت حاضر شد وگفت - کدام وقت فکر شعر است - کلمه باید خواند و ایمان تازه باید کرد در جواب این رباعی خواند :

گر جان رودم ز تن نخواهم مردن
ور خاک شود بدن نخواهم مردن

گویند علی قلی بمرد، این غلط است
اوهام تو مرد من نخواهم مردن

از اشعار او که خان آرزو در تذکرهٔ خود آورده انتخاب زده نوشته شد؛

نسازد عشق ضائع رنج عشاق بلاکش را
هنوز از نعل فرهاد است سیرین کام محفلها

تحصیل علم و دانش خوش بود لیک واله
عشق جنون طبیعت فرصت نداد ما را

جاهلانرا نیست آگاهی ز حال خویشتن
خفته دائم خویش را بیدار می‌بیند بخواب

صد داغ نو ام در چمن سینه شکفته
اینها همه واله گل بیرحمی یار است

چو شمع قصهٔ سوزم بانتها نرسید
دمید صبح و مرا با تو گفتگو باقیست

گشود چون سرغم نامه ام بقاصد گفت
برو بگو که بمیرد به غم جواب انیست

آمد بپرسش من ونه نشسته باز رفت
اے من هلاک آنکه بدین خشم و ناز رفت

کوتاه شد فسانهٔ عمر دراز خضر
هر جا حدیث آن سر زلف دراز رفت

گر ماه من نقاب ز رخ باز میگرفت
انجام عشق رونق آغاز میگرفت

قاصد ار گرید چنین بر روز من
نامه ام در رہ مےگردد سفید

نه هر که بنده شود خدمتے کند بسزا
نه هر که خواجه سود بنده پروری داند

خیال لعل و سب بود در چشم
ز آواز مگس خوابم نمے برد

در سینه کاو کاو نگاهش همان که هست
ما را دلے نمانده واو در گمان که هست

جانان بسر مزارم آمد
آخر مردن بکارم آمد

خود مگر رنجه کنی دست نگارین ورنه
سر ما را که بفتراک تو بر مے بندد

خواستم سرح غم لاله رخے بنوشتم
غنچه سان خون دلم از سر انگشت چکید

اگر بپسم دمے آن تند خو از ناز بنشنید
چو برخیزد حدیثے سر کنم تا ناز بنشبند

ببرد باد غبارم ز کوئے یار افسوس
ز من نماند نشانے دران دیار افسوس

بگذاشت بخواب مرگ ما را
نا لیدن بیکسا نه د ل

15-16th Centuries, now preserved in the Library Malik N. 5927. The album has the title : تصویر بعض از اجداد با اقتدار "Pictures of some of our mighty predecessors", and contains the portraits of following rulers : Sham'-i jehan (1399-1408), his son Naqs-i jehan Khan (1415-1418), Shirmuhammad Khan (son of Uveys, 1408-1415, Sultan Mahmud Khan (son of Yunus Khan, 1487-1503), his brother Ahmed-Alacha Khan (1485-1503), Snqu Khan (Perhaps Sa'id Khan son of Ahmed Khan 1514-1533), Reshid Khan (son of Sa'id Khan, 1533-1570) and Sultan Sufi Khan. The work is prepared under the order of a Chaghatay ruler of East Turkistan, Sultan Sufi Khan, who is unknown in our historical sources. I think, this Sultan Sufi (the "pious khan, misteker) is the same as Abdülkerim Khan, son of Reshid Khan. He ruled from 1567 up to 1601 and he was a "very pious ruler" and was defeated by his brothers and left his country and fled to India to Akbar. It is possble that the small album came from India during the last years of Akbar's reign. But Sufi Khan in the time of completing of album was still ruler : حسب الامر الاعلی خلل‌الله فی الارضین مغیث الملة والدین السلطان سلطان صوفی خان خلدالله ملکه - The work is in one copy. It is possible that it was completed in East Turkistan and then brought perhaps by Abd al-kerim Khan to India. The picture of Sham'i-jehan is dated 773. Apparently the original picture of this ruler was made in this year and then was copied by the order of Sultan Sufi Khan. The pictures have a special interest for the study of dress and costumes of Chaghatay rulers, about which we have had till now not a single picture.

On page 65 there is a riq'a-plate of the artist Mir Ali Katib al-Mashhadi, made in Bukhara. On page 153 there is another made in Samarqand ; on page 118 a copy of the famous picture at the end of the Sadd-i Iskandar of Alishir Navayi, drawing Alishir among the Persian poets with Nizami at the top. This is dated 941. It is possible, that this copy is made by the same artist Mir Ali Mashhadi.

It is very interesting that similar Chaghatay language specimen and Timurid art are presented in the Album of Dara Shikuh in the India Office in London described by Prof. Muhammad Shafi in the Oriental College Magazine These are also only copies of the original works. I think that in the Muraqqa's of the Mogul times, preserved in the libraries of India and Pakistan, will be found similar Chaghatay literary specimens and miniature-copies of the original works made outside India, in Herat, Samarqand, Bukhara etc. If for all these remains of the cultural life of Timurid time an index is prepared, it will be a very useful and welcome work, especially for the historians of the Turks. It is significant that Baburids had an estimate of old Chaghatay poetry, also at the time some of them had perhaps forgotten their original language. That is to be seen from the orthografic errors. It is also very important to note that the Timurides in India had brought with them the artistic works from Central Asia, and they ordered to make copies from them and sent these copies as presents to the rulers of countries outside India.

Among the monuments of Chaghatay literature the Collection of Babur's works, preserved in the same Imperial Library under N.671 takes the most distinguished place The big and richly decorated volume contains Memoires of Babur, his Divan and his book on the versification and other smaller works. This collection is completed in the time of Humayun in 931. The Chaghatay text is written in black ink, and between the lines there is a Persian translation written in smaller script with red ink. But I had no time to compare this Persian translation with both translations of Abd-al-Rahim and Zeyruddin. For Turkology it is however, very very important that the Chaghatay text of this collection is written with diacritic marks, harakat. Also we can transcribe the Babur-name, according to the pronounciation of the sons of the author. We have had till now only for the Karakhani Turkis remains in Mahmud Kasgari's work, and for Chwarez mian Turkic in Nahj al-faradis similar diacritic signs.

One of the works received from India of Baburid time is the small album of pictures of the Chaghatay-Mogul rulers of Eastern Turkistan of

is written to one lady of the Royal family Qurta Ayim. In the marginal decoration is noticed, that the copy of the letter is made by Muhammad Zarrin Qalam in 1017 hijra. On the head of Hadiche Beki's letters is written a formal "Mirza tabugiyda", "In Mirza's servis"; At the top of Humayun's letter is written "Dadam tabugiyda", *i.e.* "in the service of my great Father". The letter of Hadiche Beki is apparently written after the death of her hausband. Also Ulugbek has inscribed in his coins "Emir Timur himmetiden", which means according to W. Barthold, recourse to the spirit of Emir Timur, the dead person most respected by the family, and that was a custom of the old Shamanist Turks. I give the text of the letter of the Queen Hadiche :

هو العز

مرزا تابو غيدا

خديجه بيكى دين دعا قيلاج اعلام اولكيم مرزاميان سلامت بيز - سيز راغى صحتكرغه هم دولت لارى يحشيراف بولغاى حلال الدين بابرى محرم كشى دورهم ... مد ميزلارى اتكه سى اور راغى بولغان سوزلبرى حقا لاريدن بيلغو نكير دور بيسه كيلور كشى سلامت ليغ خنبر يكيزى ارسال قيلدرغه ها كم - ز ريب دعا بتليدى -

و . م

In the marginal decorations of the Baburid gorgeous copies of Timurid literary and art works from Herat or Samarkand we notice here and there traces of influence of Indian art. The copies of the Majalis al-nafais and of the letter of Queen Hadiche Beki, the much adorned calligraphic copies of riqas with the verses of Sultan Husayin Bayqara or Navayi show us how highly the monuments of the Timurid art of Herat were esteemed in the Mogul courts of India. On the marginal Mujâlis decorations of page 49 is included one calligraphic script of Mavlana Azhar, the famous artist of the Art Academy of Baysungur at Herat in the first half of the fifteenth century.

The Chaghatay linguistic and literary specimens are to be found also on pp 46, and 108, and in the riq'as (*i.e.* calligrafic plates) of the famous artist Mir Ali Meshhadi. The marginal decorations of his miniatures on pp. 118, 124, 137, 152 and 164 contain specimens of the Chaghatay poetry, the stanzas of Sultan Huseyin in (comp. page 148). On page 42 there is a picture of Timur sitting on a horse back. On page 38 we find landscape and war pictures from the time of Timur or Shahrukh. page 91 contains a portrait of Miran Shah Mirza; 107 picture of a Chaghatay ruler, possibly Babur; 138-139 a copy of the famous picture of Sultan Huseyin Bayqara among his harem in a drinking party in his garden.

CHAGHATAY LINGUISTIC AND TIMURID ARTISTIC REMAINS IN THE MOGHUL-TIME WORKS PRESERVED IN THE TEHERAN LIBRARIES

BY

Prof. Z.V TOGAN

There are in the libraries of London and Teheran some important remains of Chaghatay literature and Timurid miniatures in the excellent copies made at the time of the Baburids in India. Among these the works preserved in the Imperial Library of Teheran attract much attention. There is an album of miniatures N 5617 known under the title "Muraqqa buzurg Gulshan. The recent publication of some significant folios of this album in Unesco's "Iran : Persian Miniatures—Imperial Library" (New York, 1956) makes it now very popular in the world It is completed in the last years of Akbar's reign, *i e.* between the years 1596 and 1601. It contains the copies of important monuments of Timurid art, made in India, and linguistic specimens of Chaghatay literature. The examples of the Chaghatay poetry are given on the pp 45, 55, 62, 160 and 161 in very beautiful calligraphy and excellent page-decorations. On the pp. 48, 49, 72 znand 133 parts of a gorgeous and gilded copy of "Majalis al-nafa' is", the biographies of the poets of the Timurid period of Central Asia, the well known work of Alishir Navayi, the greatest poet and statesman of the last Timurid of Herat. The copies in our album contain the biographies of the poets Mir Muflisi, Mavlana Abdal-qahhar, Mavlana Abd al-razzaq Samarqandi, the historian, Mavlana Qabili, Mavlana Sirri, Mavlana Mani, Mavlana Qudsi, Mavlana Ruhi Yazari, Shahi Badakhshan and some others. The original of this copy of this book was, apparently prepared for the emperor of Herat, namely, Sultan Huseyin Bayqara.

On page 4 is given a copy of a letter of the Queen Hadiche Beki, wife of the just mentioned Sultan Huseyin Bayqara. On page 132 is given a copy of another similar letter written by the Emperor Humayun. Both are in Chaghatay prose. Hadiche Beki announced in her letter that Jalal al-din, one of the officers of the curt, was a confidant of the Royal family, and in the marginal decoration there are some lines from the Divan of Ṣultan Husayin. Humayun's letter, dated 17th Jumada I, 930,

their headquarters at Sialkot and Gujranwala " p. 30 For further details see the Gazetteer Chap. 1.

52. Haji Muhammad Ismail. See also Doui p. 128, " It is just over fifty years since the first railway, a short line joining Lahore and Amritsar, was opened in 1862 Three years later Lahore was linked up with Multan and the small steamers which then plied on the Indus Amritsar was connected with Delhi in 1870, and Lahore with Peshawar in 1883". An extract from the article of Captain H. W. Wagstaff, Statistical officer, N.-W R runs as follows "The beginnings of the line date back to 1855 (two years before the Mutiny) when the Sindh Panjab and Delhi Guaranteed Railway Company was registered , the first section of the line between Kotri and Karachi City (105 miles) being opened some six years later In 1862 the same Company opened the section between Amritsar and Lahore and by 1870 various other sections were opened giving through connection from Ghaziabad *via* Lahore and Khanewal to Multan cantonment. The Panjab Northern State Railway was state owned line and owed its inception to the necessity of improving the communications between the Panjab and North West-Frontier. The first section, Lahore to Jhelum, was opened in 1873 and eventually Peshawar cantonment was reached in January of 1883 The first section was originally metre gauge and was converted to broad gauge in 1878, prior to further extention towards Peshawar. The line between Jhelum and Rawalpindi originally contained very heavy grades and was only finally improved to its present ruling gradient of 1/100 as late as 1897". (GLIMPSES OF THE PANJAB, A SOUVENIR of the 14th meeting of the Indian Science Congress held at Lahore in January 1927, C M G Press 1927, p. 49. Chapter-6).

53, 54. Tarikh-e-Makhzan-e-Panjab p 265. See also Tarikh-e-Aqwam-e-Kashmir for the Kashmiri families (compiled by Muhammad Din Fauq)

55, 56. Imperial Gazetteer Vol 2, p 3 and Tarikh-e-Gujranwala p 19

57. Jughrafia p. 41.

57-b Gazetteer of the Gujranwala District Revised ed. 1893-94, p 169

58. Doule p. 350.

59. Tarikh-e-Gujranwala pp. 17, 18

60. The market was constructed in 1854 A. D. For further details see *ibid* p 423.

61. The building belonged to the Sikh Period. For further details see *ibid* p. 415.

62. Only six gardens have been mentioned by the compilers of the Gazatteer (*Cf. ibid* p. 391. Bagh-e-Mahan Singh, Bagh-e-Hukman Singh, Bagh-e-Bhagat Singh, Bagh Tehsilwala, Bagh Hari Singhwala, and Bagh Rai Mul Singh).

63. Tarikh-e-Makhzan-e-Panjab p. 265.

63-b. Gazatteer of the Gujranwala District 1893-94 (ed. 1895) p. 33-34.

64. India as I knew it p 51.

65. *Ibid* p 66.

66. *Ibid* pp. 69—72.

67. An Industrial Survey of Gujranwala, Sabir Husain B.Com. (Type-script) P. U. L. p. 1.

68. *Ibid* pp. 3, 4, 5.

33 Tarikh-e-Gujranwala p. 17 At an other place (p 173) the compilers give the date 1750 A D in place of 1765 A. D.

34 Tarikh-e-Makhan-e-Panjab p 26.

35 Jughrafia p 42.

35-b. Gujranwala District Gazetteer (1895) p 170.

36 Tarikh-e-Gujran vol. 1 p. 283.

37. Shahan-e-Gujjar p 110

38 *Ibid* 433

39 Hamara Panjab p 278

40 The census of 1921 records their number in the whole of the district as under · Hindu Gujjars (male 84, female 48), Muslim Gujjars (Male 2,477, Female 1,070), Sikh Gujjars (Zero) total 3,679 This fact has been recognised even by so prejudiced a writer as M Muhammad Abdul Malik (*cf* 443)

41 Makhzan-e-Tarikh-e-Panjab p 265 See also Gujranwala District Gazetteer p 22 where in the compilers say that the native Sansis took the city from the 'Varaich tribe led by the famous robber chief Bare Khan " He further says. " The old fable of the horse and the man repeated itself The Sansis of Gujranwala rep lled the Varaichs, but fouud they had overcome a rival only to saddle them-selves with a master (Charat Singh) In 1765 Charat Singh seized Gujranwala city " (*ibid*)

42 Tarikh-e-Gujranwala p. 17

43 Charat Singh died in 1773 A D (*ibid* p 174)

44 Mahan Singh died in 1790 A D (*ibid*)

45 This garden was known as Bagh Mahan Singhwala in 1874 A D *ibid* p 391

46 Makhzan-e-Panjab pp 264-265

47. Travels in Kashmir and the Panjab (Baron Charles Hugel) English Tr by Major T. B Jervis F R S. ed. 1845 A D

48 There are very interesting details of the conversation that took place between the traveller and Hari Singh but these have no bearing on the present topic, therefore I have omitted these altogether

49. The Pakistan Times (Transport Supplement) p. 5

50. " The greater part of the section from Karnal to Lahore had been completed some years before the Mutiny, that from Lahore to Peshawar was finished in 1863-64". The Panjab, North-West Frontier Province and Kashmir (Provincial Geography of India Series) By Sir James Doui p 127.

51 " At first subdivision of the new acquired Province, the whole of the upper portion of the Rechana Doab from Jammu to Jhang boundry and from the Chenab to the Ravi including this district and that of Sialkot, was formed into one district. The temporary headquarters were at first Shaikhupura and for a short time Wazirabad. In 1851-52 this wide jurisdiction was broken up, and two districts were formed having

25. War Nadir Shah (Najabat) ed. by Bawa Kartar Singh. ed. 1920 pp. 28, 29. In line 11 the editor has read the word أنان وانگ which is wrong It should either be اناز وانگ or ناڑ وانگ

The manuscript mentioned above gives the text as follows :—

چڑھے گجراتوں شہباز خاں دھرتی دھاناں　　نے لنگ وزیراباد تھیں چپول جیے دھاناں
نے سب ہرار سوار دا، وچہ کوھاں تاناں　　ویکھ کے فوجاں بادشاھی ٹانکو کرلاناں
اچن جیے ڈٹھایا کوئی شکل پٹھاناں　　اوس ونج مرزے نوں آ کھیا کرسخن نماناں
مرزا سد ساہ نوں سخن کرے سیاناں　　ایھو کم اصیلدا پڑ چھڈ نہ جاناں
پڑھیا وچ قرآن دے شک ذرا نہ آناں　　شستر پھدی سوریا کر سوھا باناں
جیوں ساون چیچ بھوٹیاں چمکے ٹٹاناں　　اوہ مل کھلا میدان نوں جیون شیرستراناں
چھٹن تیر انار دے سر کٹے ماناں　　پوں بندوقاں کاڑ کاڑ کھوکت اڈاناں
جیوں اگ لگے ناڑموں یا بھجن دھاناں　　جیوں موچھے کر کرسٹیاں گنیاں تر کھاناں
جیوں ہولی کھیڈں راجپوت پہں شہیدی باناں　　جیون چڑھے شرابی نرش دھرباھاں سرھانار
اس وڈھیا مہ چپول دا کر لشکر کاناں　　مرزے قلندر بیگ دا سن رام کہاناں
عالمگیری دھڑے سے چڑھ تول وکاناں

(پوڑھی نادر شاہ دی (از) نجابت)

26 History of the Sikhs 1739—1768 (Dr. Hari Ram Gupta) ed. 1939 p. 155 on the authority of Khushwaqt Rai. "(Nodh Singh the father of Charat Singh) died in 1750 and his son formed a party of his own. . ...He was very soon in a situation to erect a Gari or fort at Guseraoli which he surunded with mud walls, and made the store house for his booty." Travels in the Kashmir and the Panjab Hugel (ed. 1845. Eng. Tr.) p. 269 The for was destroyed by Shah Zaman The remains were extant as late as 1953 when these were eventually pulled down for the construction of the Satellite Town.

27. Haji Muhammad Ismail saw it as late as the early British period.

28. Later Mughul History of the Panjab (Dr H R Gupta) footnote, p 300 Jafar Shamlu mentions two different places named Kachi Sarai and Gujran Sarai.

29 *Ibid.* p. 294.

30. India of Aurangzeb (Sir J. N. Sarkar) ed. 1901 Chap. v p. ci where in part 3 of the book appears in translation. The Ms. of the Panjab University Library is incomplete and ends on folio 77 b. Therefore English Tr. has been followed.

31. *Ibid.* p. ciii.

32. Tieffenthaler makes it 24 miles from Lahore and six miles north of Eminabad (Hodivala, Studies in Indo-Muslim History p. 694).

Bernier started from Lahore three days after the departure of the Emperor (Travels · p. 384 "Our departure is finally fixed, however, for tomarrow, as the king quited Lahore two days ago").

19 Storia do Mogor (Urdu Tr) Vol. 2 pp 184—186. Due to the hot weather Amin Khan used to travel in the night and covered the distance from Lahore to Gujrat in three days time.

20. Travels in India Vol 1 p. 94 (Travenier) V Ball. ed. 1889 gives the following stages from Atek to Lahore.

	Coss
From Atek to Calapane (Kalaki Sarai?)	16
From Calipane to Roupate (Rawat) .. .	16
From Roupate to Toulapeca (Tulpuri) . . .	16
From Toulapeca to Kearaly (or Sarai Alamgir) ..	19
From Kearaly to Zerabad (Wazirabad) . ..	16
From Zerabad to Imiabad (Eminabad)	18
From Imiabad to Lahore	18

21 Badai' Waqai' of Anand Ram Mukhlis ed by Muhammad Shafi' O C.M p. 62, 65 (1950).

22 William Irvine calls it Kacha Mirza and confuses it with Kot Mirzagan. L. Lockhart (Nadir Shah) p. 129. has the following footnote.—

> " The text of the Tarikh-i-Nadiri is obscure here (p. 197), it gives the name of the fortress as Kacha Mirza "on that" (i e, the east) side of the river Wazirabad" (i.e, Chenab) No fortress called Kacha Mirza can be traced, Sir J Sarkar, in a personal letter to me, expresses the view that "Kachha Mirza" is a mistake for Kunja Mirza, as to the words *an taraf-i-ab-i-Wazirabad* ("that side of the Wazirabad river") he considers either that *an* (that) should be read *in* (this) or that the account was written at Delhi, when *an taraf* (that side) would mean the western side of the Chenab This explanation seems better than the one which I had previously in mind, namely that Kachha Mirza was at a point somewhere near Kachha Sarai which, according to the Manazil-i-Futuh (fol. 8b) was 10 coss from Yaminabad, on the road to Wazirabad."

My view that the Kacha Mirza is no other place but the Kachha Sarai is supported by the native writer Najabat who calls the place Kachhi, as it is locally known. So far as Yaminabad is concerned both Lockhart and Sarkar stand corrected. It is Eminabad or Mandi Eminabad.

23. Irvine gives the figures five thousand but I have prefered the native source. The editor of War Nadir Shah reads the figure as sixty thousand, I have prefered the manuscript copy of the war (in possession of Mr. Ahmad Hussain of Qiladar) Lockhart gives the figures as 5,000 to 6,000 (Nadir Shah p. 129).

24. The Later Mughals (William Irvine) Vol. 2 p. 331.

14. If Mukhal be taken as the correct reading Behet perhaps is a mistake, it should either be Aik Nala or the river Chanab. The old track of the Aik Nala as given in Gujranwala ke Dilae ka Jughrafia (p. 18) is :

ایک۔ یہ ضلع سیالکوٹ سے اس ضلع میں آتی ہے اور پہلے پہل وزیرآباد سے ٥ میل پورب کی طرف اس میں داخل ہوتی ہے وہاں سے نارووال کا نالہ کہتے ہیں۔ تھوڑی دور آگے چل کر اس کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ ایک تو بیٹ مو جا کر پلکھو سے مل جاتی ہے۔ دوسری جس کو نڈالی والی کہتے ہیں بہت دور ضلع کے بیچ میں چلی جاتی ہے ایک تو خشک پڑی ہے اور اسرور کے کھنڈروں کے پاس سے گزر کر ضلع جھنگ میں چلی جاتی ہے۔ دوسری کا نام کھلری نالہ ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ دارا شکوہ نے شیخپورہ کے تالاب کو پانی پہونچانے کے واسطے کھدایا تھا۔

Both Aik Nala and the river Chanab pass through the area called Beet (in the Wazirabad Tahsil of the Gujranwala district). The Beet area as described by the authors of Tarikh-e-Gujranwala (p. 455) is as follows :

چک بیٹ۔ اس چک (چکلہ ؛ وحید) کے شمال دریائے چناب ملا ہوا ہے اور اوس کے البتہ دیہات بلله (؟) مفصلہ ذیل کو طراوت رہتی ہے۔ بھرام۔ رانا۔ پانوکے، تاتیوالہ، ناهرکے، رام نگر، ناتیوار، ٹھاکر پورہ، لوہری والہ، دیوان کوٹ، سہری پور، وزیر آباد خاص، بھٹی کے، تہہ فخراللہ، دھونیکے، پھالوکے، گوزالے، کوٹ جعفر، وڈالہ، کتھوهر، چک کنور، چک سر، خان کی، فقیران والی کلاں، ڈھٹھی بلوچ، برج چیمہ، هرج دھلا، گھڑی کلاں، کوٹ زہ، کوٹ بیلا، سکھوکے، سنگھ پورہ، روکھ، رام نگر، چھنی کھنا، چھنی چچاں، چھنی سانبال، چھنی جوالا، چھنی مٹو، چھنی ولی داد، چھنی موتی، مانگا، چھنی محرم، پھروپ گڑھ، کاھن گڈھ، چھنی مرید،

The contemporary Ms. of the Tuzuk-e-Jahangiri ends by the year 1021 A. H and does not contain the above extracts. (P. U. L. P. f. (iv) 4c). Sir Sayyid Ahmad Khan's printed edition has Thathar, Karchahak, Naktahala and Behat (p. 316, ed. 1864 A. D.).

15. Travels in the Mughal Empire (ed. Constable, revised by Smith) 1934 ed. pp. 383—392.

16. *Ibid*. p. 385.

17. *Cf.* N. W. R. Time and Fare Table p. 5.

18. History of Aurangzeb (Sir Jadu Nath Sarkar) ed. 1916 Vol. 3 Chap. 1 p. 14 gives the date of the departure of Aurangzeb from Lahore as the beginning of May 1663.

11. Tuzuk-e-Jahangiri p. 322, 323. *See* also p. 349 when Jahangir paid a second visit to Garjakh.

12. There are two places by this name, Garjakh a suburb of Gujranwala situated near the Islamia College, and Jalalpur. (Garjakh is the old name of Jalalpur *See* J N. Sarkar's India of Aurangzeb p 107 foot note) Sujan Rai in his Kulasat-ut-Tawrikh mentions the later while describing the course of River Jhelum (Behat). "Afterwards, passing by Mirpur and other places in the Gakkar territory, it comes below the city of Jhilum, .. in which mahal there is a highway, and gets the name of Jhilum river Thus flowing by Garjahak Zhanda, Shamsabad, Bhera, Khushab and Khurd Khana, it unites with the waters of the Chenab at Timmu (correct. Trimmu) near the town of Jhang Sialan, and gets the name of Chenab" *ibid* p 107

13 The Urdu Tr of Mot'mid Khan's Iqbal Nama-e-Jahangiri gives it as Mukhial Dr. 'Abdullah Chaghatai reads it as Makhiala (Cf his articles on the Tower of Antilope at Shaikhupura published in the Pakistan Times dated December 27, 1953) If the later view about Garjahak be taken as correct then Dr Abdullah Chaghatai's reading is to be accepted Makhiala was a mahal on the river Indus "Just below it (Attock Banaras) the Indus swept violently through a narrow channal The danger of the passage was increased by two jutting precipices of black slate, which formed a whirlpool between them. Many boats were wrecked here The name of the rock (Jalali) originated in a *bon mot* of Akbar there was a sacred lake (named Kota Chinaa?) in the mahal of Makhiala. It rivalled in sanctity the Pushkar lake of Ajmir" (India of Aurangzeb p ixxvi) The objection against this view is Why did Jahangir come from Kashmir by way of Thatta, Beramgula, Nawshehra, Chauki Hati Mahal and Bhimber? Why did he not come from the Kishanganga and ship directly to the river Behet or take the third route direct to the Indus river It is very curious that he came by the lowest route to Gujrat and then went upwards in the north to Attock and finally took up the road to Shaikhupura. If the first view about Garjahak be taken as final then the correct reading of Mukhiala is either Mukhal (a small village about 9 miles east of Gujranwala— Cf. the map of Gujranwala District published by Alen Mitchell the Deputy Commissioner, ed. 1922) or (most probably) Nadala (Nadalawala is a Chhamb (natural lake) in the Wazirabad Tehsil. The compilers of the first edition of the District Gazetteer say :

چھنب نڈالہ موسم برسات میں بشرط کثرت بارش کے دو مہینہ تک اس جگہ پانی ٹھہر جاتا ہے اور وہ پانی کلروں سے آتا ہے۔ اراضی زیر آمد چھنب ہمیشہ افتادہ ہوتی ہے۔ فصل ربیع کا تردد نہیں ہوتا۔ آبپاشی بذریعہ جھٹہ ہوتی ہے، کوھل بالفعل کوئی نہیں۔ آئندہ اپنی اپنی حد میں بنانا اوس کا بہ اختیار مالکان ہے۔ مرمت اور صفائی کی ضرورت اس کو کچھ نہیں۔ آمدنی متصرفات اس میں کسی طرح کی نہیں ہے۔ اس جگہ شکار جانوران آبی بہت میسر آتا ہے۔ اور ایام برسات پانی اس کا سڑک کامونکی کو بڑا خراب کرتا ہے۔

See also the Contract on *ibid.* pp. 259-260 endorsed on 30th January 1867.

Notes

1. Imperial Gazetteer of India Vol. 3 ed. by W W. Hunter, C I.E, LL D. 1881 ed. page 453. Gujranwala Kae dulae ka Jughrafia ed 1889 p 14. The village is also called Mian 'Ali. For further details see Tarikh-e-Makhzan-e- Panajb p 296.

2. Gujranwala kae Dilae ka Jughrafia p. 11 :

خانقاہ مسرور جس کو عام بول چال میں خانقاہ ڈوگراں بھی کہتے ھیں -

The compiler of Gujranwala District Gazetteer (Mr Lincoln) p 13 part A is obviously wrong when he calls Asrur as Masrur

3. Gujranwala District Gazetteer (ed. by Lincoln I.C S, ed. 1935 part A chaper 1.

4 Dr H R Gupta (Studies in Later Mughul History of the Punjab) ed 1934. p 175 gives this distance as 36 miles Probably he has borrowed this from Sita Ram Kohli's Maha Raja Ranjit Singh (ed 1933) p 52.

5. Gujranwala District Gazetteer A. part p 36.

6. Tarikh-e-Gujranwala (compilers Munshi Gopal Das and Ata Muhammad qanungo) ed. 1874. chap. 2 p. 17 Cf Izzat Ullah (Hamara Panjab) p 278, 279 .

کسی مستند تحریر سے مدت آبادی اس کی صحیح معلوم نہیں ھوئی - روایت ھے کہ پانچ سو برس گذرے جبکہ اس کو مسمی خان جاٹ عرف ساھنسی (کذا) نے بصورت گاؤں آباد کرکے اس کا نام خان پور ساھنی (کذا) رکھا - چنانچہ ثبوت اس کا اکثر بنالجات (کذا) محررۂ زمان سابق سے ظاھر ھے -

7. Tarikh-e-Makhzan-e-Panjab (Mufti Ghulam Sarwar of Lahore(compiled in 1285 A. H. (1868-1869 A. D) N. K. Press p. 264. Gujranwala District Gazetteer part A.

8. Tarikh-e-Gujranwala p. 415

اس مکان کا نام سرائے ھے اور مسجد کہ (کے پاس؟) اسجگہ نادر شاہ کے وقت سرائے تھی سراء ویران ھوکر صرف یہ مسجد باقی رہ گئی -

9. The hexagonal minerates are a later addition. The compilers of Tarikh-e-Gujranwala attribute the construction of the mosque to the days of the Great Mughuls (*See* p. 415).

10. "Studies in Indo Muslim History—A critical commentary on Elliot and Dowson's History of India" (S. H. Hodivala) ed. 1939 pp. 693, 694.

been very unkind and unsympathatic in so far as the preservation of old monuments is concerned. To quote one example, all the Samads situated in the Sheranwala garden have been dismantelled by the municipal authorities on one pretex or the other.

"No man means evil but the devil, and we shall know him by his horns."

Shakespeare Merry wives of Windsor, v, 2, 12).

place to comparatively settled conditions (during 1948-49). A sizeable portion of the allottees were settling down in their new surroundings and situations. The misfits and misplaced occupiers of industrial undertakings were shifting from place to place. Quite a number of concerns were in a state of neglect and dissertion. Some of the premises continued looted, close down and illkept position. Stray cases of pilfering of machinery persistently occured during the period. A large number of evacuee industrial buildings were badly in repairs Refugees businessmen who meant business, were often noted making frantic effort to get fixed up some way or other. In the process of settlement there were so many hurdles to be crossed, hinderances to be overcome and difficulties to be surmounted. Most of the refugees seem to be straggering under the load of difficulties of the new world in which circumstances had thrown them. Inspite of efforting for a year and well over a quarter, industrial refugees were still illequiped, poorly financed and housed. The disappearence of some full branches of non-Muslim Banks as a result of partition, decreased the investment capital, in the industry and trade to a very great extent. The shortage of capital was talked and complained of almost at every stage. By the close of 1949, things settled down slowly and steadily. Refugees began to take intrest in their new undertakings and surrroundings. As the time passed they were having a better sense of security and stability, although a large number were continued to be in a state of insecurity, un-settlement and indicision." (68).

The industrial position of the city has considerably deteriorated. The condition of sanitation, which had been severely criticised by the compilers of the Imperial Gazetteer in 1888, has also gone from bad to worse.

The historical monuments, to say the least, are woefully neglected. The city fathers are careless and the archaelogical department is negligent in its duties. The Samad of Charat Singh, the Palace of Mahan Singh and certain other important buildings of the Sikh era are crumbling very rapidly. The recent move of handing over the only protected monument of the city, the Baradari, to the Municipal Committee can not be appreciated in the light of the fact that the municipal authorities have

The third phase begins with the year 1947 A. D. All the Sikh inhabitants and most of the Hindus left the city and their place was taken up by refugees from East Punjab "Judged from the strength of population Gujranwala with a population of 1,20,830 persons stands seventh in the towns of Pakistan according to 1951 census" (67) Mr Sabir Husain in his excellent monograph "An Industrial Survey of Gujranwala " has very efficiently depicted the industrial position of the city in the following words :—

> "Gujranwala occupies a fairly central position in the province and is connected with Lahore, Sheikhupura, Sialkot and Gujrat. It has gradually and surely established itself as an important cloth market for Northern Districts of the Punjab and the Frontier Provinces Even in the Pre-partition days its position as a cloth market was next to Amritsar It is also the biggest market for metal wares in Pakistan This centre only meets the requirements of the country with regard to utencils (utensils), but it also extends its market to consumers in Afghanistan. Afghanistan, inspite of export restriction, is still consuming a substantial amount of these wares If the fate of Kashmir is settled in favour of Pakistan Gujranwala market will hold a key position in the economies of the land, meeting most of their requirements In prepartition days, Gujranwala, used to be the first resort of traders community for their supplies, being the first approachable market by road The main manufacturing industries in the area v i. z utensil making, Brass cocks, Cabinet Safes and Almira Making, Agriculture Implements, Guns, Cutlery, Rubber goods, Tanning, Hoisery, Carpet making etc., received a severe blow as a result of Partition. Their economies were shocked, their markets lost or severely curtailed, stocks and supplies of essential raw materials alarmingly depleted, plants and machinery out of gear, trained workers dispursed. The general business and trade conditions during this period remianed slack. This disgorged evacuee undertakings could not be properly put into gear. Commercial life had not come to complete normality. The very high and runaway prices of the necessaries and elementary requirements of life, had reduced purchasing power of the community at large. There was also sacrcity of food grains and food stuffs. The unsettled conditions of the early Pakistan period were giving

became an approver), traders, etc. After due enquiry they were sent up for trial before a tribunal of three Civil Judges, two British and one Indian. The President was a Judge of the Punjab High Court

Eight of these leaders were eventually convicted of rebellion, conspiracy to wage war, commit arson, etc , and sentenced to various terms of transporation or imprisonment By that time I had left the province. My successor considerably reduced the sentences a few months after , but six months later, in December, 1919, all got the benefit of the general amnesty advised by Mr Montague to create a favourable atmosphere for his Reforms Scheme which had just gone through Parliament This premature clemency, as might have been expected, completelty failed to produce the hoped for result The amnestied criminals of Gujranwala, as of Lahore, Amritsar, etc posed as martyrs, became hoeroes among the seditious element, and hastened to prove themselves more hostile than ever to the Government which had snown itself so lenient Hence it happened that in Gujranwala these "martyrs" soon got control of local politics , for in the local view who could stand up against men of whom the once powerful British Government had shown itself to be afraid ? One of them became President and another Secretary of the Municipal Committee. They marked their displeasure with me by passing a solemn resolution that the "O'Dwyer Gate" was to be called by a less odious name, and that my photograph was no longer to darken the walls of Municipal Hall , I believe the then Deputy Commissioner, O'Brien, came in for similar censure, and I trust he has survived it

When, after leaving India I came to know of the action of the Municipal Committee, I asked the then Deputy Commissioner to convey to them my acknowledgments for having anticipated my wish that my name should not continue to be in any way associated with a city that had disgraced itself by rebellion and outrage.

By my goodwill to and friendship with the landed gentry and sturdy peasantry of the district, who with few exceptions, proved themselves loyal and law-abiding, are still maintained ; and now and again I am in a position to help and advise the sons and grandsons of my old friends, who come to England for study or training.

The "O'Dwyer gate, after a chequered existence of a quarter of a century, has ceased to exist. But it has served, I hope, to "point a moral and adorn a tale". The moral remains." (66).

The conspirators had chosen their time well, and the two British police officers with the small force of armed Indian police at their disposal were unable to check the sudden rising The Indian Magistrate in charge, a very worthy man but unused to responsibility, would not authorise the police to fire till the rebellious mobs had got complete mastery of the situation, and then the firing only further enraged them Fortunately, the few English women and children had been hastily collected in the fortified treasury building, and the large American Mission colony had hastily left the night before, after being warned of the impending trouble by some of their Indian co-workers About 1 p m at Lahore, forty miles off, on the top of reports of rebellious outbreaks at half a dozen places in the Central Punjab, I got word of the situation at Gujranwala in a telegram from the Indian Magistrate dispatched from a station eight miles out. He added that the police force was inadequate and that military arrangements were necessary. Knowing that at Amritsar and Kasur a few days before similar mobs had murdered every European they could lay hands on, I realised the danger to the small British community at Gujranwala, and at once asked the general (Sir William Beynon) at Lahore cantonment to send troops. He said he had none to send and, even if he had, could not get them there in time I then suggested he should send an aeroplane—a few had fortunately arrived two or three days before—to try and save the situation by bombing the rebellious mobs engaged in arson and outrage.

An aeroplane was at once dispatched and arrived in the nick of the time, when the police (who had, under the fearless direction of their Superintendent, Mr Heron, made a gallant effort to cope with the situation) were worn out by their efforts and the rebels were attacking the jail and threatening the Treasury building in which English women and children had taken refuge Eight bombs were dropped, four exploded, some twelve or sixteen of the crowd, including unfortunately a few boys who had no business to be there, were killed The mobs at once dispersed and the situation was saved That was at 3 p m Some troops from the North arrived at 10 o'clock that night Lieutenant-Colonel O'Brien, the late Deputy Commissioner, who had been hurriedly recalled and sent back by me that after noon, then took charge of the situation. Next day eighteen of the ringleaders of the rebellious movement were arrested. They included many prominent agitators of the Hindu intelligentsia class, legal practitioners (including two barristers, one of whom

young wife said to have been poisoned by a superseded rival. There was a pleasant garden, a tennis court, and ample accommodation for my dozen servants. There was also stabling for a dozen horses. But I limited myself to half a dozen. (64)" In 1894 A. D. he was put incharge of the district as well. (65) "Work in the district," he says, was so absorbing that it left little leisure for mixing closely with the people of Gujranwala, the headquarters town, or of the other towns of the district

.... .Among other offices I held was the Persident of the Municipal Committee, and I had often to hold the scales between the Hindus and the Muhammadan elements which were pretty evenly balanced. This fact leads to my story.

Gujranwala is a walled city with gates, and while I was away on short leave in 1894, the Municipal Committee thought they would pay me a compliment by naming a new gate after me. On my return I was confronted with the *fait accompli*, which I did not want, but which it would have been churlish to disavow The "O'Dwyer Gate" was in a prominent place close and facing the railway station It was the occasion of a good deal of banter from my European friends. However, I left Gujranwala in 1895 and the Punjab in 1897, not returning till 1913. Meantime municipal interest in the "O'Dwyer gate" languished, and it gradually sank into a state of dilapidation and decay, which my friends did not fail to chaff me about

When my appointment as Lieutenant-Governor of the Punjab was notified in 1913, the fathers became suddenly alive to the evil conditon of the gate, hastily rebuilt it on more pretentious lines, and worthily maintained it all the time I was in the province.

Unfortunately in April, 1919, a seditious section of the urban folk in Gujranwala and various other towns, inspired by the example of Amritsar and Lahore, drifted into rebellion. One fine morning, 14th April, 1919, seditious mobs in Gujranwala, strirred up by men of influence, who kept in the background, set on fire the railway station, goods shed (with property valued at £50,000), Post office, Judicial and Revenue Buildings, the English Church, all the other Government building within their reach. They also set on fire the railway bridges on both sides and cut the telegraph and telephone wires thus for a time completely isolating the city and rendering prompt military aid impossible. There was no British Magistrate on the spot.

thrown in, and the treasure was sent in to Lahore Recruits were called for from the people, and they eagerly thronged in. During six months about 700 men were raised From this body large drafts were made into three Punjab regiments ; 250 remained on duty at the station . 100 were sent down as police men to the north western provinces , and even while under training the whole body was used as ferry guard. Jail guards, and escorts Early in July the Deputy Commissioner hastend away to Gujrat, 35 miles off, on the news of the Jhelum mutiny There he mounted his 100 men on camels, and went away an other Journey of another 35 miles on the very bank of the Jhelum He learnt there that the Jhelum mutiny had ended, and on his hasty march back he was informed that a formidable one had broken out at Sialkot, only 35 miles from his own station He hurried back to Gujranwala, but found to his satisfaction that it had not been threatened, the men having gone a different way In the end of September, Captain Cripps was called to traverse the southern part of his district which abuts on the bar, as the Kharals had risen, and might be expected to attack some larger towns under this jurisdiction. Again a forced march brought a body of the Sikh levies under his personal command to the suspected districts , and the people, if they had any evil intentions, were overawed Order continued to reign throughout the territory In October, Colonel Clarke took charge of the district, and Captain Cripps was transferred to Ferozepore on the appointment of Major Marsden to Gugera. The people of Gujranwala seemed to have been very well affected through out. and the six percent loan gained considerable accessions from the moneyed men of the country towns." (63*b*)

Another event of great importance was the agitation of 1919 A D. The story has very succintly been described by Mr Lincoln in the new edition of the District Gazetter A more reliable account, from the British point of view, is to be met with in "India as I knew it" (1885-1925) by Sir Michael O'Dwyer (1925 ed chap 4 page 51—72) O'Dwyer came to Gujranwala in 1889 as the Settlement Officer He says, "I found myself, at twenty five, in independent charge of the settlement of a district with an area of some three thousand square miles, and a population approaching three quarters of a million I had a house of my own, the historic Baradari (twelve doors) once the residence of the great Sikh General-Hari Singh Nalva-and, as I discovered later, still haunted by the ghost of a favourite

اراضی اس کی بلحاظ قصبہ زیر ملکیت اقوام مختلف ہے، مگر زیادہ تر زمینداران ساھنسی مالک ھیں -

Mufti Ghulam Sarwar of Lahore says : (63) ·

جب پنجاب میں علمداری انگریزی ہوگئی تو بعہد ڈپٹی کمشنری کرنیل کلارک صاحب بجائے حویلی مہاں سنگھ کے ایک بازار مربع تیار ہوکر رنجیت گنج نام رکھا گیا اور مسٹر ارتھر برنڈرب صاحب نے دروازہ کنھیالی والا و لاھوری دروازہ و دروازہ سیالکوٹ والا ازسرنو تعمیر کرائے اور بجانب شمال قصبہ کے بہت سی آبادی بڑھ گئی - مگر شہر پناہ آج تک نہیں بنا اور سوائے دروازہ کے اور راستہ (کذا) بھی آمد و رفت کے ھیں -

An event of importance in the history of Gujranwala was the up heavel of 1957

"The events of the mutiny, though their effect on the district were slight, had however a considerable indirect effect in strengthening our rule and in reconciling and binding up with it the Sikh population whose attitude towards the annexation of the Panjab had been one of sullen acquiescence." So says the compiler of Gujranwala District Gazetteer of 1893-94. He gives the following account of the events of 1857 from the Punjab Mutiny Report :—

> Gujranwala is a little civil station on the high road from Lahore to Peshawar. As in all other places the Deputy Commissioner was burdened with a body of mutinous soldiers as his treasury guard. In this case the men were of the 46th Native Infantry ; they were quickly got rid of by an order to them to rejoin their corps at Sialkot. This was obeyed. Its operation left captain Cripps, officiating Deputy Commissioner, with 7 horsemen and 35 footpolice to defend three Europeon officers, 2,00,000 Rupees of Government treasure, and a jail full of convicts. This state of things could not last, especially as the treasury was in an insecure building, and could not be held, as it possessed no wall. The station might be attacked either by the three native regiments from Sialkot or by the four native regiments from Lahore. It lay between the two places, and junction of the mutinous brigades might reasonably be expected. To avert danger as for as possible, an old tomb and its circumjacent garden were fortified, provisions were

from November, 1865 to December, 1865) Their services have been euloguized by the compilers of the first edition of the District Gazetteer in the following words (59) :

خصوص جب سے مابحت حکومت سرکار دولت مدار انگریزی ہوا ہے
رونق و آسائش اس کی روز افروں ہے۔ بعہد ڈپٹی کمسری کرنیل کلارک صاحب بہادر
بجائے حویلی مہاں سگھ، حس کا ذکر صدر میں مندرج ہے، بازار مربع طیار
ہوکر اوس کا نام رنجیت گنج رکھا گیا۔ وھاں واسطے خرید و فروخت غلہ
وغیرہ اجناس کی منڈی مقرر ہے (٦٠) اور مسٹر آرتھر براندرث صاحب بہادر
ڈپٹی کمشنر کی توجہ اس کی آباد پر بخرح آئی۔ دروازہ کھیالی والہ و دروازہ لاھوری
و دروازہ سیالکوٹ بعمارت عمدہ طیار کرائے۔ اون کے زمانہ میں بجانب شمال
قصبہ ھذا زیادہ تر خانہ جات دو آباد ھوئے۔ اب ایک شہر دلچسپ ہے۔ مگر شہر پناہ
نہیں رکھتا۔ دروازوں کے سوا کئی راہ سے اوس کے باسندگاں کو آمد و رفت حاصل ہے
اس میں ایک قلعہ خام بنوایا ھوا سردار ھری سگھ نلوہ کا موجود تھا (٦١)، جس میں
اوس کے مرنے کے بعد مسمات دیساں زوجہ اوس کی ارجن سگھ اپنے بیٹے کو لے کر
محصور ھوگئی تھی اور اوس کو بموجب اطلاع دھی جواھر سنگھ خلف
سردار ھری سگھ کے مہاراجہ کھڑک سگھ نے بزور توپ تفنگ قلعہ سے نکال
کر قصبہ ستراہ متعلقہ ضلع سیالکوٹ میں بھیج دیا اور قلعہ ویران کر دیا اور
کوئی جنگ نامی اس جگہ میں کسی حاکم کو پیش نہیں آیا۔ آبادی میں
جس کا نام اندرونی شہر ہے زمینداران ساھنسی، جس میں سے اب مسمی اروڑا
ذیلداری کے عہدے سے ممتاز ہے، قدیمی میں اور آبادیٔ جدید میں اقوام
متفرق ھنود و مسلمان اطراف سے ضلع گورداسپور تک آکر سکونت پذیر ھوئے۔
اس قصبہ میں عہد چڑت سگھ سے اب تک غلبہ قوم ھندو کا ہے۔ اوس میں
اکثر لوگ مالدار اور ساھوکار ھیں اور مسلمانوں سے سوائے فضیلت علمی مولوی
سراج الدین کے کسی کی ریاست اور لائق لائق ذکر نہیں۔ قریب تیس مسجد
کے اس میں موجود ھیں، مگر تازہ کسی کی عمارت قابل ذکر نہیں۔ اسی طرح
شوالہ اور ٹھاکر دروازہ بھی بہت ھیں۔ لیکن منڈی رنجیت گنج کے متصل ٹھاکردوارہ
بنا کردہ تیج سنگھ عمارت عمدہ رکھتا ہے اور باغات کی کثرت نہیں۔ (٦٢)....

grately to magnify their value. Our satation for to-night was only six kos from Guseraoli ; I had therefore time enough to see the garden and house which was formely the residence of Ranjit Singh, but it contains nothing remarkable ; except a small, building erected over the spot, where the remains of his father Maha Singh were burnt, and another over thexashes of his mother.

Not far from Guseraoli, I was met by Juni Lal, the same Brahmin from Delhi who had accompanied Burnes, and was now sent to me by the Maha Raja. Two elephants with rich housings and silver howdahs, and thirty men on horse back, attended him. On my approach they saluted me with military honours, and two trumpeters struck up, " God save the king ". The large tent of General Ventura was pitched at a small place called Kamuki".

The second stage in the history of the city came when the British occupied the Panjab in 1849 A. D In 1855 A. D. Col. Sage Superintending Engineer was deputed by the government to find out the causes of the deterioration of the G. T. Road which was then being managed by the Military Board. As a result of these enquiries the Board gave place to a new department called the Public Works Department (P. W. D) (49). The new metalled G. T. road was completed in 1863-64 (50) The town flourished greatly when it was made the headquarter of the district in 1851-52 A. D. (51). The railway line was also laid in 1873 with a metre gauge near the G. T. Road. Later on it was removed from the old track and was laid at a distance of a hundred yards in 1881 A. D. (52). The city was soon converted into an industrial town and its inhabitants increased in numbers in the subsequent years (53). In 1868-69 the total population was 17,381 (54), in 1874 it reached 19,381 (55), in 1881 A. D. it further rose to 20,215 (56), in 1889 A. D. to about 23,000 (57), in 1893-94 to 25,892 (57b) and in 1916 to 29,472 (58). From the British occupation of the Panjab (1849) to 1874 A. D. more than 20 Deputy Commissioners were posted one after the other (For a complete list see Tarikh-e-Gujranwala page 433. The compiler of the 1893-94 ed. of the Gazetteer has brought the list to 1894 *see* page) Mr. Carnak was the first to be appointed as such. He served as the Deputy Commissioner from May, 1849 to October, 1949.

Two Deputy Commissioners need the mentioned here for their keen interest in the city and its people : Col. Clark (November, 1851 to February, 1856, and again from October 1857 to February 1858) and Mr. Brendreth (11th May, 1864 to the end of May, 1865 A. D. and again

and finer, here called the Santreh orange ; Hari Singh has also transported the plane-tree from Kashmir, which seems to flourish exceedingly well in its new locality An odour almost overwhelming ascended from the jonquils, which were in immence abundence, and of an incredibly large size. Nothing, in fact, could be more carefully adorned with lovely flowers and plants of various kinds, than this garden, which evidently formed one of the chief delights, and sometimes the occupation of its owner · it reminded me of my own at home As I approached the terrace where I saw luxurious carpets spread, Hari Singh came to meet me, with a present, consisting of twenty-five plates of sweetmeats, and a dozen baskets of fruit, and I tasted some of the former, and found them very good He then conducted me over the palace, every room of which was hung and covered with the richest carpets of Kashmir and Kabul, a sight promising comfort and repose, and most inviting in this cool season When I mentioned the cold of the last few days, he immediately ordered two portable stoves to be taken to my apartment (48). What is very rare among the Sikhs (is that) he (Hari Singh) can both read and write Persian language

As my stores had not arrived at Guserauli, I was very glad to accept Hari Singh's offer of providing us with a dinner, which both Vigne and myself despatched with an excellent appetite

Saturday, January 9 The warmth of the rooms procured me the great comfort and rest last night, and for the first time for a very long period, I would have indulged myself with more sleep. While the carriage was being packed, I strolled out into a part of the garden which I had not yet visited, and wondered at the variety of little buildings scattered about it ; one of these called San Padre is in the form of a square with one side open, and a fountain in the middle, which falls into a broad thick sheet of water. In the three walls I observed several niches for lamps.

I wished to take leave of Hari Singh, and thank him for his kind reception of us , and on enquiring for him, was conducted to the terrace, where he was seated in the sun, having caught a cold and slight fever. He was able, notwithstanding, to keep up a very lively conversation, and put up a variety of questions. He had all my answers taken down on paper. On my departure, he presented me with a beautiful Khilat, accepting in return some trifles as a remembrence of me. He was pleased

والوں کو اجازت دی کہ وہاں سے آ کر اس قصبے میں آباد ہوں۔ چنانچہ وہ سب کے سب یہاں آ کر آباد ہوگئے کہ اب تک ایک حصہ قصبہ کا اون کے نام سے مشہور ہے۔ جس کو باہر کا شہر کہتے ہیں ۔ مہان سنگھ کے وقت زمینداران قوم گوجر بھی یہاں سے بے دخل ہو کر نکل گئی ۔ مگر نام میں کچھ تغیر و تبدل نہ ہوا ۔ پھر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وقت یہ قصبہ زیادہ تر آباد ہوگیا ۔ اور سندھو کھتری نے موضع مذاکہ (ندا) ضلع سیالکوٹ سے آ کر ایک کٹڑہ یہاں بسایا ۔ پھر سردار دیسا سنگھ نے ایک کٹڑہ بنایا اور ایک سردار ہری سنگھ نلوہ نے آباد کیا ۔ اور ایک عالی شان حویلی تعمیر کی ۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ، باوجودیکہ اوس کا مسکن و مولد یہی قصبہ تھا ، اس کی ترقی پر پھر کچھ توجہ نہ کی ۔ لاہور میں قیام پذیر ہو کر اس شہر کو بھول گیا ۔ البتہ بجانب شرق اس کے باغ کی دیوار پختہ بنوائی اور اوس میں بارہ دری عمدہ تعمیر کی ۔ سمادھ مہان سنگھ کی بھی اس باغ میں ہے ۔ (اب بھی کہنا چاہئیے ایک دو سال ہوئے گرادی گئی : وحید) اور قصبے سے بجانب غرب چڑت سنگھ کی سمادھ ہے ۔

Hugel (47) while passing through Gujranwala on Friday 8th, January, 1836 says .

" We soon get used to luxury , and in this delightful English carriage I could fancy myself, if not in Europe, at least very near it, and forget that I have ever travelled by less comfortable conveyance.

The distance to Guseraoli is reckoned twelve kos, about twenty miles · the country is poorly cultivated This is one of the possessions of Hari Singh Nalwa, commander-in-chief of all the Maha Raja's troops, the French legion alone excepted Originally it was the property of Ranjit Singh's family, which can be traced no further back than to his grandfather, Charat Singh the decendant of a common trooper, or Dharwari. Hari Singh Nalwa has a palace and garden in Guseraoli which are protected by a mud fort. As we drew near the town, a troop of horse was deputed to escort me ; and presently the Dewan rode up, mounted on an elephant. The splendour of the rooms in the palace did not excite my admiration nearly so much as the garden, which was the most beautiful and best kept I had seen in India. The trees were loaded with oranges, of the same kind known in China as Mandarin oranges, but much larger

بسایا اب تک ایک حصہ اس قصبہ کا اون کے نام سے منسوب و مشہور ہے۔ ۲
جس کو باھرلہ شہر بھی کہتے ہیں اور زمینداران گوجر، اگرچہ اس وقت
مغلوب ہو کر بے قبضہ ہو گئے ہوئے، لیکن اس کے نام میں کچھ تغیر و تبدل
کا اثر نہ ہوا (۲۰)۔ بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ کی عملداری میں یہ قصبہ
دوبارہ پر آباد ہوا۔ پہلے سے بھی خوبصورتی سے موضع دیالہ سدھوان (آجکل وڈالہ
سدھوان) ضلع سیالکوٹ سے آ کر ایک سردار جس کا نام سردار دسا سنگھ نے بھی
ایک کٹڑہ بنوایا اور سردار ہری سنگھ جو جاگیردار تھا اوس نے اوس کو
عمارات عمدہ سے رونق دی۔ ایک دربار [illegible] بنایا اور ایک ایسی حویلی بنوائی جو
حویلی عمارت سے اب تک لاہور [illegible] کرنے کے ہے۔ مگر افسوس ہے کہ خود
مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے عمارت عمدہ سے کچھ توجہ اس کی آرائش کی طرف
مبذول نہیں کی۔ موجودہ کہ اوس [illegible] و مسکن بھی قصبہ ہے۔ البتہ بجانب شرق
اس کے ایک باغ کی دیوار پختہ بنوائی تھی اور اس کے درمیان میں ایک بارہ دری
تھی، جو اب [illegible] سرسبزی ہے، [illegible]۔ دیوار باغ کی بعمارت خام
مہاں سنگھ کے عہد سے تھی۔ اوس کے حب وطن کی دلیل صرف یہ ہے کہ
اس کے باشندوں کو ضرور اچھا جانتا تھا۔ مہاں سنگھ کی سمادھ
اوسی باغ میں ہے جس پر [illegible] ہے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھ
اصلی اگرچہ لاہور میں ہے مگر اوس کے باپ کی سمادھ کے پاس اس جگہ ایک
سمادھ اوس کی بھی موجود ہے۔ جس کا ارتفاع تخمینا ۹۰ فٹ ہوگا (۳۰) اور
قصبہ ہذا سے بجانب غرب حرب سنگھ کی سمادھ بھی ہے۔ تخمیناً چھ سو روپیہ
کی جاگیر بھی متعلق سمادھ مہاراجہ رنجیت سنگھ ہے۔ یہ قصبہ چڑت سنگھ کے
عہد سے روز بروز آبادی کی ترقی دیکھتا رہا۔

Mufti Ghulam Sarwar (46) —

(چڑت سنگھ نے یہاں) سکونت اختیار کی اور حویلی پختہ وسیع بنوائی۔ قصبہ کے
گرد بھی شہر پناہ بنوایا جس کو اندر کا شہر کہتے ہیں۔ جب وہ
مر گیا تو اس کا لڑکا مہاں سنگھ جانشین ہوا۔ اوس نے اس گاؤں کو ایسا
آباد کیا کہ ایک قصبہ خوشنما بن گیا۔ اپنے باپ کی حویلی کے پاس اوس نے
پختہ مکان کچہری کا بنوایا اور قصبہ سید نگر کو ویران کرکے وہاں کے رہنے

accept the view that it is from the Gujjars (Jats) that the city got its name. This assertion is backed by tradition as well. Haji Muhammad Ismail, whose grand-father settled in this city on the explicit desire of Charat Singh, tells me that the habitation of the city (Gujranwala) started from the area inside the Khiali Gate where the Gujjar Jats have had their dwellings. They had a well there. This was named after them. Charat Singh conquered this place and the Gujjar Jats were made to flee. There is a discrepency in the local tradition and recorded history. According to Haji Sahib the Gujjar Jats were beaten and they left Gujranwala immediately after the attack. Mufti Ghulam Sarwar and Gupal Das say that the Jats of Bari Khan family had started plundering the villages in this area. Eventually they were defeated by Charat Singh. Thus Charat Singh became the overlord of Gujranwala. During the reign of his son and successor Mahan Singh the Jats of the Gujjar clan shifted from this place (41).

Charat Singh set up his own Haveli near the well of the Gujjars and the city started prospering. It developed in three successive stages —

1. Under Charat Singh, Mahan Singh and Ranjit Singh, 1758—1849.
2. Under the British rule, 1849—1947.
3. After the 'partition' 1947—1957.

The story of the first phase of its habitation has very efficiently been told by Ata Muhammad Qanungo, Mufti Ghulam Sarwar and Hugel. The relevant portions of their accounts are

Ata Muhammad says (42) . -

(چڑت سنگھ نے) ۱۷۶۵ء میں اس قصبہ میں آ کر مقام کیا اور کچی سرائے واقعہ قصبہ هذا کو اوکھاڑ کر اوس کے مصالحہ سے اور گنوں سے بجانب شمال کوٹ سے باهر ایک پخته حویلی بهت وسیع تیار کرائی اور حصار شهر طیار کرائے اوس میں اکثر لوگوں کو آباد کیا جس کو اب اندرله شهر کہا جاتا هے۔ اوس کے پیچھے مہاں سنگھ اوس کا دلاور بیٹا جانشین هو کر اوس کی راه و رسم پر جلنے لگا (۴۳)۔ اوس نے اس گنوں کو ایسا آباد کیا که قصبه خوشنما هوگیا۔ اپنے باپ کی حویلی کے پاس واسطے کچهری کے منڈی پخته بنوائی اور قصبه سید نگر کو ویران کر کے وهاں کے باشندوں کو اس جگه لا کر

pelled 18 generations ago by Sansi Jats, immigrants from Amritsar, who founded 11 villages in this vacinity. The founder of Gujranwala was one Khan, who gave it the name of Khanpur, but the old name survived the change of owners and became stereotyped"

Hafiz Abdul Haq, the author of Tarikh-e-Gujran (1931 A D) says (36).

گوجر (گوالے) قوم کے نام سے علاقے موسوم ھیں... ... مثلاً گجرات، پنجاب، گوجر گدھ، گوجر خاں، گوجرانوالہ شہر و علاقے اس کے نام سے موسوم (کذا) ھیں۔

K. S. Moulvi Abdul Malik the Author of Shahah-e-Gujjran (1934) says (37).

کئی اضلاع انہیں گوجروں کے نام سے موسوم کئے جاتے ھیں۔ مثلاً دوآبہ رچنا میں گوجرانوالہ .. ...

At an other place he further adds (38) ·

تحقیق سے معلوم ھوا کہ جہاں گوجرانوالہ شہر آباد ہے۔ وھاں ایک چوھدری گوجر کا کنواں تھا جس کے مواشی کی ایک وسیع چراگاہ تھی۔ اس وجہ سے اس کنوئیں کا نام گوجرانوالہ ھوگیا۔

Izzat Ullah (1946 ?) says (39) :

روایت ہے کہ.... ...مسمی خان جٹ عرف ساھی (کذا) نے بصورت گاؤں آباد کرکے نام اس کا خان پور ساھنی (کذا) رکھا تھا........اس کے بعد کسی سبب سے قوم جٹ عرف گوجر سے کئی اشخاص آ کر دخیل ملکیت ھوئے۔ انہوں نے ایسا غلبہ پایا کہ یہ قصبہ باسم گوجرانوالہ موسوم ھوا۔

So there are two views about the origin of Gujranwala · the one traces its etymology from the Gujjars (milk-men) and the other from the Gujjars (Jats). The first view can be objected on two grounds. Firstly, the Gujjars (milk-men) have never been in plenty in Gujranwala (40). Their number has only recently increased to a reasonable figure. Secondly, we the inhabitants of this city, have two sounds of the letter Gaf.——— the soft letter and the hard letter We pronounce Gujranwala with the soft one. The word Gujjar (milk-men) is pronounced with a hard Gaf and Gujjar (Jat) with a soft Gaf. Therefore it is not unreasonable to

جب سلطنت دھلی کی ضعیف ہوگئی اور ملک پنجاب لاوارث متصور ہوکر
رہ زنی کا میدان بن گیا ، اوس وقت زمینداران کوٹ باری خان نے تاخت و تاراج
کا ھاتھ اس نواح میں دراز کیا ۔ اس واسطے زمینداران موضع کھیالی ، جو
قصبہ ھذا سے دو کوس بجانب جنوب آباد ھے ، چڑت سنگھ مہاراجہ رنجیت سنگھ
کے دادا کو ، جو بنواح موضع راجہ ساھنسی متعلقہ ضلع امرتسر بہ جمعیت پندرہ
سولہ سوار ایک قزاق زبردست تھا ، بحمایت خود اپنے موضع میں لائے اور اوسکی
پناہ میں چندے دست اندازی غنیموں سے محفوظ رھے ۔ لیکن تھوڑے عرصے میں
دینے چارہ اسپان وغیرہ تکالیف اوسکے متعلقان سے بجان تنگ ہوئے ۔ اوس نے ان
کا گھیرانا واجبی سمجھ کر ۱۷۶۵ء میں اس قصبہ میں آکر مقام کیا ۔

Mufti Ghulam Sarwar of Lahore (1868-1869 A D) says (34) :

بعد مرور کسی قدر عرصہ کے قوم جاٹ عرف گوجر اس گاؤں میں قابض و دخیل
ہوگئی اور بانی (خان ؛ جاٹ) کی اولاد بالکل بے دخل ھوگئی ۔ گوجروں نے
اس کا نام بدل کر گوجرانوالہ رکھا ۔ جب سلطنت حغتائی کمزور ہوگئی اور
پنجاب کا ملک لاوارث متصور ہوکر رہزنی اور غارت گری کا میدان بن گیا ۔ اسی وقت
زمینداران گوب بازی خان (کذا) چند بار اس آبادی کے غارت کرنے پر مستعد
ہوئے ۔ اس واسطے زمینداران کھیالی جو اس قصبہ سے بفاصلہ دو کوس آباد
ھے چڑت سنگھ ساھنسی. . . . کو جو بنواح موضع راجہ ساھنسی ضلع امرتسر ایک
زبردست قزاق مشہور تھا اپنی حمایت پر لے آئے ۔ اوس نے اس قصبہ کو مقام
موقع تصور کر کر یہاں سکونت اختیار کی ۔

The compilers of Gujranwala Ke Dilae Ka Jughrafia (1889 A. D.) say (35) :

اس شہر کو گوجروں نے بسایا ھے ۔ اسی لئے اس کا نام گوجرانوالا ھے ۔ پہلے
پہل یہ چھوٹا سا گاؤں تھا ۔

The compiler of the Gazetteer of the Gujranwala District (1895) says (35b) :—

"Properly speaking, the town of Gujranwala traces its origins to a tribe called Gujars. These were nomades or cattle-grazers like some of the present tribes in the Bar. They were ex-

After Nadir's catastrophy Sarai Kachi again sank in to oblivion In 1774 A.D after Ahmad Shah Abdali's invasions and the rise to power of Charat Singh this territory at once emerged out into prominance

The territory over which the city of Gujranwala now extends was covered by four small villages at the time of the Abdali's invasion –

1. Sarai Kacha situated in the Kachi area
2. Sarai Kamboh where Charat Singh constructed a mud fort in 1758 (26).
3. Thatta, a village situated between the Railway line and the G. T road near the temple in the Kachi area (27).
4. Gujranwala or the Sarai Gujran on the high ground inside the Khiali Gate (28)

Gujranwala and the Sarai Kacha have been mentioned by the historians of the Later Mughul Period in connection with the stages lying between Lahore and Kabul (29) Chaterman's Chahar Gulshan (written in 1759 and arranged in 1789) gives the following stages and ignores both Sarai Kacha and Gujranwala (30)

" Shahdara-Jauahri Pul (probably " Pool Shah Daula ") Eminabad-Hakimabadpur-Gakhar Cheemah-Wazirabad-Gujrat "

While Tieffanthaler gives the following (31)

Lahore-Firuzabad-Pool-i-Shah Daula-Eminabad-Cutcha Sarai (32). Ghakhar Chima-Wazirabad

No distinction is generally made during this period between Sarai Kacha, Sarai Kamboh, and Gujranwala The only author who is clear about Sarai Kacha and Sarai Gujran as two different places is Jafar Shamlu. As these three villages lay with in the radius of two miles, the confusion in the minds of most of the writers was unavoidable.

The natural question arises from where did this village get its name ? Historians have variously interpreted its etymology The compilers of Tarikh-e-Gujranwala (1874 A D) tell us (33) —

اوس کے بعد کسی سبب سے قوم جٹ عرف گوجر سے کئی اشخاص آکر دخیل ملکیت ہوگئے - اونہوں نے ایسا غلبہ پایا کہ یہ قصبہ باسم گوجرانوالہ موسوم ہوا - قوم ساھنسی بھی اکثر لوگ زمیداری کرتے رہے، مگر کم زور تھے

تے سٹھ (کذا) ہزار سوار دا وچ کوھاں دے تاناں

بادشاہی گرداں ویکھ کے ٹنگو کرلاناں

اوس اچن چیتے ڈٹھیاں اوہ شکل نتھاناں

مرزے ملدر بیگ دا وچ کچی دے دھاناں

نے مرزا کہے سپاہ نوں ، اک سجی ساناں

یارو ایہا جیے سپھٹ اصیدا پڑ جھد نہ جاناں

آ کہاں سوھباں نال گواھاں وچ شک نہ آناں

سورمے نے سجی شہد دا بھسٹ ٹھکاناں

سسر نہاوے سورماں کر سدھے باناں

سچ جرے نے نکھتر یھدیاں ہتھ پکڑ کماناں

اوہ جا کھلے مداں وچ حیاؤں سراناں

نے چھڈن دیر منہ اناں وانگ سڑ گھتی باتڑا ۔

اوہے جیھس بندوقاں کاڑ کڑ کے کٹ اڑاناں

حودس اک لگی سی ناڑنوں نوں بھجن دھاناں

جوس جنڑیں شرابی پھرس نوں باہنہ دے سرھاناں

کھیڈ سیے نے ہولی لاجیوب کر سوھا بھاناں

پھیرو سو منہ جبول دا کر لشکر کاناں

مرے نمک حلال دا ویکھ رام کھاناں

پر عالمگری پڑی نال چڑھ تول وکاناں

Most of the travellers who tread this part of the Sarak-e-Azam have omitted the name of the place. Bernier was in the Mughul camp when Aurangzeb made his journey to Kashmir and accompanied the Mughul force to its final destination (15). He writes to M. de Marveilles, "I am indeed no longer surprised that even the Indians themselves expressed much apprehension of the misery which awaited them during the eleven or twelve days march of the army from Lahore to Bember (16)." These lines he wrote to his friend while covering the distance from Lahore to Tchenau (as he himself calls the river Chenab). It took him six summer days to cover this distance of 70 miles (17). The journey was taken up by Aurangzeb in 1663 A. D. (18). Minucci crossed and recrossed this territory while in the train of Muhammad Amin Khan (1667—1669 A. D.) the Governor of the Panjab, and afterwards when he slipped away to Lahore from the later's camp at Gujrat (19). Travernier's account also goes without any notice of the Kachi Sarai (20).

From all this it can be safely concluded that Sarai Kachi was a very small village of no significance during the prime of the Mughul rule. The Mughul fortunes were on the wane after the death of Aurangzeb which took place in 1707 A. D. From this year up to Nadir Shah's invasion we have no precise information regarding the fate of this village. From 1707 to 1739 A. D. is the dark period of the history of Gujranwala. Nadir Shah marched towards India on 6th November, 1738 and crossed the river Chenab on the 8th of Shawwal 1151 A. H. (Irvine gives the date as 8th of January, 1739) and reached Pul-e-Shahdawla on the 10th of Shawwal (21). The historians have generally omitted the details of skirmishes that he encountered in the way. A native poet Najabat informs us that Nadir had to face an Indian troop at Sarai Kachi (22). The most probable date for the incident is the 9th of Shawwal. That day the clash took place between Nadir's troops and the seven thousand soldiers of Mirza Qalander Beg (23). "The Persian vanguard took the fort, killed Qalaqder Khan and drove his troops away" (24). Najabat has described the scene in a picturesque manner (25).

گجراب نوں کوچ نادر دا آر تا ڈرا کریا مرزا قلندر بیگ دا

چڑھے گجراتوں نادر شاہ دھکیاں دھر واناں

ے لنکھ وزیرآباد تھیں چھول جے دھاناں

adjoining it, was filled with bricks a few years ago. The graveyard which scatters over the whole of the mound, that once formed the main portion of the Sarai, is only a recent creation. Before 1947 A. D. there was only one grave in it and the graveyard of the early British period lay approximately at a distance of a hundred yards from the mound. This old graveyard had a wall round it which was pulled down sometime back and houses stand in its place. The new graveyard near the mosque bears signs of a deserted Sarai in the form of broken earthen pots, utensils, remnants of a tank and a portion of the outer wall in the South Eastern corner. These are the only remains of the Sarai which have stood even the severest blasts of time. The rest has disappeared probably due to the fact that it was made of mud as its name Kachi indicates. The first traveller who mentioned this Sarai during the Mughul period is William Finch (1608 A. D) the well known European merchant who calls it, "Coojes Serai" (10) The Mughul rulers have been passing through this area enroute to Kashmir. But their historical annals do not mention any name Akbar and Jahangir and even Aurangzeb marched through this area. Akbar's minister Abul Fadl mentions Pargana-e-Eminabad but has nothing to say about the Sarai Jahangir carried on his hunting expeditions here twice while coming back from Kashmir He has mentioned Garjakh, Mukhal and Jahangir Abad (Sheikhupura) but has omitted the Sarai. The following extract from his Tuzuk will bear me out (11) (1029 A. H. ; 15th year of his reign, 1620 A. D) :

روز سه شبه دوازدهم در مقام تهتهر (Correct : Bhimber) منزل واقع شد - امروز ار کوتل و کوه گذشته بوسعت آباد هندوستان درآمدیم - پیشتر قراولان بجهت قمرغه دستوری یافته بودند که در تهتهر (بهنبهر) وکرجهاک (۱۲) و نکتهاله (۱۳) جرگه ترتیب دهد - روز کم شنبه و مبارک شنبه شکاری را زنده آوردند - روز جمعه به نشاط شکار خوش وقت شدیم - قچکار کوهی وغیره پنجاه و شش راس شکار شد ... روز شنبه شانزدهم بجانب گرچهاک (کذا) متوجه شدم و پنج کوچ کنار دریائی بهت (۱۴) معسکر اقبال گردید - روز مبارک شنبه بست و یکم در جرگه کرچهاک شکار کردم - نسبت بدیگر بارها شکار کم تر شده چنانچه دل می خواست محظوظ نه شدم - روز دو شنبه بست و پنجم در جرگه نکتهاله (کذا) به نشاط شکار کردم - از آن جا به ده منزل شکار گاه جهانگیر آباد مخیم بارگاه دولت گردید -

GUJRANWALA PAST AND PRESENT

BY

Dr. WAHEED QURAISHI, M.A., Ph.D.

The city of Gujranwala that covers now several square miles on both sides of the Grand Trunk Road has got a fairly long history and can claim its origin to antiquity. It cannot boast of being situated on so old a foundation as can be claimed for Asrur the old capital of the Taki empire (1). The last named village lies near Khanqah-e-Dogran (Khanqah-e-Masrur (2)) and formed a part of the Gujranwala district as late as 1919 A. D. (3). Other sister cities like Lahore, Sialkot and Sodhra can trace longer antiquity than Gujranwala. It is situated on the highway that connects Calcutta with Peshawar, at a distance of 42 miles from Lahore (4). It is indeed very unfortunate that the major portion of the official record concerning this city was destroyed in the flare up of 1919 A. D (5) In addition to the three official sources, I have utilised mostly the non-official printed and oral material As the story goes the origin of the city is attributed to a Jat named Khan This village was called after him Khan Pur Sahnsi. The compilers of the first edition of the District Gazetteer say (6) .

کسی سند تحریری سے مدت آبادی اس کی صحیح معلوم نہیں ہوتی عوام الناس میں یہ بات مشہور ہے کہ تخمیناً تین سو برس گزرا ہے کہ اس کو مسمی خان عرف ساھنسی نے بصورت گانو (کذا) آباد کرکے نام اس کا خان پور ساھنسی رکھا تھا۔ چنانچہ ثبوت اس نام کا اکثر قبالجات محررۂ زمان سابق سے ظاہر ہے۔

Mufti Ghulam Sarwar of Lahore says (7) :

پہلے آبادی اس کی بمرور تین سو برس کے مسمی خان جاٹ گوت ساھنسی نے قائم کی اور نام اس کا خان پور سانسی رکھا۔

The ruins of Khan Pur Sahnsi cannot be traced. Most probably these are under the Debris of the Kachi area where Sarai Kacha appeared at a later stage. There exists a mosque made of bricks which, according to local tradition, was constructed by Sher Shah (8). The historians of the reign of Sher Shah are silent on this point but the architectural peculiarities of the building, especially its broad necked dome, validate it (9). Unfortunately later repairs of the building have so disturbed the outer surface of the mosque that one fails to find any inscription on it. The well,

The book is free from the futile ornamentations so dear to Persian prose writers, figures of speech and all other artificialities of language. Its style is simple, direct and lucid. Its chief excellence lies in its accuracy. It had immediate and lasting success. Hitherto the Suhrwardi mystics had written a good deal on the principles of Sufism Amir Hasan, for the first time, provided the Chistis with a manual in the form of 'recorded conversations of their greatest teacher of the middle ages. Incidentally also he laid the foundation of a new type of mystic literature, known as he *malfuzat*. He has found many followers and imitators, but has never been equalled The *Fawaidul Fuwad* has a great historical value. It is a standard work regarding the life and teachings of the Chishti saints with reference to which the accuracy and genuineness of other works can be judged. It enables us to throw aside as of little or no value a large mass of later fabrications. It is regarded as the code of the *Nizamia-Chishtia-Silsilah* and has always been held in great esteem by the mystics. Amir Khusrau regarded it with envy and as a tribute to this great work once remarked : "I wish that all my works were in the name of Hasan and this book of Hasan in mine."[1]

Thus it is evident from the above that the works of Amir Hasan are not only valuable for the scholars of Persian literature but also for the students of history. They are important because they throw enough light particularly on the literary activities, the social and religious life of the time when the Muslim power in the sub-continent of Indo-Pakistan had attained height They also enable us to ascertain the influence of Persia on the civilization of the then India.

1. Siyarul Auliya page 308.

Another feature of his poetry is said to be that he wrote like Sadi and was called "Sadi of Hindustain".[1] Amir Hasan himself says to this effect :—

حسن گلے از گلستان سعدی آوردہ است کہ اہل معنی گل چین این گلستانند

"Hasan has picked up a flower from the garden of Sadi
"All people of discernment are flower-gatherers of that garden."[2]

It may, however, be mentioned here that both Amir Khusrau and Amir Hasan wished to be considered equal to the great poets of the Persian language, but they failed. Amir Khusrau openly challenged the *Khamsa* of Nizami but was compelled to confess at the end of the fifth volumes of his *Hasht-Bihisht* (P. 220) that he had failed. This was not due to the fact that Persian was foreign language to them. The ***Masnavi*** of Maulana Jalaluddin Rumi itself, admitted by all sane critics to be the greatest work of Persian language, was written by a saint whose mother-tongue was Turkish in the midst of the purely Turkish population at Qonia. Poetry is life, poetry which is not life is mere versification. The poet who writes on mystic themes must have more in him than mere ideas and similes. Shaikh Nasiruddin Chiragh of Delhi, who knew Amir Khusrau and Amir Hasan personally and was intimately acquainted with the classical writers of mysticism declared years afterwards "Amir Khusrau and Amir Hasan repeatedly tried to write like Sadi. It was beyond them. Sadi has written real spiritual experience. Khaqani and Nizami were men of piety but Khwaja Sanai was one of the abstainers ; he severed his relations with the world and the men of the world".[3]

Another work of Amir Hasan as said before, is his prose elegy written on the death of his patron, Prince Muhammad, the son of Sultan Ghias-uddin Bulban. It is quoted by Abdul Qadir Badauni in his ***Muntakhabut-Tawarikh***. It is also found in the introduction of the ***Diwan*** of Amir Hasan edited by Maulvi Masud Ali Mahvi and printed at Ibrahim Machine Press, Hyderabad (Deccan).

But the most important, the most famous of his works is the ***Fawaidul-Fuwad***, a summary of the conversations of Shaikh Nizamuddin Auliya. The work was completed within fifteen years (707 A. H. to 722 A. H.). It is in five thin volumes.

1. Barni, page 360.
2. *Diwan*, page 93.
3. Hameed Qalandar, *Khair ul Majalis*, XLIV.

life-time, did not come any where near to Shaikh Nizamuddin Auliya's favourite standard—the devotion of the Muslim widow. We find the Shaikh trying to induce him gradually to increase the number of superogatory prayers and devotions. "I am very weak in the matter of devotions," he confesses at one place, " but when I am at *Sama* my soul is really inspired".[1] The Shaikh even asked him to write less poetry and devote his time to the recitation of the *Quran*. He assured the Shaikh that he had got into the habit of reading the *Quran* regularly.[2] Secondly he was a man of government service and we have it on his own authority that the Shaikh considered government service morally and spiritually disastrous.[3] But he was not courageous enough to leave it.

It may be mentioned here that the statement of Dara Shikoh that Shaikh Nizamuddin Auliya sent Amir Hasan to instruct the people of Daulatabad with Shaikh Burhanuddin and others[4] is not true. It is certain that the Shaikh like other saints of his Silsilah sent his disciples to different places for the instruction of the people. But no contemporary author says that Shaikh Nizamuddin Auliya sent Shaikh Burhanuddin to Daulatabad. The latter lived in the society of the Shaikh till his death.[5] Amir Hasan went to Daulatabad during the reign of Muhammad Bin Tughlaq. He died in 737 or 38/17337-8 and lies buried there[6]

Amir Hasan was not a profilic writer like his friend Amir Khusrau. He has left only a *Diwan*, an elegy written in prose in the memory of his patron, Prince Muhammad and *Fawaidul Fuwad*, a summary of the conversations of Shaikh Nizamuddin Auliya Still, his constributions to the Indo-Persian literature are not small. He has left a permanent mark on it. His poems are still sung by the musicians in the audition parties. His fame as a poet lies in his "*Ghazals*" which are full of pathose, charm and effect. In this he has excelled his friend Amir Khushrau who tried to imitate him. Amir Khusrau himself acknowledged this in the verse :—

خسروا شعر تو اسرار حدیث است مگر کز سخنهائے تو ام بوئے حسن می آئد

"O Khusrau ! Your verse is the store of secrets,
"But the smell of Hasan comes out of it."[7]

1. *Fawaidul Fuwad,* 21 ZilHijjah, 713 A. H.
2. *Fawaidul Fuwad,* 26 Rabi, I, 721 A. H.
3. *Fawaidul Fuwad,* 29 Rajab, 714 A. H.
4. Dara Shikoh, *Safinatul Auliya* page 101.
5. *Siyarul Auliya,* pages 278-282.
6. Akhbarul Akhyar, page 103.
   Diwan (Introduction) page 74.
7. *Diwan* (Introducti on) Page 74.

birth is 652 A. H., the year when the Shaikh migrated to Delhi. The Shaikh never went to Badaun again. Now how was it possible for Amir Hasan to have enjoyed the Shaikh's company at Badaun? Amir Hasan became a disciple of the Shaikh probably in 707 A. H. and must have been about fifty-five at that time and not seventy-three as is given by the Maulana. The fact is that before he became a disciple of the Shaikh, he used to visit the Shaikh with Barni and Amir Khusrau, and on hearing the inner call enrolled himself among the disciples of the Shaikh. Thus no part of Maulana Jamali's version stands the test of criticism. But this much is certain that before he became a disciple of the Shaikh, he led a free and unrestricted life. And he himself confesses. He says :—

حسن توبہ آنگہ کر دی　　　کہ ترا طاقت گناہ نماند

"O Hasan ! You repented at the time.[1]
"When no power was left to you for sin".

This is further confirmed by the fact that Shaikh Nizamuddin Auliya's conversation with him in the *Fawaidul-Fuad* begins with a discourse on "Repentance" and the Shaikh returns on the topic again and again.

His visits to Shaikh Nizamuddin Auliys's *Jamaat-Khana,* though recorded with a discernment unrivalled in mystric annuls, were infrequent, Month followed month and he was for some reason, unable to pay his respects to the Shaikh, and we find him consoling his mind with the reflection that as the Shaikh was always present in his "mind's eyes", physical presence might be dispensed with.[2] But the fact is that he was not a member of the Shaikh's higher spiritual circle. Entrance to it was reserved for persons like Shaikh Nasiruddin Chiragh and Maulana Fakhruddin Zarradi—for persons who had based their life on the great mystic principles of *Tawakkul,* that is, giving up all personal property and depending upon Allah for the morrow.

A careful study of the *Fawaidul-Fuwad* reveals that the mental insight of Amir Hasan was not equalled by his spiritual and moral strength. It also reveals that his spirit was not weighed down by the consciousness of any great sins of the past in the ordinary sense of the word. Still, in the technical language of the mystic he was a *mutasawwif* and not a *sufi* or an earnest seeker prepared to sacrifice every thing for Allah. In the first place his religious devotions, whether owing to official duties or the habit of a

1. *Diwan,* page 414.
2. *Fawaidul-Fuwad,* 18 Rabi 1, 718 A. H.

by Maulana Jamali as to how he became a disciple of the Shaikh. The Maulana says that one day Shaikh Nizamuddin Auliya was returning from the mausoleum of Shaikh Qutbuddin Bakhtiyar Kaki when he saw Amir Hasan drinking wine with his companions by the side of the *Hauz-i-Shamsi.* Amir Hasan (according to the story) was an old friend of the Shaikh and had lived in his society at Badaun Seeing him Amir Hasan advanced to meet him and being a poet addressed him in a quatrain which has become famous in the Indo-Persian Literature :—

سالها باشد که ما هم صحبتیم   گر ز صحبتها اثر بودے کجاست
زهد تان فسق از دل ما کم نکرد   فسق مایان بهتر از زهد شماست

"It is years since we have been friends,
"If association has any effect, where is it?
"Your piety has not reduced our sinfulness,
"Our sinfulness is better than your piety."

"Society has its effects," the Shaikh replied These words had deep and instantaneous effect on Amir Hasan He threw himself at the Shaikh's feet and became one of his devout disciples At the time, the Maulana also adds, that he was seventy-three years old.[1]

The story, though interesting, is not authentic. We should remember that the time was of Alauddin Khalji and if we are to believe the Maulana that Amir Hasan, a government servant, was drinking wine openly in 707/1307-8 the year in which he probably or earlier became a disciple of the Shaikh. Now we know definitely from Barni and other sources that Sultan Alauddin Khalji had prohibited the manufacture, sale and drinking of wine in Delhi in 699/1299-1300 and the order was not allowed to remain a dead letter. The only relaxation allowed later on was the permission to manufacture and drink wine behind closed doors Had Amir Hasan behaved in the manner stated, he must have found himself not in the *Jamaat-Khana* of Shaikh Nazimuddin Auliya but in one of those dry wells or dungeons in which the Sultan was in the habit of incarcerating habitual drunkards and out of which few came out alive.[2]

The other difficulty about the anecdote is caused by the dates. It is true that both Shaikh Nizamuddin Auliya and Amir Hasan were born at Badaun. The Shaikh was born in 636 A. H[3] and had gone to Delhi at the age of sixteen[4] that is, in 652 A. H. The date of Amir Hasan's

1. Maulana Jamali—*Siyarual Arifin*, page 87.
2. Barni, page 284-85.
3. Amir Khurd—*Siyarul Auliya*, page 154.
4. *Fawaidul Fuwad*, 27 Ziqad, 715, A. H.

He was nearly a born poet and he himself bears witness to it that he had begun to compose poems from the age of thirteen.[1] At the time, when he had gone to Delhi, Sultan Ghiasuddin Balban was on the throne. The Sultan was a great patron of learning and scholars and poets being attracted by his generosity flocked in Delhi. At the same time, the people from the fear of the Sultan refrained from politics and had taken to poetry. Poetry became a pastime for them and the poets began to amuse them.[2] Amir Khusrau and Amir Hasan excelled all his contemporaries in this and Prince Muhammad, the son of Sultan Ghiasuddin Balban, being enamoured of their poetry, took them to Multan. The two lived in the service of the Prince till the martyrdom of the latter at the hands of the Mogols. The death of the Prince proved to be a great calamity for Amir Hasan.[3] He was thrown out of employment and he remained in this condition till Sultan Jalaluddin Khalji appointed him as one of his courtiers. The Sultan appreciated his poetry and his "Ghazals" were sung by the court musicians.[4] But this life of Amir Hasan ended with the death of the old Sultan. Sultan Alauddin Khalji, who ascended the throne after his uncle, was a different man and had no love for poetry Under the condition, Amir Hasan was forced to join the army, most probably as an ordinary officer attached to the civil side of the army. He lived in the camp and in the city. He was a bachelor and lived in a bachelor's quarter. He seems to have done most of his official works in his own house.[5] But the change of the profession did not change his habit. Still he composed poems. He composed *Qasidas*, which are found in his Diwan, in the praise of Sultan Alauddin. But inspite of this he was not in the good books of the authorities. We find at one time, for example, that his salary was withheld; he was not only reduced to distress but his financial condition became such that a friend of his offered him pecuniary help.[6]

After the death of Alauddin Khalji followed anarchy which ultimately resulted in the establishment of the rule of the Tughlaqs. During this period and that of the Tughlaqs Amir Hasan could be seen neither in the army nor in the court but in the Jamaat-Khana of Shaikh Nizamuddin Auliya, the greatest saint of the time. A very interesting story is narrated

---

1. *Diwan* (Introduction), page 21.
2. Barni, page 113, and page 117-18.
3. *Diwan* (Introduction) page 31-35, and the following pages.
4. Mulla Abdul Qadir Badauni, *Muntakhabut-Tawarikh*, Volume I, page 182.
5. Amir Hasan Sijzi, *Fawaidul Fuwad*, 21, Zil-Hijjah, 713 A. H.
6. *Fawaidul Fuwad*, 23 Rabi II, 710, A. H.; 14 Jamadi II, 714 A. H.

AMIR NAJMUDDIN HASAN SIJZI

BY

DR. MUHAMMAD SALIM, M.A., LL.B., PH.D,

University of Karachi, Karachi

Badaun is an old town of Western U. P. It had no fame, no importance during the time of the Hindu Rajas. It came into prominance under the patronage of Iltutmish. It was a great centre of the Muslims who came fleering from the northern climes As it suited to most of them, they settled down here permanently This made it a seat of the Muslim learning and culture.[1] It has produced many poets, scholars and saints. One of its poets and scholars, the importance of whose works was fully acknowledged by his contemporaries and is recognised even to day, was Amir Najmuddin Hasan Sijzi.

Though Amir Hasan was a well-known great poet of his time and the founder of a new type of mystic literature, known as the *malfuzat*, no account of his family has been left by him or by any writer. The only information which we get in this connection is that his father's name was Alauddin[2] or Ala Sijzi[3], wrongly called Sanjri and it is only from the word, "Sijzi" that we are able to know that his ancestors were of Sijistan. It is also not known whether his father was the first member of his family who had come to Badaun or before him some of his ancestors. However this much is certain that he was born at Badaun in 652/1254[4] and not in Delhi as has been pointed by Maulana Abdul Haq.[5] He received his education at Badaun and in Delhi.[6] No information is available about the details of his education, but his works, which will be discussed presently, show that he was a great scholar or Persian literature and his knowledge of Arabic was not also mean. He was greatly interested in the study of history and his friend, Barni makes us believe that he was fully acquainted with the history of the Sultans and scholars of Delhi.[7]

---

1. Amir Khurd—*Siyarul Auliya, page* 94.
2. Jami—*Nafahatul-Uns*, page 549.
3. Maulana Abdul Haq—*Akhbarul-Akhyar*, page 101.
4. *Diwan-e-Amir Hasan Sijzi* (Introduction, page 25), by Masud Ali Mahvi.
5. *Akhbarul Akhyar*, page 103.
6. *Diwan*, page 543.
7. Zia-ud-Din Barni, Tarikh-i-Feroz Shahi, page 360.

On enquiring into the matter I found that it was a trick of the former attendant who invented a story of a pet dog of Lāla Rukh buried there. This he did in order to please the foreign visitors, otherwise it is a matter of common knowledge that on religious grounds a dog cannot be buried in a Muslim graveyard.

Perhaps we have now already come to the conclusion that the tomb is neither of Lāla Rukh nor of Ḥasan, therefore, the question arises as to whose tomb is this ? In fact it is not certain whether the tomb is of a man or lady, but from the delicacy of the cenotaph and comparatively small size of the same, it can be conjectured that it is of a lady. Further it appears very likely that it is the tomb of a member of either ruling Mughal family or of some high placed noble of their court. However, it is difficult to conjecture as to actually whose tomb is this and it is yet to be found out. One thing is clear that it is a tomb of a person who after the tradition of Bābar had a wish to be buried under the open sky at a beautiful spot.

CONCLUSIONS

1. Lāla Rukh was not a daughter of Aurangzeb or a member of the ruling Mughal family ; she was simply a poetic idea of the celebrated Thomas Moore. Likewise the character of Fadladin, the great Naẓir as depicted by him in his poem is also a creation of his brain.

2. The tomb now known after Lāla Rukh at Ḥasan Abdāl is not hers, but of some unknown person.

of sang e abri of Attock quary. It measures 118'×118'–10" with small burjs on the four corners having fluted (Māhi Pusht) domes. Only the burj on the north-west corner is pierced with openings, the rest being closed except the arched doorway. The cenotaph built in beautiful Sang e Khatta (a variegated yellow marble generally available in the area of Jesselmer State in India) and Sange abri lies on a 8 feet high platform measuring 16'–11"×15'–6". This platform is built in rubble masonry with a sprinkling of country bricks of the following size :—

6½"x ? x1¼" , ? x 5" x 1" , ? x 5½"x 1¼"

There are traces of floral motifs and lineal bands in colour on the entrance gate and the wall, which originally decorated the surface of the whole structure. In these decorations the colours mostly used are red and green.

The size of bricks together with the fluted type of th dome of the corner burjs and the colour decorations mentioned above indicate the architectural aspects of Shahjahān and subsequent period.

Of the old cypresses mentioned above by Elphinstone, Moorcraft and Cunningham, one was still flourishing upto 1953, when unfortunately it became dry, but its trunk is being preserved (left most, Plate No. III) It appears that this tree must have been planted when the garden was first laid.

There are two other graves at present in the enclosure, the kachcha one just west to the main grave is that of the mother of a local Faqir who happened to be a caretaker of the tomb in the 1st quarter of the running century. The other in S. W lawn with its orientation east-west is a tomb of some unknown British soldier. Elphinstone and Moorcraft tell of only one grave in the enclosure and even Cunningham does not mention about this christian grave, therefore, it is presumed that it is of a soldier who might have died at military camping ground at Ḥasan Abdāl some time after 1863-64 when Cunningham visited this place. There is a nich in the grave for receiving the inscribed slab, but either it was never fixed or removed unnoticed before 1928 when I first saw it. Any how no record is available as to who is the occupant of this grave.

About 1932 A. D. an English lady visited the tomb, when I happened to be there. She told me that there was an other grave which was of the dog of Lala Rukh and which since her previous visit had disappeared.
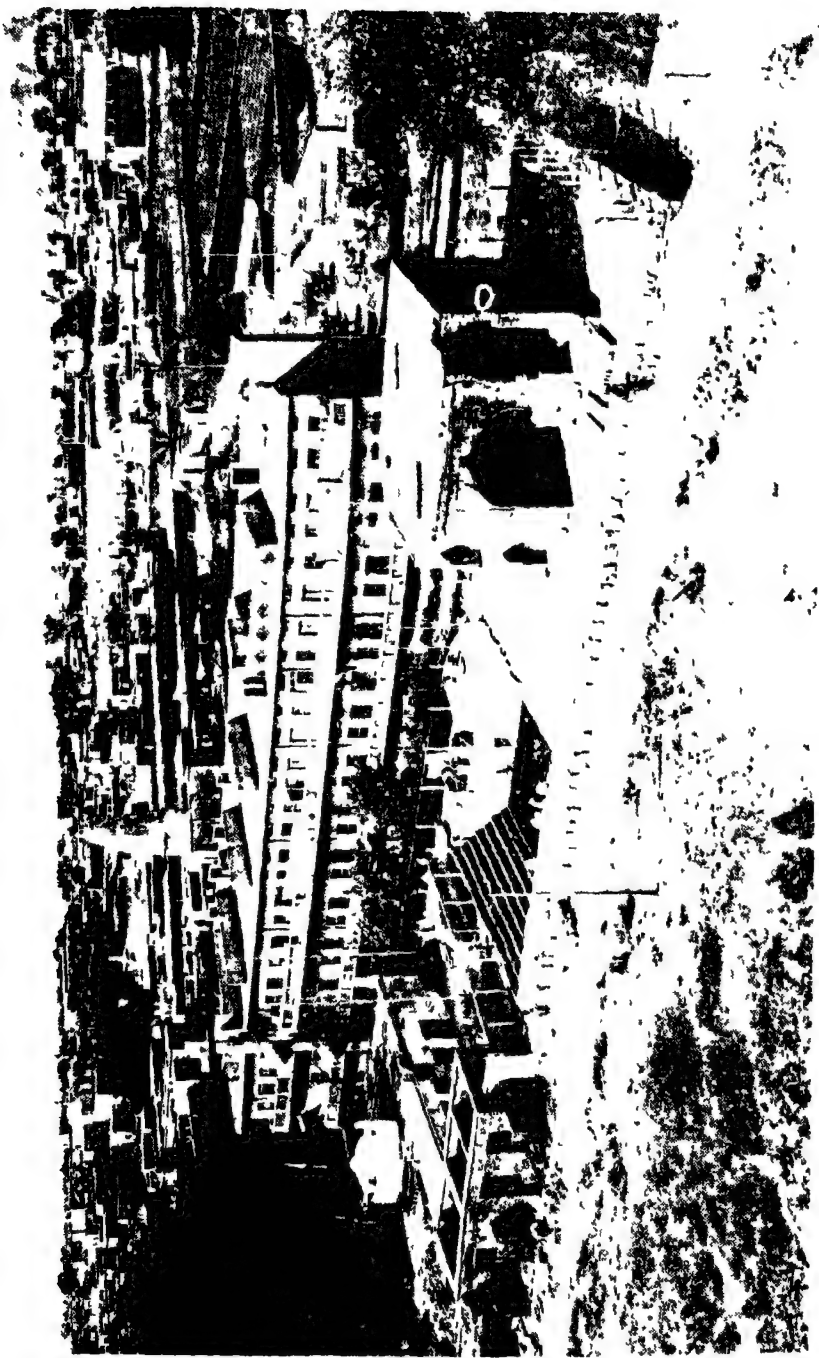
Abdul Hakim's Tomb, Hassan Abdal Distt Campbellpur.
Showing poles with tank and mosque

Lala Rukh's Tomb Hassan Abdal Distt. Campbellpur.
General View of the Tomb.

"On Wednesday the 12th our camping ground was Bābā Ḥasan Abdal .. . .I enquired from historians and inhabitants of the place about Bābā Ḥasan *but no one could give me any information.* The most noted spot is where a spring issues from the foot of the hill. It is exceedingly pure and clear and the following verses of Amir Khūsru may well be applied to it :—

> " The water is so perlucid that a blind man in the mid of night, might count the grains of sand at the bottom"

Khwāja Shamsh-ud-Dīn Muḥammad Khāni (Khawafi) who was for a long time the minister of my illustrious father raised a platform on it and excavated a reservoir into which the water flows, supplying the fields and gardens with the means of irrigation. On the side of this platform he built a domed tomb for himself, but it was not his fate to be buried there. Ḥakim Abul Fatḥ Gīlāni and his brother Ḥakīm Ḥammām who were most intimate friends of my illustrious father and to whom he entrusted all his secrets, were buried there under his orders"

From the account cited above it can be inferred that in the beginning of 17th century the people of Ḥasan Abdal knew nothing about Ḥasan after whom the town was named and though Jahāngīr is silent on the point whether any tomb at that period was attributed to Ḥasan, yet it can safely be concluded that there was none otherwise a writer like Jahangir who never omits even minute things must have mentioned it, as he did in case of the spring, and the tomb built by Shamsh-ud-Din Muhammad Khānī at the foot of the hill where he buried Masihud Dīn Ḥakīm Abul Fatḥ Gīlānī and his brother Ḥakīm Ḥammām the two out of nine exalted nobles of Akbar's court This tomb which is now popularly called Ḥakīms Tomb, still exists together with its tank (Plate No I) Here Jahangīr does not mention any other tomb though the so called Lala Rukh's Tomb is only 222 feet east of Ḥakim's Tomb (Plate No. II) and the mosque and chilla (Place of seclusion) of Bābā Wali Qandhari just adjacent to it on west. This means that these two buildings were not there at that time (1606 A. D) and are later constructions, and therefore must be later to the time when this town was given the name of Ḥasan Abdāl. We have now seen that the tomb which is now attributed to mythic Lala Rukh is most probably a construction later to 1606 A D and is neither of Lala Rukh nor of Ḥasan.

THE TOMB (Plate No. III) occupies the centre of a small square garden enclosed by a wall with its small entrance on the east having steps

Baron Charles Hugel :—

> " ....I eagerly looked out for Hussain Abdal, which is about nine miles from Kota, the spot celebrated by Moore in his Lalla Rookh and described by Hamilton whose work has nothing of poetry in it "[1]

How much the European intelligentia of the time was influenced by such poems can be well imagined from the last two quotations cited above.

Later Alexander Cunningham visiting Ḥasan Abdal in 1863-64 mentions the tomb as 'Cypress Garden' and according to the information received by him Bābā Walī, Kandhari was a Saint from Kandhār, whose, Ziarat, or shrine is on the top of the hill, while Ḥasan, surnamed Abdāl, or the "mad" was a gujar, who built the Sarai which still goes by his name, and whose tomb is at the foot of the hill as stated by Moorcroft[2]

From the information furnished by Elphinstone, Moorcroft and Cunningham detailed above, it is clear that this particular place was supposed, at least, in the major portion of 19th century, as the tomb of one Ḥasan who was either the same person as the Saint Bāba Walī Qandhārī or a gujar, but in any case it was not known as Lala Rukh's Tomb. This discussion will not of course be conclusive, if I do not quote the account of the place given by Emperor Jahāngīr who visited Ḥasan Abdal in his 2nd regnal year, on 12th Muḥarram 1015 A. H. (1606 A D). He says .—

" روز چهار شنبه دوازدهم منزل بابا حسن ابدال شد.. ....
از مور خان و موطنان آنجا احوال بابا حسن استفسار نمودم هیچکس شخص خبر نگفت جائیکه بمقام مرکور مشهور است چشمه ایست از دامن کوهچه برمی آید در غایت صافی و حلاوت و لطافت چنانچه این بیت امیر خسرو شاهد است ـ

در ته آس زصفارنگ حورد کور تواند بدل شب شمرد

خواجه شمس‌الدین محمد خانی که مدے شغل وزارت والد بزرگوارم مشغولی داشت صفه بسته و حوض درمیان آن ترتیب داده که آب چشمه آنجا درمی آید و از آنجا بزراعت و باغات صرف میشود ـ بر کنار این صفه گنبدے بجهت مدفن ساخته بود بحسب اتفاق آنجا نصیب او نشد و حکیم ابوالفتح گیلانی و برادرش حکیم همام را که در خدمت والد بزرگوارم نسبت مصاحبت و قرب و محرمیت تمام داشتند حسب‌الحکم آنحضرت درآن گنبد نهاده اند ـ

---

1. Hugel, Baron Charles, Travels in Kashmir and Panjab, London 1845 page 209.
2. Cunningham, Alexander, Archaeological Survey of India, Volume II, Simla 1871, pages 136 and 139.

Mountstuart Elphinstone of the Honourable East India Company's service :—

" . . .There also was a garden,[1] which resembled, and almost equalled, that of Cohaut (Kohat). Near this was the tomb of Hassan Abdal, from which the place is named. It is partly composed of marble and stands in a square enclosure, within which are two very fine old cypresses, of remarkable height. Hussun (whose surname is Abdaul is the Pushtoo for mad) was a famous Saint of Candahar, where he is known by the name of Babba Wullee....".[2]

Mr. William Moorcroft :—

" ....Between this and the Serai of Hassan Abdal the valley is somewhat contracted, although the hills are low : at the foot of one of these is the tomb of the Saint from whom the place is named and who is also known by the more familiar denomination of Baba Wali It is square building containing a tomb of marble, and standing in a walled court. The two old cypresses noticed by Mr. Elphinstone still formed its only ornament....".[3]

Lieut.-Col. Sir Alexander Burnes, of the India Company's service :—

" As we approached Ḥasan Abdāl the vegetation became more abundant, the formation being lime stone ; and we atleast found ourselves among the beautiful but decayed and neglected gardens of this celebrated spot : we pitched our camp by the crystal, revulet, filled out glasses with Burgundy, and drank to the memory of Noor Mahal[4] and to the fame of his immortal poet, Thomas Moore".[5]

---

1. This is a reference to the Mughal gardens at Wah near Ḥasan Abdāl.
2. Mountstuart Elphinstone, Account of the Kingdom of Caubul London 1834, Volume, I page 99 (introduction)
3. Moocroft, William and Trebrck George Travels in the Himalayan Provinces from 1819-1825 A. D. London, Volume II page 319.
4. This is a reference to another poem of Thomas Moore entitled 'The light of the Haram'-Nourmahal.
5. Burnes, Alexander Lieut -Col. Sir, Caboal : Being a personal Narrative of a journey to ; RESIDENCE IN THAT CITY, in the years 1836, 7 and 8 with numerous Illustrations" London 1842, page 116,

Gul Rukh Begam[1] · A daughter of Mirza Kāmran, she was married to Ibrāhīm Husain Mirza, the son of Muhammad Sulṭan Mirza, a descendant of Amir Taimūr, who was put to death in A H 981 (1573 A D) Gul Rukh Begam survived him and was living at Agra in A H 1023 (1614 A. D) She was mother of Nurun Nisa who became a wife of Salim (Emperor Jahāngir)

The Association with the story of such known personalities as 'Abdulla Khan and Aurangzeb, moves one to feel that other features and events of it *i e* Lāla Rukh, the heroine and Feramuz, the hero, were really historic and living personalities and their marriage a fact, but from what has been stated above, it is perhaps safe to conclude that Lala Rukh and her story is a perfect myth and a creation of the brain of Thomas Moore

The matter did not end there, as this false impression continued to influence the readers, specially the British people and Scholars, the ample proof of which we find later on in the beginning of 20th century when the Officers of the then Archaeological Department who were mostly British, searched for her a tomb at Ḥasan Abdal rather allotted it in her name and declared it under notification No 19377 dated 23rd October, 1917, a protected Monument, commonly known as a tomb of Lala Rukh The declaration of the name though not definite, but it amounted to putting this sweet name into the mouth of public with the result that it is now universally called Lāla Rukh's Tomb and acknowledged as hers without any doubt, despite the fact that when Mountstuart Elphinstone visited Ḥasan Abdal in June, 1809 and Mr William Moorcroft in March (1824 ?), this very tomb was known as the tomb of Hasan, the Abdal (a spirtual stage in mysticism) after whom the town is named The description given of the place by these two travellers as well as by Alexander Burnes and Baron Charles Hugel respectively is quoted below to make the study of the subject still more clear Alexander visited Ḥasan Abdāl some time between 1836-38 A D and Hugel after him but before 1845 A D —

---

1. (*i*) Beale Thomas William, An Oriental Biographical Dictionery, London 1894, page 146.

   (*ii*) Beveridge A. S , Oriental Translation Fund, New series I Humāyūn Nama by Gulbadan Begam, London 1902, page 234, 235.

and Ḥaider Mirza Dughlat, the historian and a relative of Bābar, as edited and detailed by A. S. Beveridge in the English translation of Humāyun Nāma,[1] also do not contain any lady of the name of Lāla Rukh.

Lāla Rukh was also none of the five daughters[2] of Aurangzeb noted below :—

1. Zebun Nisā by Dilras Bānū Begam born at Daulatābād on 15th February, 1638 A. D. Died unmarried on 26th May, 1702 and buried in Tīs Hazārī Garden outside Kābulī Gate, Delhī

2. Zīnatun Nisā Begam afterwards surnamed Pādsha Begam by Dilras Bānu Begam Born probably at Aurangabād on 5th October, 1643 Died at Delhi on 7th May, 1721 A. D and was buried in Zinatul Masājid built by her at Delhī

3. Zubdatun Nisā Begam by Dilras Bānu Begam Born at Multān, 2nd September, 1651 Married to Sipihr Shukūh, 2nd son of Dara Shukūh Died in February, 1707 A. D.

4. Badrun Nisa Begam by Nawāb Bāī Born 17th November, 1647 and died 9th April, 1670 A D

5. Mihrun Nisā Begam by Aurangābādī Mahal. Born 18th September, 1661, married to Izid Bakhsh, a son of Murād and died in June, 1706

It looks rather strange that a sweet name like Lāla Rukh is not even included in the long list of women of the Mughal Royalty during their rule for more than three centuries, but any how this is a fact. There are only two royal Mughal ladies having the name nearer to Lala Rukh :—

Gul Rukh Begam[3] also called Gulbarg Begam and Gulrang Begam. She was a daughter of Bābar and married to Mirza Nūr-ud-Dīn Muḥammad by whom she had a daughter named Salmā Sultāna Begam who was first married to Bairam Khān after whose death in A. D. 1561. Akbar married her himself.

---

1. Beveridge A S, Oriental Translation Fund, New series 1. The Humāyūn Nāma of Gulbadan Begam, London, 1902 pages 203 to 298.
2. Jadunath Sarkar, Sir, Kt. C.I.E, A short history of Aurangzeb 1618-1707, Calcutta, 1930, page 16-17.
3. Beale Thomas William, A Oriental Biographical Dictionery, London 1894, page 146.

From the above account we learn that 'Abdulla Khān was king of Kāshghar. Whether Kāshghar was included in the territory of Lesser Bukhāra is a matter open to controversy, however, one thing is clear that he did not abdicate, but was deposed by his son Bulbarās Khān (Feramorz of Thomas Moore).

'Abdulla Khān's visit to Aurangzeb at Delhi in 1668 *i.e* the 11th regnal year of the latter is thus a fact beyond any doubt, but that during 'Abdulla Khān's stay at Delhī a marriage was decided between Aurangzeb's youngest daughter and 'Abdulla Khān's son is not mentioned at all by any of the two historians referred to above *i e* Alexander Dow and Jādūnāth Sarkār Jādūnāth Sarkār based his information on original Persian contemporary sources, such as 'Ālamgīr Nāma, Maāṣir 'Ālamgīrī etc., and could not omit such an important event. It is also obvious that 'Abdulla Khān was not in a position to settle such a marriage for his son who had deposed and turned him out from the country Thomas Moore has also mentioned 'Fadladin' as the great Nāẓir or Lord Chamberlain of Ḥarem of Aurangzeb Among the list of Lord Chamberlains (Khān e Sāmān also styled Mīr e Sāmān) we do not find any one of the name of 'Fadladin', however, one Fāẓil Khān I ('Alā ul Mulk Tūnī) was Lord Chamberlain from December, 1662 to June 1663 and Fāẓil Khān III (I'timād Khān from 1688 to 1697 A D.[1]

Thus among the historical and topographical touches given to the story, the poet is correct as to 'Abdulla Khan's visit to Delhi and the particulars about Ḥasan Abdāl, but his mention about 'Fadladin' as Lord Chamberlain in the 11th year of Aurangzeb's reign is not a fact and the poet might have heard about him and associated him with the story As far Lāla Rukh, no mention of her is made either by early European travellers or historians such as William Finch, Alaxander Dow, Elphinstone, William Moorcroft, who visited this part of the country, specially Ḥasan Abdāl, or in the original Turkī and Persian works before or after Aurangzeb such as Tūzūk e Bābarī Humāyūn Nāma by Gulbadan Begam, Āīn e Akbarī, Akbar Nāma, Tūzūk e Jahāngīrī, Farhang e Jahāngīrī Ma'āsir ul Umarā, Bādashāh Nāma, 'Amal e Sālih or Shāhjahān Nāma, 'Ālamgīr Nāma, Maāṣir e 'Ālamgīrī, Muntakhabul Lubāb and Khulaṣatut Tawārīkh e etc.

Biographical notes of the 203 ladies mentioned by Bābar, Gulbadan Begum daughter of Bābar and author of Humāyūn Nāma (died 1551 A. D.)

---

1. Jadunath Sarkar M A., History of Aurangzeb, Volume III, Calcutta, 1921 page 71,

journey Lāla Rukh to the day of her death, never called the king by any other name than Faramarz.

As acknowledged by him in this work.[1] Thomas Moore based his information about the visit to Delhī of 'Abdulla, king of Bukhāra, on the account of this visit given by Alexander Dow on page 392, Vol. III of his work "The history of Hindostan" published in London in 1772A.D. and for the particulars of Ḥasan Abdāl where Faramarz recited his poems, on the account of 'Caubul' given by Mountstuart Elphinstone. A detailed account of 'Abdulla's visit to Delhī, deduced from 'Ālamgīr Nāma and Maāṣire 'Ālamgīrī is given on pages 115 to 117 of "History of Aurangzeb", Volume III, Calcutta 1921, by Jadunath Sarkār, and is reproduced below for ready reference :—

"In 1668 came a guest of the highest rank from Central Asia. Abdulla Khan, King of Kashghar, was deposed by his son Bulbaras Khan, and when fleeing to India with his family was robbed of all his property on the way. In this distressed condition he was met and relieved by Khwajah Ishaq, the envoy sent earlier from the Mughal Court. On hearing the news, Aurangzeb wrote to his governors of Kashmir and the Panjab to study the *ex*-king's comfort in every way, pay him one lakh of Rupees for his expenses, and supply him with the imperial plate, tents and furnitures. The subahdar of Kashmir was commanded to escort him personally to Delhi.

The royal fugitive reached the capital on 15th March, and was welcomed on the way by the Grand Wazir and the Paymaster, and presented to the Emperor, who cordially received him, shook hands with him, seated him near his person and dined with him. The guest was lodged in a fine mansion on the Jamuna which had been furnished with the Emperor's own upholstery, and was daily supplied with food from the Imperial Kitchen. He roamed in the imperial pleasure garden with his wives, and was treated to an elephant-combat, which was a special prerogative of the Mughal sovereigns. After spending eight months in happiness at Delhi, he set out to visit Mecca. The same honours were done to him on the way to the port of Embarkation. The Mughal Government spent on this august guest ten lakhs of Rupees in all or ½ million livres of the French money of the time. In August 1670 he reached Surat on his return from Mecca, received one lakh of Rupees more from the treasury, and settled at Delhi, where he died in extreme old age, on 20th October, 1675".

---

1. Thomas Moore, Lalla Rookh, London, 1846, footnotes on page 4 and 335 respectively.

LĀLA RUKH (TULIP FACED)

BY

MD WALI ULLAH KHAN,
SUPERINTENDENT OF ARCHAEOLOGY,
West Pakistan Circle, Lahore

Thomas Moore (1779-1852 A D) the celebrated English poet, imortalized himself by writing a sweet poem under the title "Lalla Rookh" published in London in 1846 A. D. In the poem is narrated a love story with a historical background, between 'Lalla Rookh' and 'Feramorz' Lala Rukh is presented as the youngest daughter of Mughal Emperor Aurangzeb (1658-1707 A D) and Faramarz, the young prince of Bukhara disguished as a graceful Kashmiri poet well versed in reciting poems The story goes that in the 11th regnal year of Aurangzeb, 'Abdulla' king of Lesser Bukhāra after abdicating his throne in favour of his son proceeded for a pilgrimage to Mecca *via* Delhi where he was the royal guest of Auranzeb During his stay, a marriage was settled between his son and Lāla Rukh and it was also decided that the nuptials should be celebrated in Kashmir Accordingly the princess under the guardianship of the great Nazir (Lord Chamberlain) 'Fadladin' was taken to Kashmir with all the necessary royal pomp and show Among the attendants sent by the bridegroom was one Faramarz who was sent by the prince so that by his agreeable recitals the journey which otherwise a tedious one, may be made a bit pleasant. During the journey and specially her stay at Hasan Abdal, Faramarz recited some four poems and tales in the presence of the princess who was so much charmed by his grace, sweetness, and eloquence that she fell in love with the young poet , but now she was all the more gloomy with the idea that she was to be soon separated from Faramarz. However, ultimately the princess was so much overjoyed that she screamed with surprise and fainted at his feet, when for the first time she was received in Shālāmār Garden in Kashmīr by the prince and discovered that Faramarz was no other than her own betrothed They enjoyed a happy life as king and queen of Bukhāra and in the memory of that eventful and romantic